Nine Parts of Desire

پردے کے پیچھے

مسلم ممالک میں عورتوں کی نجی زندگی کا جائزہ

مصنف: جیرالڈین بروکس

ترجمہ: یاسر جواد

فہرست

پیش لفظ

ملک کے دو صوبوں میں مذہبی جماعتوں کی حکومت بننے کے بعد سے اسلامائزیشن پر بہت سے مباحث مختلف چینلز اور پروگراموں میں جاری ہیں۔ یہ مباحث ایک خوفناک پیراڈاکس منکشف کرتے ہیں۔

یہ بتانے کے لیے کسی سند یا حوالے کی ضرورت نہیں کہ اسلام میں عورت کا وظیفہ تولید اور افزائش نسل، جبکہ مرد کا وظیفہ گھر کو چلانا اور خاندان کو تحفظ فراہم کرنا ہے۔ اور یہ بتانے کے لیے قرآن کی سند کافی ہے کہ مردوں کو دو دو تین تین اور چار چار شادیاں کرنے اور نافرمان بیوی کو سمجھانے بستر سے الگ کرنے اور پھر مارنے پیٹنے کی اجازت دی گئی ہے۔ اسلام کے مطابق عورتوں کو اپنی زینت اور جسم کے خدوخال ڈھانپنے چاہئیں، بلاوجہ مردوں کے سامنے آنا اور بات کرنا حرام ہے۔ عورت یا لڑکی کو اسلام کے دائرے میں لانے کے لیے طالبان کے اقدامات بہت سخت گیر سہی، لیکن کافی حد تک اسلامی تعلیمات اور افغانی معاشرے کے مطابق تھے۔

دنیا کے ہر خطے میں بہت سے اگر، مگر لگا کر اسلام کی مختلف صورتیں لاگو کی گئی ہیں اور ہر علاقے، خطے اور ملک میں عورت کا کردار مذہب اور ثقافتی روایات کا ملغوبہ ہے۔ لیکن تھیوری اور ٹھوس معاشرتی حقیقت کے درمیان گہرا بعد پایا جاتا ہے۔ شوبزنس کی عورتیں اپنی کسی کامیابی پر اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتی اور نعتیں پڑھتی، بلکہ گاتی نظر آتی ہیں، جبکہ نعتیں پڑھنے والے مرد و خواتین

شوبزنس کی دنیا کے تمام حربے استعمال کرر ہے ہیں۔

راقم الحروف کی نظر میں یہ سب ایک پیراڈاکس کی نمائندگی کرتا ہے جس میں نہایت متضاد عناصر ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ تقریباً سبھی چینلز غیر ملکی ایتھلیٹ خواتین اور ٹینس کی کھلاڑیوں کے میچ دکھانے سے ہرگز گریز نہیں کرتے، البتہ آج سے کوئی بیس سال قبل گریز کیا جاتا تھا (کیا بیس برس میں اسلامی تقاضے اتنے زیادہ تبدیل ہوگئے ہیں؟)۔

شاید ضرورت اس امر کی ہے کہ مطلق باتوں اور دعووں کا کھوکھلا پن چھوڑ کر ایک نیا سماجی ڈھانچہ قبول کیا جائے جس میں گزشتہ چودہ سو برس کے دوران عورتوں کو ملنے والے مقام کو بجا تعظیم دی جائے۔ ورنہ یہ پیراڈاکس تبدیلی کو موخر اور مضحکہ خیز بناتا رہے گا۔

آسٹریلوی صحافی جیرالڈین بروکس کی یہ کتاب اسلامی اور بالخصوص عرب ممالک میں مذہبی قواعد کی وجہ سے عورتوں کی زندگیوں میں پیدا ہونے والے حالات کا تجزیہ پیش کرتی ہے۔ اس سے ہم اندازہ کرسکتے ہیں کہ نام نہاد مسلم امہ عورتوں کے بنیادی مسئلے پر کس قدر تفاوت رکھتی ہے اور کیسے نفاذ اسلام کی کوششوں نے ہمیشہ عورتوں کی زندگیوں کو متاثر کیا۔

مصنفہ نے تقریباً سات نہایت اہم سال (87-94ء) مشرق قریب کے مختلف ممالک، مثلاً ایران، سعودی عرب، اردن، عراق، کویت اور مصر میں بطور صحافی ملازمت کرتے ہوئے گزارے۔ اس نے مذہبی اور ثقافتی بندھنوں اور روایات کی وجہ سے مسلمان عورتوں کو درپیش مسائل کا تجزیہ ایک سفرنامے کی صورت میں کیا ہے۔ وہ ہمیں ایک سیر بین کی طرح مسلمان ممالک کی عورتوں کی زندگی کی مختلف جھلکیاں دکھاتی اور کچھ دہکتے ہوئے سوالات پیچھے چھوڑ جاتی ہے۔

م ۔ ر ۔ جسم

دیباچہ

ہوٹل کے ریسپشنسٹ نے میرا ریزرویشن کارڈ ہاتھ میں پکڑ کر پڑھا: ''مسٹر جیرالڈین بروکس۔ لیکن آپ تو عورت ہیں۔''

''ہاں،'' میں نے اعتراف کیا۔

''معافی چاہتا ہوں، لیکن ہمارے ریزرویشن کلرک سے غلطی ہوگئی۔''

''کوئی بات نہیں۔ بس Mr کے آگے ایک s ڈال لیں،'' مَیں نے کہا۔

''نہیں، آپ نہیں جانتیں۔ مَیں آپ کو کمرہ نہیں دے سکتا۔ یہ عورتوں کے لیے قانون کے خلاف ہے۔''

مَیں نے ہوٹل کی چمکتی ہوئی لابی پر نظر ڈالی اور ایلیویٹر کی جانب جاتی ہوئی کالے عبایہ والی دو سعودی عورتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا،''وہ بھی تو ہیں۔''

''وہ اپنے شوہروں کے ساتھ یہاں آئی ہیں۔ سعودی عرب میں خاتون اکیلی سفر نہیں کرتی۔ اس کی کوئی وجہ ہی نہیں۔ بشرطیکہ وہ فاحشہ نہ ہو،'' ریسپشنسٹ نے وضاحت کی۔

کچھ عرصہ قبل ایسا ہوا ہوتا تو مَیں شاید غصے میں آجاتی۔ مگر اب مَیں نے صرف ایک آہ بھری اور ڈیسک سے پیچھے ہٹ آئی۔ مَیں ٹیکسی لے کر واپس ایئرپورٹ پر جاسکتی اور وہاں کسی پلاسٹک کی کرسی پہ بیٹھ کر رات بھر انتظار کرسکتی تھی۔ لیکن ہوٹل کے سامنے کوئی ٹیکسیاں موجود نہ تھیں۔ ہوٹل کی

لابی میں رکھے خالی صوفے دعوت دے رہے تھے۔ مَیں نے لابی میں رکھے ایک پودے کے پیچھے صوفے پر خود کو نیم دراز کیا اور اپنی کالی چادر بطور کمبل استعمال کرنے کے لیے نکال لی۔ ابھی آنکھیں بند ہی ہوئی تھیں کہ پیچھے سے ریپشنسٹ کے کھانسنے کی آواز آئی۔

''آپ یہاں نہیں ٹھہر سکتیں۔''

مَیں نے آرام سے بتایا کہ میرے پاس جانے کو اور کوئی جگہ نہیں ہے۔

''پھر تو مجھے پولیس بلانا پڑے گی،'' اُس نے کہا۔

دہران پولیس سٹیشن کے بنچ بھی کسی اور پولیس سٹیشن کے بنچوں جیسے سخت تھے۔ واحد فرق یہ تھا کہ سادہ کپڑوں والے اہل کاروں نے لمبی سفید عبائیں پہن رکھی تھیں۔ اس سے پہلے مَیں ہمیشہ کسی جرم کی رپورٹ لکھوانے ہی پولیس سٹیشنوں میں گئی تھی۔ بطور مجرم یہ میرا پہلا دورہ تھا۔

ایک ڈیسک کے پیچھے بیٹھے جوان پولیس لیفٹیننٹ نے میرے شناختی دستاویزات الٹ پلٹ کر دیکھے۔ میرے پاس آسٹریلیا، برطانیہ، مصر، ایران، عراق، اردن، امریکہ اور یمن کے پریس کارڈز موجود تھے۔ مَیں نے عرب سٹ کے اجلاسوں اور صدارتی محلات کے پاس بھی حاصل کر رکھے تھے۔ حتیٰ کہ سعودی عرب کی اپنی وزارت اطلاعات کا جاری کردہ ایک پلاسٹک پریس بیج بھی شامل تھا۔ لیفٹیننٹ نے ان سب پر غور کیا۔ پہلے انہیں افقی اور پھر عمودی رخ پر قطار میں رکھا۔ اس کے بعد ان کی ایک ڈھیری لگائی، کہ جیسے وقعت کا اندازہ کر رہا ہو۔

آخر کار اس نے اوپر دیکھا اور میرے سر سے عین اوپر دیوار کی جانب نظریں لگا دیں۔ بیش تر کٹر مسلمانوں کی طرح وہ ایک نامحرم عورت کو دیکھ کر خود کو آلودہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ میرے ساتھ یوں مخاطب ہوا جیسے کسی تیسرے غیر موجود شخص سے بات کر رہا ہو: ''میرا خیال ہے کہ خاتون کافی عرصے سے سعودی عرب نہیں آئیں۔ اُنہیں ہماری روایات کا علم نہیں۔'' پھر وہ دوبارہ میرے کاغذات پر غور کرنے لگا اور ڈھیری میں سے ایک پاس اٹھا کر اپنے انگوٹھے اور انگشت شہادت کے درمیان الٹا پلٹا۔ پھر وہ خفیف سی فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا، ''یہ پاس گزشتہ روز ایکسپائر ہو گیا ہے۔''

صبح کے قریب لیفٹیننٹ نے میرے کاغذات مجھے واپس کیے اور اگلے چند گھنٹے کسی ہوٹل میں گزارنے کا اجازت نامہ جاری کر دیا۔ ہوٹل واپس پہنچی تو ریپشنسٹ نے ایک فلپائنی بیرے کو بلایا

تا کہ وہ مجھے میرے کمرے تک پہنچادے۔ یہ کمرہ ایک بالکل خالی فلور پر تھا۔ ایک مسلح گارڈ ایلیویٹر کے قریب منڈلا رہا تھا۔

''وہ یقیناً مجھے بہت خطرناک سمجھتے ہیں،'' میں بڑبڑائی۔ فلپائنی بیرا نہ مسکرایا۔

''ان کے خیال میں تمام عورتیں خطرناک ہیں،'' اس نے میرا بیگ دروازے کی دہلیز کے پار رکھتے اور گارڈ کی تیز بیں نگاہوں تلے واپس جاتے ہوئے کہا۔

میں بستر پہ لیٹ کر آئینے پر چسپاں ایک سٹکر دیکھنے لگی جس میں قبلہ کی سمت بتائی گئی تھی۔ گزشتہ تین برس کے دوران کرائے پر لیے ہوئے میرے ہر کمرے میں اسی طرح کا سٹکر موجود ہوتا تھا۔ نائٹ ٹیبل پر، پردے سے وِس کیا ہوا، چھت پر لگایا ہوا۔ سورج نکلنے میں چند منٹ باقی تھے۔ میں چلتی ہوئی کھڑکی تک گئی اور انتظار کرنے لگی۔ جب دھند بھرے نیلے افق پر زرد روشنی کی ایک طشت نمودار ہوئی تو سکوت بکھر گیا، جیسے ہر صبح کو ہوتا ہے، اور تیرہ سو سال سے ہوتا آیا ہے۔

شہر کی سینکڑوں مساجد سے مؤذن کی آواز آنے لگی: حی علی الفلاح، الصلوٰۃ خیر من النوم۔ سورج کے مغرب کی جانب سرکنے پر ایک ارب مسلمان دہران کے مسلمانوں والی سرگرمیوں میں مصروف ہوگئے: وہ بستروں سے اٹھے، قبلہ رو ہو کر زمیں بوس ہوئے۔ میرے ہوٹل سے خانہ کعبہ 700 میل دور تھا۔

میں 1987ء کے موسم گرما کی ایک رات کو مسلمان عورتوں کے درمیان کچھ عرصہ زندگی گزارنے گئی تھی۔ میں ایک مغربی رپورٹر کی حیثیت میں گئی جو روز روز کی خبروں سے روزی کماتا ہے۔ مجھے یہ تفہیم حاصل کرنے میں کوئی ایک سال لگ گیا کہ وہاں ساتویں صدی عیسوی کے واقعات صبح کے اخبارات میں چھپنے والی خبروں سے زیادہ وقعت واہمیت رکھتے تھے۔

ایک مسلمان عورت سحر نے مجھے اولین تفہیم کروائی۔

جب میں مشرق وسطیٰ میں نامہ نگار بن کر آئی تو سحر کو دی وال سٹریٹ جرنل کے قاہرہ بیورو میں کام کرتے ہوئے دو سال ہو چکے تھے۔ وہ پچیس سال کی، یعنی مجھ سے چھ سال چھوٹی تھی، لیکن تحمل اور آداب کے معاملے میں کوئی دس سال بڑی۔ ہر قسم کی نیوز کوریج کے لیے جاتے وقت وہ ہمیشہ پوری طرح بنی سجی ہوتی۔ اس کا میک اَپ اس قدر دبیز تھا کہ اصل شکل وصورت دیکھنے کے لیے

ماہرین آثار قدیمہ کی پوری ایک ٹیم کی ضرورت پڑتی۔

میرا شوہر ٹونی اخبار میں اپنی نوکری چھوڑ کر میرے ساتھ بطور فری لانسر آ گیا تھا۔ میں کوئی ایک سال تک مشرق وسطیٰ کے بند دروازوں پر دستک دیتی رہی۔ پھر سحر کی مہربانی سے میں نے اوپر نگاہ دوڑائی اور صرف اپنے لیے کھلی ہوئی ایک کھڑکی دیکھی۔ آہستہ آہستہ میں نے محسوس کیا کہ ہم دونوں بہت قریبی دوست بن گئی ہیں۔

تب ماہ رمضان کے شروع میں ایک صبح کو میں نے دروازہ کھولا تو سامنے ایک اجنبی عورت کو کھڑے پایا۔ خوب صورت کنڈل غائب ہو چکے تھے، میک اپ کھرچ کر اتار دیا گیا تھا اور دلآویز خطوط والے لباس کی جگہ ایک " بیلہ نما چادر نے لے لی تھی۔ سحر نے بنیاد پرست مسلمان عورتوں والا لباس اختیار کر لیا تھا۔

مشرق وسطیٰ میں ایک سال گزارنا اور مذہبی بحالی کی گڑگڑاہٹ محسوس نہ کرنا ناممکن تھا۔ سارے جزیرہ نما عرب اور شمالی افریقہ میں پہلے سے زیادہ عورتیں سر ڈھانپنے لگی تھیں؛ زیادہ مرد ڈاڑھی بڑھانے اور مسجد جانے لگے تھے۔ میں نے سوچا کہ غریب لوگ مایوس ہو کر آسمانی راحت کی تلاش میں اسلام کی جانب مائل ہو رہے تھے۔ لیکن سحر نہ غریب تھی اور نہ مایوس۔

سارے رمضان کے دوران میں نے سحر سے اس کے فیصلے کے متعلق گھنٹوں گفتگو کی۔ جواب میں وہ اسلامی جہاد اور اسلامی برادری کا نعرہ ہی سناتی: ''اسلام ہی جواب۔'' سوال یقیناً کافی واضح تھا: مایوس کن حد تک غریب ملک ہر نو ماہ بعد دس لاکھ نفوس کی رفتار سے بڑھتی ہوئی آبادی کو خوراک، تعلیم اور روزگار کیسے فراہم کرتا رہے گا؟ سوشلزم اور سرمایہ داری کے ساتھ دل لگی مصر کی معاشی بدحالی روکنے میں ناکام رہی تھی۔ اسلامی تحریک حال ہی میں درآمد کی گئی ان آئیڈیالوجیز کو ترک کرنے اور قرآن کا بتایا ہوا راستہ اپنانے کا مطالبہ کر رہی تھی۔ سحر دلیل دیتی، اگر خدا نے قوانین، اخلاقیات اور سماجی تنظیم کا ایک مکمل ضابطہ نازل کیا ہے تو اُس پر عمل کیوں نہ کیا جائے؟

سحر نے مقامی مسجد میں خواتین کے ایک درس میں شمولیت اختیار کی تھی اور ایک نوجوان، باپردہ معلّمہ کے زیر اثر آ گئی۔ اس نے کہا، ''میں وہاں بیٹھ کر قرآن کی تلاوت کرتی اور پڑھتی کہ عورتوں کو اپنا سر ڈھانپنا چاہیے، اور پھر ننگی بازو لیے بازار میں چلنے لگی۔ مجھے لگا کہ میں صرف مغربی انداز اپنانے کی خواہش میں وہ لباس پہنتی تھی۔ آخر ہر مغربی چیز کی نقالی کیوں کی جائے؟ کچھ اپنا

کیوں نہ آزما کر دیکھا جائے؟"

اس "کچھ" کی متعدد صورتیں تھیں۔ انتہا پسندوں نے شاہراہ اہرام پر دھاوا بولا اور شراب پیش کرنے والے سیاحتی کلبوں کو آگ لگا دی۔ دیہی علاقے میں ایک شیخ نے کھیرے اور اروی کی فروخت پر پابندی لگانے کا مطالبہ کیا کیونکہ یہ لمبی، گودے دار سبزیاں کاٹتے ہوئے عورتوں کے ذہن میں فاسد خیالات پیدا ہو سکتے تھے۔ قاہرہ میں اس اعلان کا مذاق اڑانے والے ایک مصنف کو دفتر کے باہر گولی مار دی گئی۔ تاہم، شہر میں ایک زلزلے کے باعث تباہی پھیلنے پر بنیاد پرستوں نے امدادی کیمپ لگائے اور متاثرین کی دیکھ بھال میں حکومت کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔

کئی ہفتے گزر جانے پر سحر اپنی نئی شناخت میں مزید دھنس گئی۔ مَیں اپنی سیکولر زندگی کو اس کی مطابقت میں لانے لگی۔ مَیں نے رمضان کی صبحوں کو کافی پینا چھوڑ دی، کہ کہیں اس کی خوشبو سحر کے لیے مشکل نہ پیدا کر دے۔ وہ چاکلیٹ کھانے سے پہلے بھی اجزا کی فہرست پڑھتی، کیونکہ الکحل والی کوئی چیز کھانا ممنوع تھا۔ آہستہ آہستہ مجھے سحر کی نئی زندگی سے تال میل پیدا کرنا آ گیا۔ ہمارے کیلنڈر پر مسلم مذہبی دنوں کے نام جگہ بنانے لگے: لیلۃ القدر، قربانی کا روزہ، حج۔

ایک صبح کو سحر سوجی ہوئی آنکھوں کے ساتھ دفتر آئی تو کہنے لگی: "زیادہ تر رات کپڑے بیننے میں گزر گئی۔" حجاب اختیار کرنے کے بعد اس کے بیشتر شوخ لباس بیکار ہو گئے تھے۔ لیکن وہ اپنے کپڑوں کی ساری الماری کو مسترد کر دینا نہیں چاہتی تھی۔ "ہر لباس میں کوئی نہ کوئی خرابی تھی۔ چند ایک کو بچانے کے لیے بہت محنت کرنا پڑی۔"

وہ کہتی تھی کہ حجاب قاہرہ کی پرہجوم گلیوں میں اسے تحفظ دیتا تھا۔ "آپ نے کبھی کسی باپردہ لڑکی سے زنا ہونے کی خبر نہیں سنی ہوگی،" اس نے کہا۔ دراصل قاہرہ میں کسی سے بھی زنا ہونے کی خبر غیر معمولی تھی، جہاں ہر قسم کے جرائم مغربی شہروں کی نسبت بہت کم تھے۔ لیکن کولہوں پہ ہاتھ پھیرنا اور جملے کسنا عام تھا　　بالخصوص پرہجوم علاقوں میں اور مغربی لباس والی عورتوں کے ساتھ۔

سحر نے محسوس کیا کہ حجاب کی وجہ سے اُسے عورتوں کے غیر معمولی نیٹ ورک تک رسائی بھی حاصل ہو گئی تھی۔ اگر بیوروکریسی کے درمیان اسے کوئی باحجاب عورتیں مل جاتیں تو سرکاری محکموں سے تفتیشی پرمٹ اور اپائنٹمنٹس حاصل کرنا آسان ہو جاتا۔ اپنی اسلامی بہن کو ملازمت میں کامیاب دیکھنے کی خاطر وہ اُس کی درخواستوں کو اولین ترجیح دیتیں۔ ساتھ ہی ساتھ سحر کو مردوں

سے بات چیت میں بھی آسانی محسوس ہوئی: ''انہیں میرے جسم کی بجائے میرے ذہن سے واسطہ پڑتا ہے،'' اس نے کہا۔

اس نے کہا کہ لباس تو محض ایک آغاز تھا۔ اس کی نظر میں جرائم کی بڑھتی ہوئی شرح، ناجائز اولاد اور بوڑھوں کو نظر انداز کرنا سیکولر انداز زندگی کے دیوالہ پن کا ثبوت تھا۔ سحر کا خیال تھا کہ اس سب کی تہہ میں مغربی نسوانیت پسندی کا جنسی برابری پر اصرار موجود تھا۔ ''اسلام یہ نہیں کہتا ہے کہ عورتیں مردوں سے کمتر ہیں، وہ تو محض انہیں مختلف بتاتا ہے،'' سحر نے کچھ اسلامی عدالتوں میں جج خواتین پر پابندی لگنے کی وضاحت کرتے ہوئے دلیل دی۔ ''عورتیں مردوں کی نسبت زیادہ جذباتی ہیں، کیونکہ خدا نے انہیں بچوں کے لیے بنایا ہے۔ چنانچہ عدالت میں عورت بے جا رحم دکھا سکتی ہے۔''

سحر سے باتیں کرتے ہوئے مجھے ایک پرانا احساس یاد آ گیا۔ جب میں سڈنی کیتھولک سکول میں چودہ برس کی کانوینٹ طالبہ تھی تو ڈپٹی ہیڈ نن نے ہمیں اسمبلی میں بلایا اور فہمائش کی۔ کچھ لڑکیوں کو گلیوں میں بلیزر کے بغیر صرف سکول کے سویٹروں میں گھومتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ اس نے کہا کہ سویٹر ناشائستہ تھے، کیونکہ ان میں ہماری چھاتیاں لڑکوں کی نظروں میں آتی ہیں۔ سکول کے یونیفارم میں بلیزر شامل تھا اور اگر کوئی لڑکی بلیزر پہنے بغیر صرف سویٹر میں باہر جانے کی جرأت کرتی تو اسے برا قرار دیا جاتا۔ اسی نن نے ہمیں چرچ میں ہیٹ پہننے پر زور دیا۔ اس نے سینٹ پال کا حوالہ دیتے ہوئے ہمیں بتایا کہ عورت عدن میں انسان کی ذلت کا باعث بنی تھی، لہٰذا اس کا خداوند کے گھر میں ننگے سر جانا ٹھیک نہیں۔

مَیں نے نن کو ایک بوسیدہ پرانی چیز خیال کیا؛ اور جونہی پتا چلا کہ امتناع حمل اور طلاق پر کیتھولک ازم کی لگائی ہوئی پابندی عورتوں کی زندگیاں برباد کر سکتی ہے تو چرچ جانا ترک کر دیا۔ میری ہی نسل کی عورت، سحر نے بالکل الٹ راہ چنی تھی۔ یہاں کچھ ہو رہا تھا، اور مَیں نے اسے سمجھنے کا فیصلہ کر لیا۔

مَیں نے عربی زبان سے آغاز کیا۔ پانچ مسلمانوں میں سے صرف ایک عرب ہے، لیکن روزانہ ایک ارب سے زائد مسلمان عربی زبان میں ہی خدا سے ہم کلام ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ قرآن کے دو انگلش تراجم کا مطالعہ بھی کیا۔ کچھ الجھنوں کی وضاحت حاصل کرنے کی خاطر مَیں

مذہبی مدرسوں میں بھی جانے لگی اور اسلامی تاریخ میں نمایاں کردار ادا کرنے والی درجنوں عورتوں کے متعلق جانا۔ وہ پردے کے پیچھے اور محاذ جنگ پر بھی دکھائی دیتی تھیں۔

دریں اثناء افغانستان، الجیریا اور سوڈان میں اسلامی بنیاد پرست اقتدار کی جانب بڑھ رہے تھے۔ مصر اور اردن میں طاقت ور اقلیتوں نے اپنی حکومتوں کو شریعت کی جانب دھکیل دیا تھا۔ ہجرت کر کے مغرب آنے والے مسلمان بھی مطالبات کر رہے تھے: گستاخانہ کتب پر پابندی لگاؤ، ہماری بیٹیوں کو نقاب پہن کر سکول جانے کی اجازت دی جائے، لڑکیوں کے لیے علیحدہ تعلیم کا بندوبست کرو۔

کیا قرآن اور اسلامی تاریخ کے مثبت پہلوؤں کو بازیاب کرنا اور مسلم نسوانیت پسندی کی کوئی صورت وضع کرنا ممکن تھا؟ کیا مسلمان بنیاد پرست مغربی لبرلز کے ساتھ زندگی گزار سکتے تھے، یا باہمی مفاہمت کی خاطر دونوں کو اپنے اپنے اصولوں کی قربانی دینا ہوگی؟

جوابات ڈھونڈنے کے لیے مَیں نے ایک ایسا طریقہ تلاش کیا جس کا خیال آنے میں ایک سال لگ جانے پر یقین نہیں آتا۔ مَیں عورتوں سے بات چیت کرنے لگی۔

پہلا باب

مقدس پردہ

جب عورتوں سے بھری ہوئی بس خمینی کے گھر کی جانب جاتی ہوئی تہران کی ٹریفک میں آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی تو میرے سوا بس میں سوار سب عورتوں کی آنکھوں سے اشک رواں تھے۔ ہم کالے بینر والی ایک گزرگاہ کے قریب رکے۔ میری دلچسپی ایک دم بڑھ گئی، جیسے نقطہ کھولاؤ قریب آنے پر کیتلی کی سیٹی بجتی ہے۔ گزرگاہ کے آخری سرے پر خمینی کا گھر اور چھوٹا سا ملحقہ حسینیہ تھا جہاں وہ اپنی موت سے پانچ ہفتے پہلے تک عبادت اور تبلیغ کرتا رہا تھا۔ میں پسینے میں شرابور اور اپنی چادر کو سنبھالنے میں مصروف تھی۔ میں بس سے اتری اور چلتی ہی کالی قطار میں شامل ہوگئی جو ''اے خمینی! اے امام!'' کا گریہ کرتی ہوئی نیچے جارہی تھی۔

ہمارے آگے آگے مردوں کا ایک ٹولہ حسینیہ میں داخل ہوا۔ وہ مشہد سے آئے ہوئے فیکٹری مزدور تھے اپنے آنسوؤں سے تر چہروں کو موٹی ہتھیلیوں سے پونچھتے ہوئے۔ خمینی جس بالکنی سے خطاب کیا کرتا تھا وہاں اس کی موت کے بعد سے شیشہ لگا دیا گیا تھا کیونکہ سوگواران اس کی کرسی کو چومنے اور چھونے کی خاطر ریلنگ پر چڑھنے کی کوشش کرتے تھے۔ ہمارا گروپ حسینیہ سے ایک طرف مڑ کر پردہ لگے دروازے میں داخل ہوا جہاں خواتین انقلابی گارڈز کا پہرہ تھا۔ گارڈز نے اپنی سر سے پاؤں تک لٹکی ہوئی چادروں کے نیچے بالکل مرد پہریداروں جیسی زیتونی رنگ کی

یونیفارم پہن رکھی تھی جس پر رائفل، قرآن اور بند مٹھی کی علامت بنی تھی۔ پردے کے پیچھے خمینی کی بیوہ ہمیں چائے پلانے کو منتظر بیٹھی تھی۔

وہ تریزوں والے صحن کے ایک کونے میں اپنی بیٹی اور بہو کے ساتھ چادر میں ملفوف بیٹھی ہوئی تھی۔ خمینی کی 75 سالہ بیوی خدیجہ کا چہرہ دادیوں جیسا جھریوں زدہ تھا۔ باریک رم والے چشمے میں سے جھانکتے ہوئے اس نے مسکرا کر میری جانب سن رسیدہ ہاتھ بڑھایا۔ جب اس نے میرا ہاتھ تھام کر نرمی سے تھپتھپایا تو اس کی چادر ایک طرف کو سرک گئی اور گاجر جیسی ایک سرخ لٹ پر چاندی کی کناری دکھائی دی۔ خدیجہ اپنے شوہر کی زندگی میں بالوں کو رنگا کرتی تھی۔

پتہ نہیں کیوں میں کبھی یہ تصور نہیں کر پائی تھی کہ آہنی چہرے والے آیۃ اللہ کی ایک بیوی بھی تھی اور سرخ بالوں والی تو ہرگز نہیں۔ اور میں نے اسے خوب صورت، کھلکھلاتے ہوئے پوتوں نواسوں کے ساتھ تو کبھی بھی تصور نہیں کیا تھا جو صحن میں بچھے ہوئے قالین پر ادھر اُدھر بھاگ دوڑ رہے تھے۔ خمینی کی 47 سالہ بیٹی زہرا مصطفوی نے کہا: ''میں جانتی ہوں کہ وہ دیکھنے میں بہت سنجیدہ بلکہ غصے میں لگتے تھے، لیکن ہمارے ساتھ ان کا رویہ بالکل مختلف تھا۔ وہ بچوں کے ساتھ بہت ہنسی مذاق کیا کرتے تھے۔ جب ہم آنکھ مچولی کھیلتے تو وہ ہمیں اپنی عبا کے اندر چھپا لیتے۔'' زہرا کے مطابق خمینی نہایت حساس اور نئے دور کا انسان تھا؛ جب پانچ بچے چھوٹے چھوٹے تھے تو وہ رات کو اٹھ کر انہیں دودھ کی بوتلیں دیتا اور اپنی بیوی سے کوئی ذاتی خدمت نہیں لیتا تھا ''حتیٰ کہ پانی کا ایک گلاس بھی لانے کو نہ کہتے۔'' دکھائی گئی گھریلو تصاویر میں آیۃ اللہ دل کھول کر ہنس رہا تھا جبکہ اس کا گداز ہاتھوں والا پوتا اس کے منہ میں چمچ لیجا رہا تھا۔

ہم فرش پر بچھے سرخ ایرانی قالین پر خمینی کے خاندان کی خواتین کے پاس آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئیں۔ ''یہ تمام قالین مانگ کر لائے گئے ہیں۔ خاندان کے پاس اتنی عمدہ چیز کوئی بھی نہیں،'' انقلابی گارڈز میں سے ایک نے کہا جو چھ سال سے خدیجہ کی حفاظت کرنے کے علاوہ گھریلو کام میں بھی ہاتھ بٹا رہی تھی۔ اس نے بطخوں کی تصویر والی پلاسٹک کی پلیٹوں میں ہمیں کھجوریں اور تربوز کی قاشیں پیش کیں۔ ''ہمیں افسوس ہے کہ آپ کی تواضع نہیں کر سکے، لیکن میرے شوہر نے اپنی ساری 80 سالہ زندگی کے دوران سادگی پر بہت زور دیا ہے،'' خدیجہ نے کہا۔

خمین نامی گاؤں کے رہنے والے ایک غریب مذہبی طالب علم روح اللہ نے 27 سال کی عمر

میں خدیجہ ثقفی کا ہاتھ مانگا تھا۔ اس کا باپ، ایک ممتاز آیۃ اللہ (لفظی مطلب 'خدا کا عکس'۔ یہ اصطلاح فاضل ترین شیعی عالم کے لیے استعمال ہوتی ہے) نے رشتے پر زیدہ سوچ بچار نہ کی۔ لیکن خدیجہ کے احساسات مختلف تھے۔ اس نے چادر میں لپٹے ہوئے اسے چائے کا ایک گلاس پکڑایا تو اپنے منگیتر کی جھلک دیکھ لی تھی۔ اس نے اپنے باپ پر ہاں کرنے کے لیے زور دیتے ہوئے اسے ایک خواب کے متعلق بتایا جس میں پیغمبروں نے بتایا تھا کہ خمینی کا روح اللہ ایک عظیم مذہبی رہنما بنے گا۔

خدیجہ اس کی واحد بیوی تھی۔ وہ عوام کی نظروں سے اس قدر اوجھل رہی کہ بیشتر ایرانی اس کا اصل نام تک نہیں جانتے تھے۔ زہرا نے بتایا: ''ایک مرتبہ کسی نے ان کا نام غلطی سے بتول لکھ دیا جو اصل میں ان کی ملازمہ کا نام ہے۔ میری ماں کو بتول نام سے نفرت ہے۔'' پھر بھی یہ نام چمٹا رہا کیونکہ آیۃ اللہ نام کی تبدیلی کا مسئلہ اٹھا کر اپنی بیوی کو توجہ کی مرکز بنانا پسند نہیں کرتے تھے۔ عوام میں نامعلوم ہونے کے باوجود اندر کے لوگ جانتے تھے کہ خدیجہ کافی بااثر تھی۔ خمینی کے کان میں کوئی بات (چاہے وہ ریاستی امور سے ہی متعلق ہو) ڈالنے کے خواہش مند مرد اپنی بیویوں کے ذریعہ خدیجہ سے کہلواتے تھے۔

خمینی کا چھوٹا سا دو منزلہ گھر سابق شاہ کے چمکتے ہوئے سبز مرمریں محل کے عین برعکس تھا جسے اب ایک عجائب گھر کی صورت دے دی گئی ہے۔ خمینی کے گھر میں دیواروں سے سبز پینٹ کی پپڑیاں اتری ہوئی تھیں اور کھڑکی میں پھٹا ہوا پردہ پھڑپھڑا رہا تھا۔ ایک برہنہ کمرے میں بطور بستر کام آنے والی دبیز چٹائیاں لپیٹ کر کونے میں رکھی ہوئی تھیں۔ باورچی خانے میں پرانی طرز کا ایک چولہا اور ایک برقی سموار کل اسباب تھے۔ ''ایک مرتبہ جب امام نے انار کے دو دانے سنک میں گرے ہوئے دیکھے تو مجھ سے کہا کہ کھانا ضائع نہ کیا کروں۔ وہ ہمیشہ ہمیں یاد دلاتے رہتے کہ کمرے سے باہر نکلنے پر لائٹس آف کر دیا کریں،'' ہماری منتظر انقلابی گارڈ نے بتایا۔

ہر چھوٹی سی بات دیگر مہمانوں کی آنکھوں سے آنسو جاری کر دیتی۔ بہ آواز بلند رونے والوں میں سے لبنان کی حزب اللہ کی ایک خاتون تھی جو کھڑی ہوئی اور جذباتی انداز میں امام کی بیوہ کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے ہمیں امام کے متبرک گھر میں داخل ہونے کی اجازت دی۔ وہ سسکیاں لیتے ہوئے بولی ''اے خدا، ہمیں صبر عطا کر، ہم اس مقام پر آئی ہیں جہاں عظیم امام سانس لیا کرتا تھا۔ ہم

سب اس کے طور طریقوں سے اپنی وابستگی ظاہر کرنے کی خاطر اس مقدس مقام پر اکٹھی ہوئی ہیں۔"

قریبی مسجد سے آتی مغرب کی اذان کی آواز صحن میں پھیل گئی جو چائے کی پارٹی ختم ہونے کا اشارہ تھی۔ کونے میں بیٹھی خدیجہ وضو کرنے کے لیے کھڑی ہو چکی تھی۔ ٹریفک میں کھڑی بس میں سوار ہوتے ہوئے حزب اللہ والی عورت بدستور کہہ رہی تھی: "ہماری زندگی امام سے پہلے اور امام سے بعد کے دو حصوں میں بٹ گئی ہے۔ ہمیں تو ابھی ہونے والے نقصان کا اندازہ لگانے کا بھی موقعہ نہیں ملا۔"

میرے پاس یہ سب سمجھنے کا وقت نہیں تھا۔ 1979ء میں امریکی سفارت خانے پر قبضے کے بعد ایران کے دروازے تمام امریکی صحافیوں کے لیے بند ہو چکے تھے۔ شاذ و نادر جاری ہونے والے ویزے 36 گھنٹے تک کارآمد ہوتے۔ خمینی کی وفات سے قبل مجھے صرف ایک مرتبہ 1988ء میں ویزہ ملا تا کہ امریکی بحری جہاز Vincennes سے کی گئی کارروائی کے باعث ایک ایرانی ایئر بس میں سوار 290 سویلین ایرانیوں کی تجہیز و تکفین کی رپورٹنگ کر سکوں۔

لیکن مجھے سمجھنے کی ضرورت تھی۔ الجیریا سے افغانستان اور پاکستان تک کی مسلمان عورتوں کے ساتھ جو کچھ بھی ہو رہا تھا اس کی جڑیں یہاں، شمالی تہران کے چھوٹے سے غریبانہ گھر میں تھیں۔ خمینی کا کسی طرح عورتوں کو قرون وسطیٰ والا جبہ پہننے پر مائل کر لینا ایک انقلابی اقدام تھا۔ اس کے پیغام میں کسی چیز نے ہزاروں عورتوں کو گلیوں میں شاہ کی فوج کا سامنا کرنے اور ایک ایسی شریعت کی بحالی کی خاطر اپنی جانیں داؤ پہ لگانے پر تیار کر دیا جس میں نابالغ کی شادی، کثیر الازدواجی اور بیوی کو زدوکوب کرنے کی اجازت تھی۔

خمینی کی آواز میں اسلام کے ابتدائی عہد والا تحکم موجود تھا۔ خمینی اسلام کے ایک اقلیتی فرقے شیعیت سے تعلق رکھتا تھا جس نے آنحضرتؐ کے وصال کے بعد مرکزی دھڑے سے علیحدگی اختیار کی۔ ابتدائی مسلمانوں کی اکثریت مانتی تھی کہ خلیفہ کا تعین بڑوں کی مجلس شوریٰ کے ذریعہ ہونا چاہیے، جیسا کہ صحرا کی روایت تھی۔ چونکہ عربی زبان میں روایت کو "سنت" کہتے ہیں، اس لیے وہ سنی کہلائے۔ تاہم، ایک اقلیت نے محسوس کیا کہ آنحضرتؐ کے گھرانے میں سے ہی کسی کو ان کا خلیفہ ہونا چاہیے۔ انہوں نے آپؐ کے چچازاد اور داماد کی حمایت کی۔ یہ لوگ شیعان علی (علی کے

حامی) کہلائے اور آج انہیں شیعہ کہا جاتا ہے۔ شیعوں نے معترضین ہونے کے ناتے اہل اقتدار پر سوال اٹھانا اور اگر ضرورت پڑے تو ان کے خلاف بغاوت کرنا اپنا فرض سمجھا۔ حضرت علیؓ اور آپؓ کے بیٹوں کی شہادت میں اپنا ماخذ رکھنے والے شیعوں نے کچلے ہوئے غریب لوگوں کے ساتھ اپنا تعلق جوڑا۔ خمینی نے ان تمام عمیق اعتقادات کو استعمال کرتے ہوئے 1978ء میں شاہ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔

1989ء میں خمینی کی وفات پر ایران نے ہر خواہش مند صحافی کے لیے اپنے دروازے کھول دیے۔ جوش وخروش سے ساتھ تجہیز وتکفین سے بعد ہاشمی رفسنجانی نے غیر ملکی رپورٹرز کے ساتھ پریس کانفرنس کی جو شاذ ہی ہوتی تھی۔ چونکہ اس قسم کے موقعوں کو ایران میں ٹیلی ویژن پر ضرور دکھایا جاتا ہے، اس لیے مجھے معلوم تھا کہ پریس کانفرنس سے منتظمین مجھے مائیکروفون پر زیادہ دیر بولنے نہیں دیں گے۔ لیکن جب میں نے بعد از خمینی اقتدار کے ڈھانچے کے متعلق سوال کیا تو رفسنجانی نے مجھے گھور کر دیکھا، اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے کہا: ''آپ کے لیے میرا ایک سوال ہے۔ آپ نے یہ موٹی چادر کیوں اوڑھ رکھی ہے، حالانکہ ایک سادہ سکارف سے بھی کام چل سکتا تھا؟''

ایرانی ٹیلی ویژن کے بڑے بڑے پرانی طرز سے کیمرے میری جانب گھومے۔ میں کیا کہتی؟ کہ چادر ایسی جگہوں پر جانے کے لیے ایک زبردست کیموفلاج ہے جہاں میرا جانا تصور نہیں کیا جاتا؟ کہ مجھے اس کے لہراتے ہوئے پلو سکارف اور کوٹ کی نسبت کم گرمی کا باعث لگتے ہیں؟ کہ صرف ایک روز پہلے اسلامی ہدایات کی وزارت کے ایک اہل کار نے اس لباس کو بھی ناکافی قرار دیا تھا؟ (میں خمینی کی جائے تدفین پر پہنچنے کے لیے ایک ہیلی کاپٹر پر سوار ہونے جارہی تھی کہ پروں کی تیز ہوا نے لمحہ بھر کو میری چادر ایک طرف اڑا دی اور نیچے سے میرے ٹراؤزرز اور شرٹ کی جھلک نظر آگئی۔ اہل کار نفرت بھرے انداز میں چلایا: ''اپنا پردہ درست کرو!'')

میں نے کہا: ''میں نے جذبہ باہمی احترام کے تحت اسے پہن رکھا ہے۔''

رفسنجانی کو دھچکا سا لگا۔ پریس کانفرنس میں موجود دیگر مغربی خواتین نے اپنی آنکھیں میری جانب گھمائیں۔ بعد میں خواہش ہوئی کہ مجھے اپنا مدعا زیادہ واضح طور پر بیان کرنا چاہیے تھا: کہ اگر میں ایرانی معاشرے کے تقاضوں کا احترام کرنے کو تیار ہوں تو ایران کو بھی میری ضروریات کا

احترام کرنا چاہیے۔لیکن ٹی وی کے آگے بیٹھے ہوئے اپنی آئندہ زندگیوں کی سمت کا اشارہ ڈھونڈنے کے متمنی زیادہ تر ایرانیوں کی نظر میں میری کہی ہوئی بات اہم نہیں تھی۔ان کے لیے قابل ذکر بات یہ تھی کہ رفسنجانی نے اعتدال کا ایک اشارہ دیا تھا۔بازار میں ریال کی قیمت ڈالر کے مقابلے میں بڑھ گئی، کیونکہ افواہ اڑی تھی کہ رفسنجانی نے ایک خاتون رپورٹر سے کہا ہے کہ وہ اپنی چادر اتار سکتی ہے۔تاجروں کے لیے برل ازم کا کوئی بھی اشارہ ایک اچھی خبر تھا۔

میری کہی ہوئی بات ایک یا دو لوگوں کی نظر میں باوقعت تھی۔اس رات ایران کی چھوٹی سی عیسائی اقلیت کے رکن نے ہوٹل میں مجھ سے ملاقات کی اور اس بات پر برا بھلا کہا کہ میں نے حجاب کی مخالف تمام عورتوں کے ایما پر بات کرنے کا موقعہ کیوں گنوایا۔چند روز بعد خمینی کی بیٹی زہرا نے مجھے اسلامی جمہوریہ ایران کی ویمنز سوسائٹی کے زیر اہتمام ایک کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی جس کا موضوع تھا: ''جلیل القدر امام خمینی کی شخصیت کے پہلو۔'' میں نے مسکرا کر عنوان پڑھا۔ عالی جناب امام خمینی کی شخصیت کے جس ایک پہلو سے میں واقف تھی وہ ناول نگاروں کو مار ڈالنے، نوجوان لڑکوں کو بارودی سرنگیں صاف کرنے کے لیے محاذ جنگ پر بھیجنے اور نو سال کی بچیوں کی شادیاں کرنے کی اجازت کے حوالے سے جاری کردہ اس کے فرامین تھے۔

کانفرنس تہران کے انقلابی ہوٹل میں منعقد ہونا تھی۔انقلاب سے پہلے کے دور کے شیشے کی دیواروں والے ایلیویٹر پر کانفرنس کے جاری رہنے تک اخبارات لگائی گئی تھیں تا کہ سوئمنگ پول کا منظر نظر نہ آ سکے اور مذہبی خواتین پانی سے چمکتے ہوئے مردانہ دھڑ دیکھ کر ناراض نہ ہوں۔شام کی پہلی کاک ٹیل پارٹی میں صرف فروٹ جوس کے کاک ٹیلز: غیر اسلامی شراب بالکل بھی نہیں پانچ منٹ کے اندر اندر محسوس کر لیا گیا کہ میں ایران کی ممتاز خواتین کے درمیان بالکل بے تک ہوں۔لبنان سے آئے ہوئے وفود میں ان افراد کی بیویاں بھی شامل تھیں جن کے نام اغوا کرنے والوں کی فہرست میں ملتے ہیں۔ترک دستے میں ایک طالبہ شامل تھی جس نے کلاس میں اسلامی لباس ہی پہننے پر اصرار کے باعث آرکیٹیکچر کالج سے نکالے جانے کے بعد شہرت حاصل کی تھی۔پاکستان، سوڈان، گنی، تنزانیہ، ہندوستان اور جنوبی افریقہ سے بھی مسلمان اکثریت پسند آئے ہوئے تھے۔اس گروپ کے بہت سے دشمن تھے اور ہوٹل کو مسلح انقلابی گارڈز نے گھیرے میں لے رکھا تھا۔اجازت کے بغیر کوئی بھی اندر باہر آ جا نہیں سکتا تھا۔

پارٹی کا لباس بنیادی طور پر کالا تھا۔ چادریں لمبی پینٹوں، جرابوں، پنڈلی تک اونچی سکرٹس اور magnehs نامی سکارف کے اوپر محض ایک فنشنگ ٹچ تھیں۔ جب عباؤں میں ملبوس جسم میرے اردگرد گھوم پھر رہے تھے تو میں سوچنے لگی کہ غلطی سے کہاں آ گئی ہوں۔

پارٹی میں ہونے والی گپ شپ نے میرا احساس زیاں کم کیا۔ 'یقیناً ہانگ کانگ کے لوگوں کو نو آبادیاتی صیہونیوں نے برین واش کر دیا ہے اور انہیں امام کی وفات پر کوئی دکھ نہیں ہوا،'' ایک منحنی سی چینی عورت خاتمہ مانے کہا جس نے اپنا تعارف ہانگ کانگ کے ''مسلم ہیرالڈ'' میں کام کرنے والی رپورٹر کے طور پر کروایا۔ وہ مزید بولی، ''امریکہ کی زیر قیادت دشمنان اسلام ایرانی قوم کو بے رہنما دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہر کوئی یہاں گڑبڑ پھیلنے کا متمنی تھا، لیکن خدا کا شکر ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ چاہے ہانگ کانگ کا میڈیا پوری طرح صیہونیوں کے کنٹرول میں تھا، لیکن وہ ایران میں گڑبڑ کے متعلق کوئی کہانی نہیں تراش سکے۔''

میں نے آنکھوں اور ناک کے سوا پوری طرح پردے میں ملفوف ترک طالبہ سے پوچھا کہ ترکی جیسا ملک سیکولر رہاس پر اس قدر اصرار کیوں کر رہا ہے۔ اس نے کہا، ''یقیناً آپ جانتی ہوں گی کہ اسلام دو قسم کا ہے　　امریکی اسلام اور آنحضرت کا اسلام۔ ترکی میں امریکی اسلام رائج ہے۔ اس میں مذہب کو سیاست سے الگ کر دیا گیا ہے، کیونکہ یہ سپر طاقت کے مفادات کے مطابق ہے۔ ہماری حکومت اسلامی انقلاب سے بہت خوفزدہ ہے، کیونکہ وہ مغرب کی پالتو بن کر رہنا چاہتی ہے۔''

کانفرنس کے لیے مجھے ایک مترجم دی گئی تھی　　دراز قد، زرد رو جوان خاتون حمیدہ ماریفات (Marefat)۔ جب میں نے اس کی اچھی انگلش کو سراہا تو اس نے بتایا کہ انگلش بہتر بنانے کا موقع اسے ''گھونسلے میں'' ملا تھا۔

''معاف کیجیے گا؟''

''گھونسلے میں۔ جاسوسوں کا گھونسلہ　　امریکی ایمبیسی،'' اس نے کہا۔ حمیدہ کالے نقاب والے لشکر کا حصہ رہ چکی تھی جس نے ایمبیسی پر قبضہ کیا اور عملے کو 444 دن تک یرغمال بنائے رکھا۔ اس کا کام یرغمالیوں کی ڈاک کا ترجمہ کرنا تھا۔ میں نے پوچھا کہ کیا اسے کبھی ان کے ساتھ ہمدردی محسوس ہوئی۔ ''ہاں، کبھی کبھی!'' اس نے بتایا کہ یرغمالیوں کے نام امریکی سکول کے بچوں کے

خطوط پڑھ کر کبھی کبھی ہمدردی محسوس ہوتی تھی۔ ''لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ جاسوس تھے جنہوں نے ہمارے ملک کو تباہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ انہیں رہائی دیے جانے پر میں بہت ناامید ہوئی۔ میرا ذاتی خیال تھا کہ انہیں مار ڈالنا چاہیے۔''

کیپ ٹاؤن یونیورسٹی کی ایک جنوبی افریقی طالبہ نے سر ہلا کر اتفاق کیا۔ پھر وہ چمک کر بولی، ''کم از کم رشدی کو تو مار ہی ڈالنا چاہیے۔'' اس نے حال ہی میں ''امام کے راستے'' کی تعمیم دینے کے لیے کیپ ٹاؤن میں ایک مسجد تعمیر کروانے میں مدد دی تھی، لیکن اس وقت شدید دھچکا پہنچا جب مسجد کے دوسر کردہ افراد کے خلاف بغاوت کا مقدمہ دائر ہوا۔

جنوبی افریقی لڑکی گنی سے آئی ہوئی اپنی اسلامی بہن کی طرف بے چینی سے تکتی رہی۔ یہ دراز قد، بانکی خاتون کسی بھی ہجوم میں کھڑی ہوئی صاف دکھائی پڑ جاتی، لیکن اس اجتماع میں وہ خاص طور پر نظروں کا مرکز بن رہی تھی۔ ایک بے ہیئت کالی چادر کی بجائے اس نے زردی مائل گلابی رنگ کا کپڑا اپنے دل آویز خدوخال پر چست کر کے لپیٹ رکھا تھا۔ کپڑے کا ایک سرا اس کے سر پہ رکھا ہوا تھا اور ملائم دھوپ جلا کندھا برہنہ تھا۔ اس کی خوب صورت عبا کے نیچے سے ننگے پاؤں دکھائی پڑ رہے تھے۔ اگلے چند دن کے دوران میں نے اس کی ایک یا دو اسلامی بہنوں کو دیکھا جو پنجوں کے بل اٹھ کر اس کی عبا کو کندھے پر درست کرنے یا کپڑے کا پلو اس کے بالوں پر رکھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ گنی اور ایران کی عورتوں کے ہاں واضح طور پر حجاب کی تعریف مختلف تھی۔

لفظ ''حجاب'' کا لفظی مطلب پردہ ہے، اور قرآن میں اس کا استعمال عہد نبوی کے اہل ایمان کو یہ ہدایت دینے کے لیے ہوا کہ انہیں امہات المومنین کے ساتھ کیسے پیش آنا چاہیے جب تم نبیؐ کی بیویوں سے کچھ پوچھنا ہو تو پردے کے پیچھے سے بات کرو۔ حجاب کے بارے میں آیت حضرت زینبؓ کے ساتھ سہاگ رات کے موقعہ پر نازل ہوئی تھی۔

(مصنف نے یہاں حضرت زینبؓ کے ساتھ رشتہ ہونے کا واقعہ مغربی نکتہ نظر سے بیان کیا جو غیر ضروری سمجھ کر حذف کیا جا رہا ہے۔ مترجم)

حجاب کے بارے میں آیت نے آنحضرتؐ کی زوجین پر حجرہ نشینی عائد کی تاکہ کوئی شخص ان پر (بے جا) تہمت نہ لگا سکے۔ قرآن میں عام عورتوں کے لیے ہدایات اتنی سخت نہیں تھیں: اہل ایمان

عورتوں سے کہو کہ اپنی نگاہ نیچی رکھیں اور حیا میں رہیں، اور اپنا جوبن ظاہر نہ کریں اور اپنی چھاتیوں پر چادر ڈالیں۔

قاہرہ میں جب سحر نے حجاب پہننا شروع کیا تو اس آیت کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ اس میں سر کو ڈھانپنے کا کوئی ذکر نہیں۔ میری مراد یہ تھی کہ عورتوں کو باحیا لباس پہننے کی ہدایت کی گئی ہے یعنی کہ وہ موجودہ عہد والی مہین قمیصیں اور شارٹ سکرٹس کو مسترد کر دیں۔ لیکن سحر نے جواب دیا کہ اس قسم کے معاملات میں رہنمائی کے لیے قرآن سے آگے جانے کی ضرورت ہے۔ اس نے کہا کہ سنت نبویؐ میں وضاحت کی گئی ہے کہ "دکھائی دینے والی" چیزوں میں صرف عورتوں کا چہرہ اور ہاتھ شامل ہیں۔ باقی کا جوبن یا زینت بشمول ٹخنے، کلائیاں اور گردن شوہر اور محرم رشتہ داروں کے سوا تمام مردوں سے مخفی رہنا چاہیے۔ عورت نابالغ لڑکوں اور خواجہ سراؤں کے سامنے بھی بے پردہ ہو سکتی ہے۔

لیکن سحر کی پیش کردہ تفسیر ہمہ گیر نہیں تھی۔ کچھ مسلمان عورتیں بھی میری طرح یقین رکھتی ہیں کہ مذہب ان سے صرف اعتدال کی معاصر حدود کے اندر رہ کر لباس پہننے کا تقاضا کرتا ہے۔ دیگر کا اصرار ہے کہ سر ڈھانپنے کے علاوہ ہاتھوں کو دستانوں اور چہرے کو نقاب سے چھپانا چاہیے، کیونکہ جدید دنیا کی کجروی نے عہد نبوی کی نسبت زیادہ سخت اقدامات کو ضروری بنا دیا ہے۔

اسلامی دنیا کے سنگم قاہرہ ایئرپورٹ پر اسلامی لباس کی تقریباً ہر تفسیر دیکھی جا سکتی تھی۔ خلیج میں ملازمتوں پر جاتی ہوئی پاکستانی عورتیں اپنی پرکشش شلوار قمیصیں پھڑپھڑاتی پھر رہی تھیں۔ سعودی عورتیں اپنے شوہروں کے پیچھے نقاب اوڑھے اور عبا پہنے ہوئے چل رہی تھیں۔ افغانی عورتوں نے بھی سر سے پاؤں تک پورا جسم ڈھانپ رکھا تھا۔ دوبئی کی عورتیں اکڑے ہوئے، پرندوں جیسے کالے اور سنہری ماسک پہنے ہوئے تھیں جو ناک تک اونچے تھے لیکن چمکدار خوب صورت آنکھیں ننگی تھیں۔ کچھ فلسطینی اور مصری عورتوں نے ہلکے رنگوں کے پیروں تک لمبے اور بٹنوں والے کوٹ پہنے ہوئے تھے اور ان کے سروں پہ سفید سکارف تھے؛ کچھ دیگر میچنگ سکارفس اور پنڈلیوں تک لمبی سکرٹس میں ملبوس تھیں؛ انہوں نے سکارفس کو موتیوں جڑے بینڈز سے جوڑ رکھا تھا۔

اسلامی لباس کی سب سے عجیب تفسیر مجھے الجیریائی صحارا کے بیابان میں ملی جہاں خانہ بدوش قبائل Tuareg کی روایت ہے کہ بلوغت کے بعد عورتوں کی بجائے مردوں کو پردہ کرنا چاہیے،

جبکہ عورتیں چہرہ ننگا ہی رکھتی ہیں۔ جونہی مردوں کی ڈاڑھی مونچھ پھوٹتی ہے اور وہ رمضان کے روزے رکھنا شروع کرتے ہیں تو ان کے لیے آنکھوں کے سوا سارا چہرہ نیلے کپڑے سے ڈھانپنا ضروری ہو جاتا ہے۔ ایک Tuareg مرد نے اس دستور کی وضاحت یوں کی۔ ''ہم سورما اپنے چہروں کا پردہ کرتے ہیں تاکہ دشمن ہمارے ارادے نہ بھانپ سکے، لیکن عورتوں کو کچھ بھی چھپانے کی ضرورت نہیں۔'' تواریگ مسلمان ہیں، لیکن عقیدے کے بارے میں ان کی پیش کردہ وضاحت عورتوں کو شادی سے قبل کافی جنسی آزادی اور شادی کے بعد مردوں کے ساتھ قریبی افلاطونی دوستیوں کی اجازت دیتی ہے۔ ایک تواریگ ضرب المثل کے مطابق: ''مرد اور عورتیں ایک دوسرے کی آنکھوں اور دل کے لیے ہیں، نہ کہ صرف بستر کے لیے۔'' دیگر مسلمانوں کی نظر میں تواریگی دساتیر ایک طرح کی تکفیر دین ہیں۔ درحقیقت لفظ تواریگ یا تواریغ کا مطلب ہی ''خدا کو چھوڑنا'' بنتا ہے۔

جہاں عورتوں نے نقاب اوڑھا وہاں اسلامی انداز میں اس سے پیسہ کمایا گیا۔ قاہرہ میں بانقاب خواتین کے لیے سلام شاپنگ سنٹر تھا ملبوسات کا ایک تین منزلہ ایمپوریم جس میں اسلامی لباس کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ زیادہ تر سٹور انتظامیہ کے خیال کے مطابق ''تربیتی حجاب'' کے لیے وقف تھا رنگوں کی مطابقت رکھنے والی لانگ سکرٹس اور سکارف، ہڈیوں کے بٹنوں اور کندھوں پر پیڈز والی لمبی جیکٹیں جو اسلامی تقاضوں کو کم سے کم حد تک پورا کرتی تھیں۔ ایک مینیجر نے وضاحت کی کہ نظری اعتبار سے بات کی جائے تو جو گاہک اس قسم کے ملبوسات پہننا شروع کرتی ہیں وہ درجہ بدرجہ زیادہ سادہ رنگ اور لمبے، بے ہیئت لباس پہننے لگتی ہیں، اور انجام کار کالے جبے، دستانے اور حجاب کی منزل تک پہنچ جاتی ہیں۔ لیکن یہ سادہ ملبوسات (جن کی قیمت انداز اً دس ڈالر ہے) زیادہ منافع بخش ''اعلیٰ فیشن'' والے حجاب کے ریکس پر منا مشکل ہیں جہاں ایک درست اسلامی لباس کی قیمت کسی سول سرونٹ کی ماہانہ تنخواہ سے تین یا چار گنا زیادہ ہو سکتی ہے۔

بیروت کی عظیم مسجد نبوی کی بیسمنٹ میں حزب اللہ نے ایک اسلامی فیشن فیکٹری قائم کی تاکہ دنیا بھر میں حجاب کی بڑھتی ہوئی طلب سے نقد فائدہ اٹھایا جا سکے۔ فیکٹری کی مینیجر خاتون حاجیہ زہرا نے بڑے جوش سے بتایا ''میرا اسلام لڑاکوں کا ایک ٹولہ نہیں۔ یہ ایک ثقافتی انقلاب ہے، نظریات کا انقلاب۔'' ایک جرمن فیشن میگزین کے صفحات پلٹتے ہوئے اس نے مجھے دکھایا کہ کس

طرح جیبوں، زپس اور بازوؤں کے جدید ترین ڈیزائنوں کو لمبے، جسم کو نمایاں نہ کرنے والے ملبوسات میں سمویا جا سکتا ہے۔ ہمارے اردگرد کپڑے کی گانٹھیں چھت تک جا رہی تھیں۔ اس نے وضاحت کی کہ سرخ اور پیلے رنگ کی گانٹھیں بچوں کے ملبوسات میں استعمال ہوں گی۔ ہلکے نسواری، سرمئی اور مہندی رنگوں کی گانٹھیں خواتین کے ملبوسات کے لیے تھیں۔ یہ راحت بخش رنگ ہیں۔ اسلامی لباس کے فلسفہ کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ خواتین طمانیت اور راحت کا ایک تاثر اپنے اردگرد چھوڑیں۔''

حجاب اسلامی بحالی کی سب سے بین علامت تھا جس نے سحر اور بہت سی دیگر نوجوان عورتوں کو اپنے سحر میں لے لیا۔ اس کا آغاز 1967ء میں اسرائیل کے ساتھ چھ روزہ جنگ میں مصر کی تباہ کن شکست کے بعد ہوا۔ مسلم فلسفیوں نے جمال عبدالناصر کی حکومت کے سیکولرازم کو ذمہ دار ٹھہرایا اور مصریوں پر زور دیا کہ وہ اسلامی قوانین کی جانب واپس جائیں۔ آہستہ آہستہ باحجاب خواتین کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔

لیکن اس رجحان میں اصل تیزی ایران کے مذہبی انقلاب کے ساتھ واقع ہوئی جب حجاب پہننا مذہبی کے ساتھ ساتھ سیاسی فعل بھی بن گیا۔ 1935ء میں شاہ ایران کے باپ نے چادر اوڑھنے پر پابندی لگا دی تھی۔ رضا شاہ اپنے ملک کو جدید دیکھنا چاہتا تھا، لہٰذا اس نے سوچا کہ قدیم کا لاجہ اس کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ لیکن راسخ العقیدہ اور بالخصوص ادھیڑ عمر عورتیں یک دم اس زبردست تبدیلی کو قبول نہ کر پائیں۔ Sattareh Farman Farmaian اپنی یادداشت ''Daughter of Persia'' میں اپنی ماں کی مایوسی کے متعلق لکھتی ہے: ''جب میری ماں کو پتا چلا کہ اسے زمانے سے چلے آ رہے حجاب کا دستور ترک کرنا ہو گا تو وہ آپے سے باہر ہو گئی۔ میری ماں اور تمام روایتی لوگوں نے رضا کے حکم کو اس کی جانب سے کیا گیا بدترین اقدام قرار دیا　مذہبی طبقے کے حقوق پر حملہ کرنے سے بھی زیادہ برا اقدام، ضبطگیوں اور قتل گری کی کارروائیوں سے بھی زیادہ برا فعل۔'' شاہ کے خوف سے اس کے شوہر نے اسے پردے کے بغیر باہر جانے کا حکم دیا۔ ''اگلے روز وہ احساس تذلیل اور غصے میں روتی ہوئی اپنے بیڈروم میں بند ہو گئی...... اس نے اشک بار آنکھوں کے ساتھ اپنے کمر تک لمبے کالے بالوں کو ایک چھوٹے سے فرانسیسی ہیٹ تلے

چھپانے کی بیکار کوشش کی۔"

آزادروی پر مبنی یہ فرمان دیگر کی نظر میں ایک طرح کی قید بن گیا۔ کچھ ہی عرصہ قبل بیٹیوں کو سکول میں داخل کروانے والے مردوں نے یہ حق واپس لے لیا کیونکہ انہیں بے پردہ ہو کر کلاس تک جانا پڑتا تھا۔ شاہی نافرمانی کر کے باپردہ گلیوں میں نکلنے والی عورتوں کو خطرہ رہتا کہ سپاہی ان کے حجاب نوچ کر قینچیوں سے کاٹ ڈالیں گے۔ چادر لینے والی عورتوں کو عوامی ٹرانسپورٹ استعمال کرنے سے روک دیا گیا اور بہت سے بڑے سٹورز میں بھی انہیں داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ بہت سی عورتوں نے اس قسم کی تذلیل کا سامنا کرنے کی بجائے گھروں میں ہی بند رہنا بہتر خیال کیا۔ مثلاً خمینی کی بیوی خدیجہ کبھی اپنے گھر سے باہر ہی نہیں نکلی تھی۔ اس قسم کی گوشہ نشینی ایک ایسے دور میں بالخصوص تکلیف دہ تھی جب زیادہ تر گھروں میں باتھ روم نہیں تھے اور عورتیں مقامی حماموں میں (خواتین کے اوقات میں) نہانے اور گپ شپ کرنے کے لیے اکٹھی ہوا کرتی تھیں۔ 1935ء سے 1941ء تک یہ پابندی جبری تھی۔ لیکن 1941ء کے بعد اس میں نرمی ہونے لگی، لیکن بے پردگی کو بدستور سراہا گیا اور پردے پر مصر خواتین کو پسماندہ قرار دیا گیا۔

1970ء کی دہائی کے اواخر میں انقلابی دباؤ بڑھنے پر چادر اوڑھنا شاہ اور اس کے مغربی حمایتیوں کے خلاف احتجاج کی علامت بن گیا۔ کچھ مذہبی رہنماؤں نے قابل پیش گوئی وجوہ کی بنا پر اس کی حمایت کی۔ ایرانی مذہبی رہنما ابراہیم امینی نے کہا کہ اگر سب عورتیں بانقاب ہو جائیں تو گھروں میں بیٹھی بیویوں کو یہ خوف نہیں رہے گا کہ باہر راستے میں اس کا شوہر کسی مکار عورت کی طرف مائل ہو جائے گا۔ برطانیہ میں مسلمان دانشور شبیر اختر نے ایک متبادل استدلال پیش کیا۔ اس نے لکھا کہ نقاب کا مقصد "ایک ایسی حقیقی شہوانی ثقافت پیدا کرنا ہے جس میں آپ کو برہنہ تصاویر سے مصنوعی انگیخت حاصل کرنے کی ضرورت نہ رہے۔" ہر دو صورتوں میں مردوں کی شہوانی ضروریات پوری کرنے کے لیے عورتوں سے اپنی آسانی اور آزادی کی قربانی دینے کی توقع کی جاتی ہے، یعنی وہ مردانہ جنسی جذبے کو دبائیں یا پھر برانگیختہ کریں۔

میری ایرانی مترجم حمید Marefata جیسی کسی بھی جوان دانشور کی نظر میں ان میں سے کوئی بھی دلیل زیادہ باوزن نہیں۔ اس کے خیال میں چادر اوڑھنا سب سے پہلے ایک سیاسی فعل تھا۔ متوسط طبقے کے گھرانے میں پرورش پانے والی حمیدہ نے حجاب اختیار کرنے کا اس وقت سوچا جب اس

نے علی شریعتی نامی مسحور کن نوجوان دانشور کے خفیہ لیکچرز سننا شروع کیے۔ ایران میں جنم لینے اور سار بون میں تعلیم حاصل کرنے والے علی شریعتی نے مارکسزم کے بارے میں اپنی معلومات کو شیعی اسلام کے ساتھ ملا دیا اور ایک انقلابی مسلک وضع کیا جس کا مقصد عوام کو تحریک دلانا اور حکمرانوں کو چیلنج کرنا تھا۔ اس نے کہا کہ مغربی لباس سامراجیت کی ہی ایک صورت تھا جو عورت کے حسن کو سرمایہ داری کی ایک قابل خرید و فروخت جنس میں بدل دیتا ہے، اور ساتھ ہی ساتھ اس نے تیسری دنیا کی عورتوں کو تیزی سے بدلتے ہوئے فیشنز کی محتاج گاہک بنا دیا ہے۔ اس نے زور دیا کہ مسلمان عورتوں کو اسلامی لباس اپنا کر اپنی آزادی منوانی چاہیے۔ حمیدہ جیسی نوجوان عورتوں کے لیے چادر وہی مقصد پورا کرتی تھی جو عسکریت پسند امریکی نسوانیت پسند آندریا ڈورکن کا ڈینم لباس۔ اس نے انقلاب ایران (1978ء) سے ایک سال قبل چادر لینا شروع کی، اور امریکی سفارت خانے میں اسے ایک علم کی طرح پہن کر جاتی تھی۔

لیکن انقلاب کے دس سال بعد جب میں اس سے ملی تو انقلابی جوش ماند پڑنے لگا تھا۔ جب بھی ہم مردوں کی نظر سے اوجھل ہوتیں تو وہ بڑا سا کالا کپڑا ایک طرف ہٹا کر سکھ کا سانس لیتی۔ ایک روز اس نے رازداری سے کہا: ''کاش میں نے کبھی یہ پہنا ہی نہ ہوتا۔ شروع شروع میں انقلابی نظریات کو ثابت کرنے کے لیے یہ ضروری تھی۔ لیکن اب ہمیں اس کا ثبوت دینے کی ضرورت نہیں۔ آپ سکارف اور کوٹ کے بغیر بھی انقلابی ہو سکتے ہیں۔''

جب میں حمیدہ سے ملنے اس کے گھر گئی تو وہ پلیٹوں والی سکرٹس، ریشمی بلاؤز اور سونے کے زیور میں بہت بھلی دکھائی دی۔ لیکن باہر جاتے وقت اس نے انقلابی اسلام والا پورا یونیفارم پہن لیا۔ میرے لیے چادر پوش حمیدہ کو قبول کرنا زیادہ آسان تھا۔ اس بے چہرہ تاریکی کی کہی ہوئی باتیں مجھے کم دھچکا پہنچاتی تھیں۔ اس کے خاندان کے باذوق سجے سجائے مشترکہ کمرے میں جب ہم فارسی شاعری جیسے غیر جانب دار موضوعات پر گپ شپ کرتیں یا کوئی قابل قدر رشتہ ملنے کی مشکلات پر بات چیت کرتیں تو وہ بھی میری عمر کی کسی بھی خوب صورت عورت جیسی لگتی جس کا میرے ساتھ کافی کچھ مشترک تھا۔ تب وہ اپنے کنگھا کیے سنواری بالوں میں ہاتھ پھیرتی اور تباہ کن حد تک انتہا پسندانہ رائے دیتی۔ وہ اپنا چائے کا کپ اٹھاتی اور نازک انداز میں ایک چسکی بھرتے ہوئے کہتی، ''اسرائیل کا صفایا کر دینا ضروری ہے۔ میں اس دن کی منتظر ہوں جب اس کی تباہی کی

جنگ میں حصہ لوں گی۔"

سنی مسلمانوں نے اہل ایمان اور خدا کے درمیان ایک براہ راست تعلق مان لیا تھا، جبکہ شیعہ ایک اعلیٰ تربیت یافتہ مذہبی رہنما کی توسلیت پر یقین رکھتے ہیں۔ عموماً ہر ایک شیعہ کسی نہ کسی جلیل القدر مذہبی مفکر کو منتخب کرتا اور اس کے دیے ہوئے فتویٰ پر عمل کرتا ہے۔ حمیدہ نے خمینی کو منتخب کیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اس نے اپنی زندگی کے ہر پہلو کو خمینی کی اٹھارہ جلدوں پر مشتمل مذہبی تفاسیر کی ہدایت کے مطابق بنالیا تھا۔ حمیدہ نے وضاحت کی: "کچھ آیۃ اللہ کہتے ہیں کہ عورتوں کو دستانے پہننا چاہئیں، لیکن امام خمینی کا کہنا ہے کہ ہاتھ کا نچلا حصہ ننگا چھوڑا جا سکتا ہے۔" دیگر آیۃ اللہ کا خیال تھا کہ عورت کی آواز باعث شہوت ہے اور انہوں نے عورتوں کو ہدایت کی کہ اگر مردوں کی موجودگی میں بات کرنی ہو تو پہلے اپنے منہ میں ایک کنکر ڈال لیں تا کہ آواز اپنے نسوانی تاثر سے محروم ہو جائے۔ خمینی نے عورتوں اور مردوں کے ملے جلے گروپس کے ساتھ آنحضرت کی ملاقاتوں کا حوالہ دیتے ہوئے نسوانی آواز میں کوئی قباحت نہ دیکھی۔

میں نے حمیدہ سے پوچھا کہ کیا خمینی کبھی اپنے مذہبی احکامات میں غلط ہو سکتا تھا۔ اس نے کہا، "یقیناً۔ ہم کسی بھی انسان کو خطا سے پاک نہیں سمجھتے۔ لیکن اگر میں ان کے کسی ایسے فتوے پر عمل کروں جو غلط ہو — مثلاً ان کے حکم پر کسی معصوم شخص کو مار ڈالوں — تو مقتول شخص جنت میں جائے اور قتل کا گناہ میری بجائے اس شخص کے سر جائے گا جس نے فتویٰ دیا ہوگا۔"

خمینی کی وفات کے بعد حمیدہ نے محسوس کیا کہ وہ اپنی چادر نہیں اتار سکتی تھی۔ اس کی موت کے فوراً بعد چادر اتار دینا ارادے کی ناپختگی پر دلیل تھا۔ اخبارات میں مضامین عورتوں کو متواتر یاد دہانی کرواتے رہتے تھے کہ چادر "مغربی اقدار کے خلاف ایک ڈھال" ہے۔ اور اہل اقتدار کو اس بات پر یقین تھا۔ ایک دوست سر اور جسم کے خدوخال کو اسلامی لحاظ سے کامل کوٹ اور سکارف میں ڈھانپ کر ایک سرکاری ملازمت کے لیے انٹرویو دینے گئی۔ انٹرویو لینے والا شخص غرایا، "تم ننگی ہو" اور ملازمت دینے سے انکار کر دیا۔

شروع میں میں نے سوچا کہ حجاب عورتوں کو صنعت حسن کی استبدادیت سے تو نجات دلا ہی دے گا۔ لیکن ایرانی خواتین کی کانفرنس میں، جو شب و روز متقل ہال میں ہوتی تھی، مجھے جلد ہی اپنی

غلطی کا احساس ہو گیا۔

میں نے حمیدہ سے کہا تھا کہ لبنانی حزب اللہ خواتین کے ساتھ میری ملاقات کا بندوبست کر دے۔ گروپ کے گڑھ وادیٔ بقا اور بیروت کی جنوبی بستیاں تھیں ایسوسی ایٹڈ پریس کے بیورو چیف ٹیری اینڈرسن کے اغوا کے بعد سے مغربی صحافیوں کے لیے ایک ممنوعہ علاقہ۔ میں اینڈرسن کے بارے میں پوچھنا چاہتی تھی جو بیروت کی ایک زمین دوز عمارت کے تاریک کمرے میں بندھا ہوا زندگی گزار رہا تھا۔ اسے یرغمال بنانے والے آدمیوں سے ممکنہ طور پر ازدواجی بندھن میں بندھی ہوئی عورتوں کے ساتھ اس کے پریشان حال اہل خانہ کے لیے کچھ انفارمیشن حاصل کرنے کا بہترین موقع تھا۔

انجام کار مجھے اس کی حالت زار کی کوئی خبر نہ مل سکی، لیکن عورتوں کے ساتھ ملاقات نے اور بہت کچھ سمجھا دیا۔ انہوں نے مجھے اس شام اپنے کمرے میں شام کی چائے پر مدعو کیا، بشرطیکہ میں اپنے کسی بھی مضمون میں ان کا نام نہ لکھنے کا وعدہ کروں۔ دروازہ کھلا تو میں سمجھی کہ کسی غلط کمرے میں آ گئی ہوں۔ میرے سامنے کھڑی عورت کے بھورے بال کمر تک لمبے تھے۔ اس نے گہرے گلے والا ایک نائٹ گاؤن پہن رکھا تھا۔ اس کے پیچھے بستر پر ایک اور خاتون یوں دراز تھی جیسے گلے مل رہی ہو اور اس کا سرخ سائٹن کا نائٹ گاؤن ایک طرف کو ہٹا ہوا تھا۔ مہین پارچوں میں سے صاف دیکھا جا سکتا تھا کہ ان کے جسم باربی گڑیوں کی طرح بالوں سے بالکل عاری تھے۔ انہوں نے وضاحت کی کہ شادی شدہ خواتین کا ہر بیس دن بعد اپنے جسم کے تمام بال صاف کرنا سنت ہے۔ بال صاف کرنے کا روایتی طریقہ چینی اور لیموں کا آمیزہ تیار کرنا تھا۔ انہوں نے کہا کہ مسلمان مردوں کے لیے بھی ہر چالیس دن بعد اپنے جسم کے بال صاف کرنا ضروری ہے۔

یہ جاننے میں چند منٹ لگ گئے کہ سامنے کھڑی بھورے بالوں والی عورت وہی تھی جس نے خمینی کے گھر میں بہ آواز بلند مرثیہ خوانی کی تھی۔ جب میں نے اس کی شکل وصورت پر خوشگوار حیرت کا اظہار کیا تو وہ ہنس دی۔ ''اسلام اپنے شوہروں کے لیے بننے سنورنے کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔'' مجھے فوراً سمجھ آ گئی کہ خمینی کی بیوہ خدیجہ نے اپنے ہاتھوں پر مہندی کیوں لگا رکھی تھی اور شوہر کی وفات کے بعد خضاب لگانا بند کرنے کے باعث اس کے سر میں سفید بال کیوں ظاہر ہونا شروع ہو گئے تھے۔

تاہم، اس کی بیٹی زہرا سرخ گالوں والی یا تائی والی قسم کی خاتون نہیں تھی۔ اس نے اپنی چادر تلے ٹویڈ کی سکرٹس پہن رکھی تھیں تہران یونیورسٹی میں فلسفہ پڑھانے والی روایتی قسم کی پروفیسر کے لیے ایک روایتی قسم کا لباس۔

تین سال کے دوران کئی ملاقاتوں کے بعد ہی کہیں جا کر وہ صرف چادر میں میرے سامنے آنے پر آمادہ ہوئی۔ عورتوں سے بھرے ہوئے کمرے میں بھی وہ ہمیشہ چادر کو مٹھی میں کس کرناک تک کیے رکھتی۔ اس انداز کے باعث وومینز سوسائٹی کی نگارشات میں تصاویر اکثر گڑبڑ ہو گئیں۔ سوسائٹی اپنی ممتاز خواتین کی حوصلہ افزائی کرنا چاہتی تھی اراکین پارلیمنٹ، آرٹسٹ اور مصنفہ خواتین۔ لیکن تصویر میں وہ سب بالکل ایک جیسی لگتی تھیں۔

ایک مرتبہ تہران کانفرنس کے دوران زہرا نے لمحہ کے لیے اپنی چادر چھوڑی اور اس کا تھوڑا سا ہونٹ اور ٹھوڑی دکھائی دی۔ کسی کے فلیش کا بلب دمک اٹھا۔ سراسیمگی پھیل گئی۔ کیا تصویر اتارنے والی عورت اپنی فلم حوالے کرے گی؟ تاکہ وومینز سوسائٹی کی خواتین اسے ڈویلپ کریں، غیر موزوں تصویر کاٹیں اور باقی کا رول مسز مصطفوی کی مناسب تصویر کے ساتھ واپس کر دیا۔ کمرے میں سب کی نگاہیں میری جانب اٹھ گئیں۔ صحافی ہونے کے ناتے میں سب سے زیادہ مشکوک تھی۔ اپنی چادر کھول کر دکھاتے ہوئے میں نے کہا کہ میرے پاس تو کیمرا ہی نہیں تھا۔ بھیگی بلی بی خاتمہ مانے جرم کا اعتراف کیا۔ اس نے گود میں پڑے ہانگ کانگ کے ''مسلم ہیرالڈ'' کی جانب دیکھتے ہوئے فلم حوالے کر دی۔

زہرا مصطفوی بھاری بھر کم خاتون تھی، سنجیدہ مزاج اور دوہری ٹھوڑی والی؛ وہ اپنے باپ جیسا سخت انداز اور شدید تاثر رکھتی تھی۔ نصف شیشوں والا چشمہ اس کی ناک پر دھرا رہتا اور ہیرا جڑے سونے کی انگوٹھی اس کے ہاتھ میں دمکتی رہتی۔ وومینز سوسائٹی کی سربراہ کی حیثیت میں خمینی کی تین زندہ بیٹیوں میں سب سے زیادہ سرگرم سیاسی کارکن تھی۔ بیوہ Sedigheh اپنے سات بچوں کے ساتھ چپ چاپ زندگی گزار رہی تھی۔ الٰہیات کی محقق فریدہ نے قم میں قالینوں کے ایک تاجر سے شادی کی تھی۔

زہرا کا فلسفہ کے پروفیسر کے عہدے پر فائز ہونا ایک ایسی عورت کے لیے بہت اہم کارنامہ تھا جو کبھی سکول نہیں گئی تھی۔ قبل از انقلاب عہد کے بہت سے مذہبی ایرانیوں کی طرح خمینی نے

اپنے کسی بھی بچے کو سکول میں داخل کروانے سے انکار کر دیا، کیونکہ اس کے خیال میں ریاست کے زیرِ انتظام تعلیمی نظام بگاڑ کا شکار تھا۔ زہرا نے گھر پر ہی ممتاز علماء سے تعلیم حاصل کی۔ اس کی درخواست پر باپ ہر روز خود بھی نصف گھنٹے کے لیے پڑھانے آتا۔ زہرا نے خود کو مابعد الطبیعیات اور مغربی فلسفیوں (مثلاً برٹرینڈ رسل اور ایمانوئیل کانٹ) کی جانب مائل پایا۔

اس نے کہا کہ خمینی کا رویہ زیادہ تر شفیقانہ ہوتا، لیکن وہ اسلامی معاملات میں کوئی رعایت نہ کرتے۔ ''اگر میں کسی گھر میں کھیلنا چاہتی اور انہیں معلوم ہوتا کہ وہاں کوئی لڑکا بھی موجود ہے تو وہ وہاں جانے سے منع کر دیتے۔ آپ کو یہ کہنے کی جرأت نہیں ہو سکتی تھی کہ 'او ہو بابا، مجھے جانے دیں نا۔' ان کی کہی ہوئی ہر بات کی بنیاد اسلام پر ہوتی، نہ کہ ذاتی خیالات پر۔''

جب زہرا نے اپنی تعلیم مکمل کر لی تو خمینی ممکنہ شوہروں کی جانچ پڑتال کرنے لگا۔ زہرا نے باپ کے تجویز کردہ تین رشتے مسترد کرنے کے بعد چوتھے پر ہاں کی۔ ''والد میرے پاس آ کر کہتے، 'میں نے ایک لڑکا دیکھا ہے جو میرے خیال میں برا نہیں، اس میں فلاں فلاں خوبیاں ہیں، لیکن جیسے تمہاری مرضی۔' '' وہ سب رشتے خاندان سے ہی آئے تھے اور زہرا نے لڑکوں کو دیکھ رکھا تھا۔ ''وہ میرے لیے اجنبی نہیں تھے۔ مجھے ان کے چہرے مہرے کا علم تھا؛ میں ایسے رشتے کا انتظار کرتی رہی جو میرے خیال میں موزوں تھا۔'' اس نے ایک معلم کو چنا جو اب ایک تعلیمی تھنک ٹینک کا سربراہ ہے۔ جب شاہ ایران نے خمینی کو جلاوطن کیا تو شادی شدہ زہرا وطن میں ہی رہی۔ لیکن وہ ہر سال باپ سے ملنے جاتی اور اپنے کپڑوں میں انقلابی ہدایات اور ٹیپس چھپا کر لے آتی۔ تہران پہنچ کر وہ رات کے وقت انہیں خفیہ طور پر تقسیم کرتی۔ ''میں اپنے بیٹے کو ساتھ لیتی اور جب وہ درختوں کے درمیان کھیل رہا ہوتا تو میں لوگوں کے گھروں میں کاپیاں پھینکتی جاتی۔''

زہرا کی بیٹی اسلامی انقلاب کے بعد جوان ہوئی۔ وہ گھر کے اندر زہرا جیسے پردے کی پابندیوں پر عمل نہیں کرتی تھی۔ جب انقلابیوں نے کنٹرول حاصل کیا اور سکولوں، یونیورسٹیوں، بینکوں اور کاروباری اداروں کی تادیب کی تو خمینی نے (باپردہ) خواتین کے سیاست و معیشت میں حصہ لینے کو قبیح نہ سمجھا۔ چنانچہ اس کی نواسی ا سکول میں داخل ہوئی، ایک کارڈیک سرجن سے شادی کی اور جب اس کا شوہر اپنی تربیت مکمل کر رہا تھا تو لندن میں مقیم رہی۔

93ء کے موسمِ سرما میں جب خدیجہ کو خصوصی طبی نگہداشت کی ضرورت پیش آئی تو زہرا نے

اسے لندن بلوانے میں کوئی ہچکچاہٹ نہ دکھائی۔ تب تک میں قاہرہ سے لندن آ گئی تھی اور ایرانی سفارت خانے میں اس کے ساتھ ایک لنچ کی دعوت ملنے پر حیران رہ گئی۔ یہ اس کے باپ کی جانب سے سلمان رشدی کی موت کا فتویٰ جاری کرنے کی چوتھی سالگرہ تھی۔ خارجہ سیکرٹری کو برطانیہ کی شدید خفگی کا سامنا کرنا پڑا۔ ایرانیوں نے غصے میں آ کر ایران جانے کے خواہش مند برطانوی شہریوں کے لیے ویزا فیس یکدم بڑھا کر 504 پونڈ کر دی۔

لیکن زہرا نے اپنی گداز کلائی کو ایک ہی مرتبہ جھٹک کر یہ سب کچھ مسترد کر دیا۔ اس کے ساتھ گفتگو کرنا ہمیشہ ہی بہت مشکل کام ثابت ہوا ہے: ہر گفتگو کا آغاز بسم اللہ الرحمن الرحیم کے الفاظ سے ہوتا۔ ساتھ ہی ساتھ ایک مبلغ کے گھر میں پرورش پانے اور یونیورسٹی لیکچرر کے طور پر کام کرنے کے باعث اس میں خود کلامی کا رجحان پیدا ہو گیا تھا۔ ایک مرتبہ وہ بولنا شروع ہوتی تو درمیان میں کوئی سوال کرنا مشکل ہو جاتا، گفتگو کرنا تو بہت دور کی بات تھی۔

لیکن لندن میں لنچ پر وہ کافی سہل انداز دکھائی دی۔ مزید مزید چاول، چکن، کباب لینے کا کہتے اور اپنی پلیٹ میں بھی ڈھیر لگاتے ہوئے اس نے لندن کی رونقوں کے متعلق خوشی سے بھرپور گفتگو کی: درخت، چوڑی سڑکیں، نرم خو لوگ۔ مجھے معلوم تھا کہ خمینی نے فرانس میں جلاوطنی کے دوران ایئرپورٹ سے گھر جاتے وقت اپنی نظریں موڑ لی تھیں تاکہ مغربی ماحول کا منظر انہیں آلودہ نہ کر دے۔ اس نے پیرس سے باہر اپنے مکان کی پیڈسٹل ٹوائلٹ ہٹوا کر مشرقی انداز کا فلش لگوایا تھا۔ جب میں نے پوچھا کہ کیا لندن کا غیر اسلامی ماحول اس کے لیے مسئلہ تھا، تو زہرا نے جواب دیا: ''مجھے یہاں کوئی مسئلہ نہیں۔'' ایک چھوٹا سا ناخوشگوار احساس اس وقت ہوا تھا جب ایک جلاوطن ایرانی نے مارکیٹ میں اسے پہچان لیا اور اس کے باپ کے بارے میں نازیبا الفاظ کہے۔ ''یقیناً، میں اپنے باپ کے خلاف کوئی غیر مناسب بات سننا پسند نہیں کرتی، لیکن وہ ذاتی طور پر اپنے خلاف کہی گئی کسی بھی بات کو درگزر کرنے پر تیار رہتے تھے۔ بس وہ اسلام پر حملہ معاف نہیں کر سکتے تھے!''

زہرا اپنی چادر کی وجہ سے لندن کی گلیوں بازاروں میں فوراً پہچانی جاتی۔ اسی لیے بہت سی راسخ ایرانی خواتین مغرب میں چادریں نہیں لیتی تھیں۔ حجاب کا ایک مقصد عورت کو نظروں میں آنے سے بچانا ہے۔ لندن میں سکارف اور کوٹ کی نسبت چادر کی جانب کہیں زیادہ نظریں اٹھتی

ہیں۔ لیکن زہرا کے لیے چادر ایک طرح کی دوسری کھال تھی جسے اتارا نہیں جا سکتا تھا۔

مجھے سفارت خانے میں مدعو کرنے کی ایک وجہ مجھے وہاں کام کرنے والی خواتین سفیروں سے ملوانا تھا۔ ایک بین الاقوامی قانون سے منسلک تھی، دوسری نے برطانیہ میں عورتوں کی حیثیت کا مطالعہ کیا تھا۔ عورتوں کو بیرون ملک تعینات کروانے والی وومینز سوسائٹی کے لیے ان کی موجودگی ایک طرح کا اعزاز تھا۔

یہ خواتین جدید، متوسط - بالائی طبقے کی اقلیت سے تعلق رکھنے والا ایک بالکل مختلف گروپ تھیں جس نے شاہ کی آزاد رو پالیسیوں کے تحت ترقی پائی۔ انقلاب نے بہت سی پالیسیاں منسوخ کر دی تھیں۔ ایرانی کابینہ کی پہلی عورت اسفند فارو خورو پارسا کو "دنیا میں بدعنوانی، جسم فروشی کے فروغ اور خدا سے جنگ" کے الزامات کے تحت بوری میں بند کر کے مشین گن سے اڑا دیا گیا تھا۔ اس نے محض سکول کی بچیوں کو نقاب نہ کرنے کی ہدایت کی تھی، اور عورتوں کے جدید تصور پیش کرنے کے لیے نصابی کتب پر نظر ثانی کا حکم دیا تھا۔ سینکڑوں خواتین کو انقلابی اقدامات سے روگردانی کرنے کی پاداش میں قید کر دیا گیا تھا، ہزاروں نے ملک سے راہ فرار اختیار کی۔

لیکن غریب، قدامت پسند اور دیہی خاندانوں سے تعلق رکھنے والی دیگر عورتیں 'اندرون' کی بند فصیلوں کے پیچھے سے پہلی مرتبہ باہر آئیں۔ خمینی نے انقلاب کے لیے مظاہرہ کرنے کی خاطر ان عورتوں کو گلیوں میں نکلنے پر ابھارا جہاں ان کا پہلے کبھی استقبال نہیں ہوا تھا۔ اس نے یہ تک کہہ دیا کہ انہیں اس مقصد کے لیے کسی ولی کو بھی ساتھ لینے کی ضرورت نہیں۔ اس معاملے میں 'اپنے' خیالات کو اس نے اصل میں اسلام کے بنیادی قوانین قرار دیا۔ اگر سنت محمدیؐ کے مطابق عورتیں نو برس کی عمر میں شادی کر سکتی تھیں تو یقیناً وہ نو برس کی عمر میں شادی کر سکتی ہیں۔ اگر سنت کے مطابق وہ قاضی نہیں بن سکتیں تو یقیناً انہیں اس عہدے پر تعینات نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن اگر وہ دوسرے کام کر سکتی تھیں　کاروبار چلانا، بیماروں کی دیکھ بھال کرنا، یا حتیٰ کہ جنگ کرنے جانا　تو یقیناً ایرانی عورتوں کو بھی ان کی اجازت ہونی چاہیے۔ چونکہ یہ باتیں امام نے کہی تھیں، اس لیے قدامت پسند باپوں، شوہروں اور بھائیوں کو سننا پڑیں۔ اپنی زندگیاں گوشہ نشینی میں گزارنے والی عورتوں کی نظر میں سر پر سکارف رکھنا نئی آزادیوں کی ایک بہت چھوٹی قیمت تھی۔

پھر بھی یہ بات مجھے پریشان کرتی ہے کہ عوامی دباؤ اور ریاستی قوانین کے ذریعہ عورتوں کو

دوبارہ حجاب میں لایا جا سکتا ہے، جبکہ کوئی بھی شخص مردوں کے لیے اسلامی لباس پر توجہ نہیں دیتا۔ قرآن نے عورتوں کے ساتھ ساتھ مردوں کو بھی اعتدال اختیار کرنے کو کہا۔ اس سلسلے میں سنت واضح ہے۔ عورتوں کے لیے ہاتھوں کے سوا سارا جسم ڈھانپنا ضروری ہے، جبکہ مردوں کے لیے ناف سے گھٹنے تک کا حصہ ڈھانپنا ضروری قرار دیا گیا۔ نیز ستر اتنا دبیز اور ڈھیلا ہونا چاہیے کہ مردانہ تولیدی اعضا چھپ جائیں۔

لیکن ساری اسلامی دنیا میں مرد اس ضابطے کا کھلِ عام مذاق اڑاتے ہیں۔ نائٹ جینز خلیج کے نوجوانوں کا پسندیدہ لباس ہیں۔ فٹ بال کے کھلاڑی　قومی ہیرو　گھٹنوں سے اوپر شارٹس پہن کر میچ کھیلتے ہیں۔ ٹیلی ویژن پر مقبول عام ریسلنگ　میچوں میں جوک سٹریپس والے پہلوانوں کے جسم پسینے سے چمکتے ہیں۔ بحیرۂ کاسپئن میں ایرانی عورتوں کو چادریں اوڑھ کر تیرنا پڑتا تھا، مگر کوئی بھی مردوں سے تقاضا نہ کرتا کہ وہ اپنی ناف تک کا حصہ ڈھانپیں۔

یہ منافقت بالخصوص ایرانی ساکر کے میچوں میں واضح تھی جہاں چادر پوش خواتین اپنے بیٹوں کو ساتھ لے کر کھیل دیکھنے نہیں جا سکتی تھیں کیونکہ کھلاڑی اسلامی لباس میں نہیں ہوتے تھے۔ دریں اثنا، انہی میچوں کو رات کے وقت ریاستی ٹیلی ویژن پر دکھایا جاتا جو اسلامی جمہوریہ کی آواز اور نظر تھا۔ جب بھی میں نے ایرانیوں سے اس بارے میں پوچھا تو جواب میں انہوں نے بس ہنس دیا یا محض کندھے اچکا دیے۔ ایک دوست نے کہا: ''اگر شوہروں نے فٹ بال میچ دیکھنا ہو تو خواتین کمرے سے چلی جاتی ہیں۔ حتیٰ کہ اس حکومت کو بھی حدود کا علم ہے۔ آپ کسی ملک سے کئی قربانیاں مانگ سکتے ہیں، لیکن مردوں سے فٹ بال دیکھنے کی خوشی چھیننا بہت بڑی بات ہوگی۔''

درحقیقت اس کا جواب بہت گہرائی تک جڑیں رکھتا ہے۔ مسلمان معاشروں میں مردوں کو عورتوں کے لیے ویسا خطرہ نہیں سمجھا جاتا جیسا عورتوں کو مردوں کے لیے۔ حجاب کے متعلق سچائی جاننا اسے پہننے جیسا ہے: ایک ایک تہہ کو باری باری کھولتے جانا۔ چادر، عبایہ، جلبیہ وغیرہ کی تہوں میں سب سے نیچے جسم ہوتا ہے۔ اور عورتوں کو کمرشل یا جنسی استحصال سے نجات دلانے میں حجاب کے کردار کے متعلق تمام گفتگو کی تہہ میں جسم موجود ہے: خطرناک نسوانی جسم جو مسلم معاشرے میں مردانہ تفاخر کا بھاری بوجھ اٹھائے رہا۔

دوسرا باب

بکارت

آپریٹنگ تھیٹر ایک افریقی پہاڑی کے پہلو میں کھودی ہوئی غار نما عمارت تھی جس پر سفیدی کی گئی تھی۔ اس کی تیز سفید روشنی میں مریضہ کا جسم پتھر کی سفید سل جیسا لگتا تھا۔ سرجن نے پیٹ میں کلائیوں تک ہاتھ ڈال کر خاتون کی چمکتی ہوئی، پھسلتی بچہ دانی کو یوں پکڑا جیسے وہ کوئی دشمن ہو۔

اس ایتھوپیائی علاقے میں وہ چالیس سالہ مریض ایک بوڑھی عورت تھی۔ وہ ملک کی قدیم روایات کے ذریعہ عورتوں کے خلاف تشدد، بھوک اور روزمرہ استحصال سے بھی زندہ بچ گئی تھی۔ آٹھ برس کی عمر میں اسے جکڑ کر ایک گندے چاقو سے اس کا کلائٹورس (clitoris) کاٹا اور زخم کو کیکر کے ایک انچ لمبے کانٹوں سے بند کر دیا گیا۔ سہاگ رات کو شوہر نے اپنے خنجر سے اس کانٹوں بھرے زخم کو کاٹ کر راہ بنائی۔ یہ تکلیف محض مستقبل میں بار بار پیش آنے والی تکالیف کا پیش خیمہ تھی جو اس نے چار بچوں کو جنم دیتے وقت سہی۔ یہاں ہر پانچ پیدائشوں میں سے ایک ماں کی زندگی کا خاتمہ کر دیتی تھی۔

کم از کم یہ خطرہ تو جلد ہی ٹل گیا۔ عورت کی مردہ بچہ دانی کے گرد ستانے والی انگلیاں لپیٹ کر سرجن نے غیر متوقع جھٹکے سے اسے آخری نسوں سے بھی آزاد کر لیا۔ اس نے اپنا پیر آپریٹنگ ٹیبل پہ ٹکا کر عضو کو زور سے کھینچا۔ پتھر کی دیواروں والے چھوٹے سے کمرے میں پھیلی ہوئی بو اتھر،

ادویات اور تازہ کاٹے گئے گوشت کی خوشبو کا ملغوبہ تھی۔ ڈاکٹر بے ہیئت زخم کے منہ کو سینے کے دوران گاہے بگاہے خون بھری پٹیاں نچوڑتی رہی۔ اس نے وضاحت کی: ''ہمارے پاس پٹی کم پڑ گئی ہے۔''

ایبریہت گیبریکیدان (Abrehet Gebrekidan) مریضوں کے سوا تقریباً ہر قسم کی چیزیں کم پڑنے کی عادی تھی۔ 1977ء میں اس نے نیویارک کے سیراکیوس میڈیکل سنٹر میں اپنی نوکری چھوڑی اور ایک بے ہنگم علیحدگی پسند تحریک میں شامل ہوگئی جو افریقہ کی طویل ترین جنگ لڑ رہی تھی۔ زچگی کی ماہر اور گائناکالوجسٹ ہونے کے ناتے وہ جانتی تھی کہ کوہستانی کیمپ گاہوں میں اس کی مہارتوں کی ضرورت ہوگی جہاں سے اس کے ایریٹری اہل وطن نے 1962-91ء کے دوران مرکزی حکومت کے خلاف لڑائی لڑی۔

1989ء میں جب ڈاکٹر ایبریہت سے میری ملاقات ہوئی تو وہ ایک ہسپتال میں کام کر رہی تھی۔ اس ہسپتال کے سرکنڈوں سے بنے ہوئے ''وارڈز'' ایک ڈھلانی دیوار والی کوہستانی وادی میں کوئی تین میل تک پھیلے ہوئے تھے۔ اس کے زیادہ تر کام کا تعلق جنگ کے ساتھ نہیں تھا۔ اس کی بجائے وہ عورتوں کو تولیدی اعضا کی تقطیع کے بدترین نتائج سے بچانے میں مشغول تھی۔ ایریٹریا میں لڑکیوں کا کلائٹورس کاٹنے کے علاوہ ایک اور خوفناک آپریشن بھی کیا جاتا تھا. تولیدی عضو کی اندرونی پرتوں (labia) کو کاٹنا اور زخم کو اس طرح سی دینا کہ پیشاب اور ماہواری کے لیے بس ایک چھوٹا سا سوراخ باقی رہ جائے۔ اگر غذائی قلت کی شکار لڑکی اس آپریشن کی وجہ سے ہی مر نہ جائے تو انفکشن یا انیمیا اس کا کام تمام کر دیتی۔ دیگر کیسز میں زخم کے نشوز میں پیشاب یا ماہواری کا خون پھنس جانے کے باعث پیڑو میں انفکشن ہو جاتی۔ اس آپریشن کی شکار عورتوں کو بچہ جننے میں بھی خوفناک تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا۔ کبھی کبھی بچے کا پھنسا ہوا سر مہلک جریان خون یا مثانے کے پھٹنے کی وجہ بن جاتا۔

قدیم طرز کے آلات کے ساتھ ہر ایک مرحلہ ضرورت سے زیادہ وقت لیتا۔ بچہ دانی نکالنے کا کام سیراکیوس میڈیکل سنٹر میں تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کا ہے، لیکن یہاں اس میں ساری رات لگ گئی۔ پہلے کٹ سے لے کر آخری ٹانکے تک ڈاکٹر ایبریہت کو زخم سینے میں کوئی پانچ گھنٹے لگے۔ باہر تیرہ سال کی ایک اور مریضہ بے تابی سے منتظر تھی تاکہ اپنی اندام نہانی کو بحال کروا سکے۔ یہ مسلمان خانہ

بدوش لڑکی دس سال کی عمر میں بیاہی گئی۔ اس کا نابالغ جسم شوہر کے ساتھ ظالمانہ ہم بستری کا متحمل نہیں ہو سکا تھا اور مقعد و اندام نہانی کو الگ کرنے والا ٹشو پھٹ گیا تھا۔ لڑکی اپنے شوہر کے چنگل سے نکل کر اریٹریائی گوریلوں کے پاس آ گئی تھی۔ انہوں نے اسے پہلی مرتبہ سکول میں داخل کروایا اور ڈاکٹر ابرہیت کے پاس بھیجا۔

ڈاکٹر کے سبز سرجیکل ماسک سے اوپر پسینے سے بھری بھنوؤں پر ایک بے ڈھنگی سی صلیب ٹیٹو کی ہوئی تھی۔ تقریباً انگلینڈ کے سائز کا خطہ اریٹریا ایتھوپیا کے ساحل کے ساتھ ساتھ واقع تھا۔ اس کی 35 لاکھ آبادی میں مسلمانوں اور عیسائیوں کی شرح تقریباً برابر تھی۔ عیسائی بالائی پہاڑی علاقوں میں جبکہ مسلمان زیریں ساحلی علاقوں میں رہتے تھے۔ اریٹریا میں کلائٹورس کاٹنے کا دستور اسلام اور عیسائیت دونوں کی بعثت سے قبل کا ہے۔ دونوں میں سے کسی بھی مذہب نے سینکڑوں سال تک اس دستور پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اریٹریوں کی گوریلا تحریک چند ایک ایسی افریقی تنظیموں میں شامل تھی جو اس دستور کے خاتمے کی کوشش کر رہی تھیں۔ یہ مہم عورتوں کے حقوق منوانے کے ایک وسیع تر ایجنڈے کا حصہ تھی جس میں زمین کی نئے سرے سے تقسیم کرنا بھی شامل تھا تاکہ عورتوں کو ان کا حصہ دیا جائے اور سیاست میں عورتوں کی نمائندگی بھی ہو۔

اریٹریا کی 71 رکنی پالیسی ساز تنظیم کی رکن منتخب ہونے والی چھ عورتوں میں سے ایک آمنہ نور حسین نے کہا، ''ہم ان پر زبردستی نہیں کر سکتے، بلکہ محض انہیں تربیت دیتے ہیں۔'' بالائی پہاڑی علاقوں میں labia کاٹنے کا رجحان کمزور پڑ رہا تھا جہاں غالب عیسائی آبادی رسم کو مذہبی حکم سے زیادہ ایک ثقافتی فریضہ خیال کرتی تھی۔ لیکن زیریں مسلم علاقوں میں یہ معاملہ بدستور نہایت حساس ہے۔ خود بھی ایک مسلمان ہونے کے ناتے آمنہ کو مشکلات کی فہم ہے۔ ''عورتوں کو بتایا گیا ہے کہ قرآن میں ان دساتیر پر عمل کرنے کی ہدایت موجود ہے۔'' وہ انہیں بتا سکتی تھی کہ قرآن میں ایسی کوئی بات نہیں، لیکن باہر سے آئی ہوئی اور ایک عورت ہونے کے باعث اس کی رائے گاؤں کے مکھیا کی بات کے مقابلے میں کوئی وقعت نہیں رکھتی تھی۔

عورتوں کو قرآن پڑھنا سکھانا تولیدی اعضا کی قطع کے خلاف اریٹریوں کی مہم کا اہم ترین جزو تھا۔ است ابراہیم میرے ساتھ ملاقات ہونے سے ایک سال قبل تک ہر سوال کرنے والے شخص کو بتاتا تھا کہ کلائٹورس اور فرج کے اندرونی لب کاٹنا عورت کے حسن اور فلاح کے لیے لازمی

تھا۔ ''میری ماں، میری نانی اور پرنانی سب نے مجھے بتایا کہ اس میں کوئی خرابی نہیں، کہ اس کے بغیر عورت اپنے اوپر قابو نہیں رکھ سکتی، کہ انجام کار وہ جسم فروش بن جائے گی۔'' بیس سالہ خوبصورت است نے بتایا جس کے اپنے جنسی اعضا سات سال کی عمر میں کاٹے گئے تھے۔ ''میں نے تو یہ بھی یقین کرنا شروع کر دیا کہ ایسا کرنے سے دلکشی بھی بڑھ جاتی ہے۔ ہم نے یہ ضرب المثل دہراتے ہوئے پرورش پائی ہے: دروازے کے بغیر گھر خوب صورت نہیں لگتا۔''

فرج کے اندرونی لب کاٹ دیے جانے کے باوجود وہ فاحشہ بننے سے نہ بچ سکی۔ اس کی خوب صورتی کی وجہ سے ایتھوپیائی فوج نے است کو سپاہیوں کی بیرکوں میں بطور نوکرانی اور کبھی کبھی بطور فاحشہ بھی کام کرنے پر مجبور کیا۔ جب اریٹریوں نے شہر فتح کیا تو گوریلوں نے است کو پیشکش کی کہ وہ غذائی وطبی دیکھ بھال، بہبود آبادی اور دایا گیری کا چار ماہ کا کورس کر کے زچگی کی نرس بن سکتی تھی۔ کورس کا کچھ حصہ جنسی اعضا کاٹنے کے خطرات سے متعلق تھا۔ اب است اپنی ہر ایک مریضہ کو یہ معلومات دیتی ہے۔

است کا کام آسان نہیں تھا۔ اسے اپنی مریضاؤں کے ساتھ قدیم دساتیر کے خلاف بات چیت کرنا تھی، مثلاً زچگی کا عمل تیز کرنے کے لیے عورتوں کے جسم پر بھاری پتھر رکھنا، یا ان کے کانوں کے پاس رائفلیں فائر کرنا تاکہ بچہ ''ڈر کر'' کوکھ سے فوراً باہر آ جائے۔ روایت کے تحت تقطیع شدہ لبوں والی عورتوں کی اندام نہانی ہر بچے کی پیدائش کے بعد دوبارہ سی دی جاتی تھی۔ نتیجتاً ان کی صحت بحال ہونے میں دیر لگتی اور انفکشن کا خطرہ بھی بہت زیادہ بڑھ جاتا۔

''مجھے پتا چلا کہ اس سب کا کوئی فائدہ نہیں تھا، اور امید ہے کہ میں دوسروں کو بھی سمجھانے کے قابل ہو جاؤں گی۔ لیکن یہ ایک مشکل کام ہے،'' است نے کہا۔ کبھی کبھی عورتیں خود ٹانکے لگوانے آتی تھیں کیونکہ انہیں اپنے شوہروں کی جانب سے مسترد کیے جانے کا ڈر تھا۔ کچھ دیگر است کے اس دعوے پر یقین کرنے سے قاصر تھیں کہ دستور میں کوئی نقصان دہ بات ہے۔ اگر کوئی عورت اصرار کرتی تو است اس کی اندام نہانی کے اندرونی لب کاٹ دیتی۔ اسے امید ہوتی کہ یہ کام کم از کم صاف اوزاروں سے تو کیا گیا ہے۔

کچھ عیسائی اور روح پرست بھی جنسی عضو کی تقطیع کے دستور پر عمل کرتے ہیں، اس لیے بہت

سے مسلمان اپنے عقیدے کے ساتھ اس کے قریبی طور پر منسلک ہو جانے پر افسوس کرتے ہیں۔ لیکن آج ہر پانچ میں سے ایک مسلمان لڑکی ایسی آبادیوں میں زندگی گزار رہی ہے جہاں اس کے جنسی اعضا کے ساتھ کوئی نہ کوئی مداخلت ضرور منسلک ہے۔

مقبول عام تقطیع (mutilation) کا آغاز غالباً پتھر کے دور کے وسطی افریقہ میں ہوا اور یہاں سے شمال کی طرف دریائے نیل کے ساتھ ساتھ قدیم مصر میں اس کا تعارف ہوا۔ آٹھویں صدی عیسوی میں عرب مسلمان افواج کی فتح مصر کے بعد ہی یہ رواج منظم انداز میں افریقہ سے باہر پھیلے اور اشاعت اسلام کے ساتھ متوازی طور پر چلتے ہوئے پاکستان اور انڈونیشیا تک پہنچے۔ جزیرہ نما عرب میں انہیں کچھ مقامات پر پیچھے ہٹنا پڑا۔ متحدہ عرب امارات کے Buraimi نخلستان میں چند سال پہلے تک رواج تھا کہ تمام چھ سالہ بچیوں کے کلائٹورس کا 1/8 انچ حصہ کاٹ دیا جائے۔ رواج کی وجہ پوچھے جانے پر Buraimi عورتیں کوئی جواب نہ دے سکیں۔ اپنے مذہب سے بخوبی آگاہ ہونے کے باعث انہیں معلوم تھا کہ قرآن میں اس قسم کی کوئی رسم نہیں ملتی، اور انہیں معلوم تھا کہ بہت سے پڑوسی قبائل بھی ایسا نہیں کرتے تھے۔ لیکن انہوں نے جانا کہ اس آپریشن کے ذریعہ وہ دراصل اپنی بیٹیوں کی پاکدامنی کو تحفظ دینے کی امید رکھتے تھے، کیونکہ اسی پاکدامنی پر لڑکیوں کے باپ اور بھائی کی عزت منحصر تھی۔

کچھ مسلمان تقطیع کو اپنے عقیدے کے ساتھ منسلک کیے جانے پر احتجاج کرتے ہیں، جبکہ چند مذہبی شخصیات نے اس دستور کے خلاف بات کی اور متعدد اسلامی کتب ہنوز اس کی حمایت کرتی ہیں۔ آسٹریلیا میں ایک مرتبہ میں نے ایک تعلیم یافتہ اور صاف گو مسلمان لڑکی کو اپنے کلائٹورس کا ایک حصہ کاٹے جانے پر شکر ادا کرتے ہوئے سنا تھا: "یہ مجھے یاد دلاتا ہے کہ میری شادی کا تعلق محض مسرت کی بجائے زیادہ اہم چیزوں کے ساتھ ہے۔"

1992ء میں لندن میں "سنڈے ٹائمز" کی ایک رپورٹر Donu Kogbara کو ایک ڈاکٹر تلاش کرنے میں کوئی مشکل نہ ہوئی جو اس کا کلائٹورس نکالنے پر رضامند ہو گیا، حالانکہ 1985ء میں "Prohibition of Female Circumcision Act" منظور ہونے کے بعد سے برطانیہ میں یہ آپریشن غیر قانونی ہو چکا تھا۔ رپورٹر نے ہارلے سٹریٹ کے ڈاکٹر فاروق صدیق سے بس اتنا کہا کہ اس کا منگیتر شادی سے قبل ہی آپریشن کروا لینے پر زور دے رہا ہے۔

بیشتر مسلم ممالک میں عورتیں اپنے مرد رشتہ داروں کی عزت کی امین ہیں۔ اگر کسی کی بیوی بدکاری کا ارتکاب کر لے، یا کوئی بیٹی شادی سے قبل جنسی عمل کر لے، یا حتیٰ کہ اس پر یہ الزام ہی لگ جائے تو باپ، بھائیوں اور کبھی کبھی سارے خاندان کی ناک کٹ جاتی ہے۔ جنسی مسرت کو کم یا ختم کرنا تحریص میں تخفیف کے مترادف ہے؛ اس صورت میں ایک متبادل جب پردے اور گوشہ گیری کے حوالے سے مذہبی ہدایات کارگر نہ ہوں۔

مگر عورت کی جنسی مسرت میں تخفیف اسلامی دینی تعلیمات کی عین متضاد ہے۔

مسلمانوں کے لیے قرآن کا ایک ایک حرف مقدس ہے۔ ''اس کتاب میں کوئی شک نہیں،'' قرآن میں کہا گیا ہے، اور ہر مسلمان اس کی 6,000 آیات کو خدا کی جانب سے براہ راست ہدایت مانتا ہے۔ لیکن مذہبی ہدایت کے دوسرے اہم ماخذ یعنی حدیث کے بارے میں کافی بحث مباحثہ ہوتا رہا ہے۔ چونکہ مسلمانوں کے خیال میں اسوۂ حسنہ کی پیروی مثالی طرز عمل ہے، اس لیے صحابہ کرام کے بیانات میں آپؐ کی چھوٹی سے چھوٹی عادات کو بھی محفوظ کر لیا گیا۔ نتیجتاً جمع ہونے والی احادیث میں راویوں کی تفصیل اور روایت موجود ہے۔ ہر حدیث کی درجہ بندی ''مستند،'' ''اچھی'' یا ''ناقص'' کے طور پر کی گئی۔ چنانچہ مسلمان ہم احادیث کی ثقاہت کا تعین خود بھی کر سکتے ہیں۔

حدیث کے مطالعہ کی بنیاد پر اسلامی فکر کے متعدد مکاتب پیدا ہوئے اور ان مکاتب کے اندر مخصوص اساتذہ نے اپنے بہت سے پیروکار بنائے۔ حرام (مثلاً خنزیر کا گوشت کھانا، الکحل پینا) اور واجب (مثلاً پانچ وقت کی نماز) چیزوں کے بارے میں زیادہ تر کا آپس میں اتفاق رائے موجود ہے۔ حرام فعل کا ارتکاب یا کسی واجب چیز سے لاپروائی کرنے والا مسلمان گنہگار ہے۔ ان کے درمیان میں مکروہ اور مسنون افعال ہیں۔

بیشتر مسلمانوں کی نظر میں ڈاڑھی رکھنا سنت ہے۔ ایسا کرنے والے شخص کو ثواب ملے گا؛ وہ اس سے لاپروائی برتنے کی سزا پانے سے بچ جائے گا۔ عورتوں کے کلائٹورس کی تقطیع کے دستور پر عمل کرنے والے مسلمان معاشروں میں یہ دستور ڈاڑھی بڑھانے جیسا ہی ہے۔ کچھ مسلمان یقین رکھتے ہیں کہ عورت کا ایک تہائی کلائٹورس کاٹ دینا مسنون ہے۔ مسلمانوں کی اکثریت اس قسم کی سنت کی موجودگی سے انکار کرتی ہے۔ شہادت مؤخرالذکر نکتہ نظر کی حمایت کرتی ہے، کیونکہ بہت

سی احادیث میں عورت کی جنسیت کو سراہا گیا ہے۔

بہت سی احادیث انکشاف کرتی ہیں کہ آنحضرتؐ نے مسیحی رہبانی روایات کے تقاضا کردہ شہوانی حبس کو ناپسند فرمایا۔ ایک رات کو ایک خاتون آپؐ کے گھر آئی اور شکایت کی کہ اس کا شوہر عثمان عبادت میں اس قدر مصروف رہتا ہے کہ جنسی عمل پر توجہ نہیں دیتا۔ آپؐ اسی وقت سیدھا عثمان کے گھر گئے اور سرزنش کرتے ہوئے فرمایا: ''اے عثمان! اللہ نے مجھے رہبانیت کے لیے مبعوث نہیں کیا، بلکہ مجھے سادہ اور سیدھی شریعت دے کر بھیجا گیا ہے۔ میں روزے رکھتا، عبادت کرتا اور اپنی زوجہ کے ساتھ مباشرت بھی کرتا ہوں۔'' (اس حدیث کا مقابلہ کرنتھیوں کے نام مراسلے میں سینٹ پال کے بیان سے کرنا چاہیے: ''مرد کے لیے کسی عورت کو نہ چھونا بہتر ہے..... لیکن اگر وہ خود ضبطی نہ کر سکیں تو شادی کر لینی چاہیے: کیونکہ آگ میں جلنے کی نسبت شادی کر لینا بہتر ہے۔'') مسلمانوں کی نظر میں مغرب کا جنسی انقلاب خدا کی ودیعت کردہ جنسی خواہش کو دبانے اور شرمناک بنانے کی کوشش کرنے والے کلیساؤں کا ناگزیر ردعمل ہے۔ اسلامی سنت کے مطابق ازدواجی زندگی میں جنسی تعلق کا لطف شوہر اور بیوی دونوں کے لیے ہے۔

اسلام نے شادی شدہ جوڑوں کے درمیان جنسی عمل کی کوئی حدود بھی مقرر نہیں کیں۔ قرآن میں ارشاد ہے: ''تمہاری عورتیں تمہاری کھیتی ہیں، جس طرح چاہتے ہو اپنی کھیتی میں داخل ہو جاؤ۔'' اس آیت کی ایک سے زائد مختلف تفاسیر موجود ہیں، لیکن زیادہ تر مفسرین کے مطابق خدا نے اہل ایمان کو اپنی بیویوں سے شہوانی لذت اٹھانے سے روکا نہیں۔ البتہ کچھ مکروہات ضرور موجود ہیں، مثلاً کھڑے ہو کر یا مکہ کی جانب پشت یا منہ کر کے مباشرت کرنا۔

اسلام ایسے معدودے چند مذاہب میں سے ایک ہے جنہوں نے حیات بعد الموت کے انعامات میں جنسی مسرت کو بھی شامل کیا: جنت کے بارے میں بہت سے بیانات آسمانی حورستان تعارفی بروشرز جیسے ہیں۔ چشموں اور سایہ دار درختوں والے پھل دار باغات میں مافوق الفطرت حسن کی مالک ان چھوئی دوشیزائیں نیک مردوں کو تفریح مہیا کریں گی۔

اگر اگلی زندگی کی جنسی مسرت میں عورتوں کا کردار نہیں رکھا گیا تو کم از کم اس دنیا میں انہیں یہ سہولت ضرور فراہم کی گئی۔ بہت سے مسلمان ممالک میں کوئی عورت (اسلامی قانون کے مطابق) اس صورت میں بھی طلاق کا مطالبہ کر سکتی ہے اگر شوہر نے چار ماہ میں اس کے ساتھ ایک مرتبہ بھی

جنسی عمل نہ کیا ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جنسی تسکین سے محروم عورت بدکاری کی جانب مائل ہو سکتی ہے اور نتیجتاً فتنہ پیدا ہوتا ہے۔

حضرت علیؓ سے منسوب کردہ ایک روایت کے مطابق، ''اللہ نے جنسی خواہش کے دس حصے کیے، اور پھر نو حصے عورت اور ایک حصہ مرد کو دیدیا۔ میرے کیتھولک سکول میں اس کے بالکل برعکس تعلیم دی جاتی تھی: جنسی لحاظ سے کم فعال لڑکیوں کو اپنے طرز عمل کا خیال رکھنا چاہیے، کیونکہ شہوت کے باعث دیوانے لڑکے خود کو قابو میں رکھنے کے اہل نہیں۔ ہر دو ثقافتوں میں عورتیں کسی نہ کسی طرح ایک غلط تعبیر پر جا پہنچیں۔ کیتھولک روایت میں عورتوں کو جنسی اعتبار سے غیر مستعد خیال کیے جانے کے باعث انہیں سماجی بدنظمی روکنے کا بوجھ اٹھانا پڑا، اور مسلم روایت میں وہ جنسی اعتبار سے فعال سمجھے جانے کے نتیجے میں اس کی ذمہ دار قرار پائیں۔ عورتوں کی بہ مشکل کنٹرول ہونے والی شہوت کا خیال ہی عموماً کلائیٹورس کی تقطیع، گوشہ گیری اور پردے کی توجیہ بنا۔ ایک سعودی دوست عبدالعزیز نے ایک دن مجھ سے کہا، ''تمہارے خیال میں ہم اس لیے اپنی عورتوں کو چھپاتے ہیں کیونکہ ہم سیکس کے حوالے سے پریشان ہیں۔ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ ہم انہیں اس لیے چھپاتے ہیں کیونکہ ہم بالکل بھی پریشان نہیں۔''

لیکن یہ مسئلہ مجھے بدستور پریشان کرتا رہا۔ سعودی عرب میں میری جان پہچان ایک جوڑے سے ہوئی جو ٹیلی فون پر ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو گئے تھے۔ لڑکا ایک میگزین کا ایڈیٹر تھا اور لڑکی نے ایک نظم اشاعت کے لیے بھیجی۔ لڑکے نے اشاعت کے متعلق بات کرنے کے لیے اسے کال کی اور جلد ہی دونوں آپس میں شاعری اور سیاست پر طویل دوستانہ گفتگو کرنے لگے۔ انہوں نے ایک دوسرے سے ملاقات کیے بغیر ہی شادی کا فیصلہ کر لیا۔

بیشتر سعودی گھرانوں کی طرح ان کے گھر میں بھی دو مدخل تھے ایک مردوں اور دوسرا عورتوں کے لیے۔ میں ایک رات کو پارٹی میں شامل ہونے کی غرض سے بلند دیواروں والے بنگلے پر پہنچی۔ سفید عباؤں والے مرد سامنے کے دروازے کی طرف چلے گئے، جبکہ ان کی بیویاں کالی چادروں میں لپٹی اور رنگین لباس والے بچوں کا ہاتھ پکڑے ہوئے بغلی دروازے کی جانب گئیں۔

ہر دو دروازے صوفوں کی قطاروں والے ایک وسیع سیلون میں کھلتے تھے۔ عورتوں والا سیلون گلابی سوتی چادروں اور دبیز قالین سے سجایا گیا تھا۔ مردوں کا سیلون نسبتاً زیادہ سادہ اور رسمی سا تھا۔

دونوں گروپ الگ الگ ہی رہے۔ لیکن میزبانوں کی خواہش تھی کہ میں ایک مرد سے ضرور ملاقات کروں: ایک استاد جو اپنے سیاسی نظریات کے باعث سعودی بادشاہت کے عتاب کا نشانہ بنا اور جیل میں قید ہوا تھا۔ اس سے بات کرنے کے لیے مجھے دستور کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مردوں کے ساتھ بیٹھنا پڑا۔ جب میں عورتوں کے سیلون میں واپس آئی تو اس آدمی کی بیوی نے مجھ سے کہا: ''آپ نے مجھ پر بڑی کرم نوازی کی ہے۔ میرے شوہر کو سیاست پر بات کرنے کا بہت شوق ہے۔ اور ایک عورت کے ساتھ سیاست پر بات کرنے سے تو وہ یقیناً بہت گرم ہو گیا ہو گا۔ اب تو مجھے جلد از جلد گھر پہنچنے کی پڑ گئی ہے۔ مجھے پتا ہے کہ آج رات بہت پرجوش سیکس ہو گا۔'' میرے گال سرخ ہو گئے۔ عورت ہنس کر بولی: ''تم اہل مغرب سیکس کے معاملے میں بہت شرمیلے ہو۔ یہاں ہم ہر وقت اسی پر بات کرتے رہتے ہیں۔''

اگرچہ سعودی خواتین بہت بڑے خاندان چاہتی تھیں، لیکن ان میں سے کوئی بھی اس کیتھولک نکتہ نظر کی تفہیم نہیں رکھتی تھی کہ جنس کا مقصد صرف تولید تھا۔ پیغمبر اسلامؐ کی صرف پہلی زوجہ کے ہاں اولاد ہوئی، تاہم آپؐ نے بعد کی تمام ازواج کے ساتھ ازدواجی تعلقات قائم کیے۔ اور کچھ ازواج تو بچہ جننے کی عمر پار کر چکی تھیں۔ آپؐ نے اس عہد میں رائج بہبود آبادی کے طریقے پر عمل کرتے ہوئے عزل کی اجازت بھی دی۔

امتناع حمل کا مسئلہ اس وقت پیدا ہوا جب مسلمان سپاہیوں کو بڑی فتوحات ملنے لگیں۔ عورتیں بھی مال غنیمت کا حصہ تھیں، اور قرآن جنگ میں ہاتھ آنے والی عورتوں پر مردوں کو جنسی حقوق دیتا ہے۔ لیکن آنحضرتؐ نے ان حقوق پر نئی قدغنیں عائد کیں۔ اول، قرآن نے مسلمانوں کو جنگی قیدیوں کو رہا کرنا بہتر قرار دیا ''اگر ان میں کوئی اچھائی نظر آئے۔'' یہ غلاموں کی تجارت سے زبردست منافع کمانے والی ایک معیشت میں ایک نہایت غیر مقبول تصور تھا۔ قرآن نے مسلمانوں کو یہ ہدایت بھی کی کہ وہ غلام عورتوں کو زبردستی مباشرت پر مجبور نہ کریں۔

امتناع حمل اس لیے اہم بن گیا کیونکہ اپنے مالک کے بچے کی ماں بننے والی کسی بھی لونڈی کو بیچا نہیں جا سکتا تھا اور وہ مالک کی موت پر آزاد قرار پاتی تھی۔ دریں اثنا اس کا بچہ مالک کا وارث بن جاتا۔ اپنی لونڈیوں کی بازاری قیمت قائم رکھنے یا جائیداد کو لونڈی کے بطن سے پیدا ہوئے بچوں میں بٹنے سے بچانے کے خواہش مند سپاہیوں کی نظر میں استقرار حمل کو روکنا گویا اپنی دولت کو تحفظ

دیتا تھا۔ آنحضرتؐ نے ایک سپاہی کو عزل کرنے کی اجازت دی، کیونکہ اگر خدا کسی کو پیدا کرنا چاہے تو کوئی انسان اس میں رکاوٹ نہیں بن سکتا۔

اسلامی فقہ معاصر صورت حالات پر قدیم استدلال لاگو کرنے کے ذریعہ جدید جنسی الجھنوں سے نمٹنے کی کوشش کرتا ہے۔ مثلاً اسلامی فقہا نے قرار دیا کہ مصنوعی تخم ریزی (insemination) جائز ہے، لیکن صرف عورت کے اپنے شوہر کے سپرم سے۔ وہ قرآن کی ایک آیت کا حوالہ دیتے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ اہل ایمان اپنے شوہر/بیوی کے سوا ہر کسی سے اپنی شرم گاہوں کو بچائیں۔ لہٰذا زیادہ تر مسلمانوں نے کسی اور شخص کے سپرم سے تخم ریزی کو ممنوع قرار دیا۔ لیکن اس صورت میں کیا ہوگا اگر اولاد کا شدید خواہش مند کوئی جوڑا اس اصول کو نظر انداز کرتے ہوئے غیر شخص کے سپرم کے ذریعہ بچہ پیدا کر لے؟ وہ بچہ کس کا ہوگا، اور قوانین وراثت کیسے عمل کریں گے؟

جب شیعی فقہ دان محمد جواد المغنیہ سے اس قسم کے ایک کیس پر فتویٰ مانگا گیا تو اس نے ایک قدیم تنازعہ وراثت کا حوالہ دیا جس میں عورت نے اپنے شوہر کے ساتھ مباشرت کی اور پھر سیدھی اپنی لونڈی کے پاس جا کر ہم جنس پرستانہ تعلقات قائم کیے۔ فرض کر لیا گیا کہ شوہر کا مادۂ منویہ اس کی اندام نہانی سے نکل کر لونڈی کی اندام نہانی میں داخل ہوا اور وہ حاملہ ہو گئی۔

دونوں ہم جنس پرست عورتوں کے لیے سزا تجویز کرنے کے بعد آئمہ کرام نے فیصلہ دیا کہ لونڈی کا بچہ مادۂ منویہ کے مالک کا وارث ہوگا۔ اس فیصلے کی روشنی میں شیخ المغنیہ نے فتویٰ جاری کیا کہ مستعار لیے ہوئے سپرم سے پیدا ہونے والا بچہ عورت کے شوہر کا نہیں بلکہ اس شخص کا وارث ہوگا جس نے سپرم کا عطیہ دیا۔

میں نے مسلم ممالک میں جتنا زیادہ وقت گزارا، میں جنسی چھوٹ اور دباؤ کے درمیان پیراڈاکس پر اسی قدر حیران ہوئی۔ ایران میں موسم گرما کے ایک دن میں میڈیکل کی طالبہ ناہید افغانی کے ہمراہ مذہبی مرکز قم گئی، وہ لندن میں اپنی تعلیم چھوڑ کر ملک کے اسلامی انقلاب میں حصہ لینے واپس آ گئی تھی۔ طلائی گنبد والی ایک مسجد قم کے ہموار صحرا میں بہت نمایاں نظر آتی تھی۔ شفاف ٹائلز والے اندرونی حجروں میں ایک شیعہ بزرگ خاتون فاطمہ معصومہ کی قبر تھی۔ ایرانی لوگ عموماً غیر مسلموں کو اہم زیارت گاہوں میں داخل نہیں ہونے دیتے، لیکن ناہید نے مجھے خلاف ورزی

کرنے کو کہا۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ پابندی اسلام کی نہیں بلکہ تنگ ذہنی کی پیداوار ہے۔

جب ناہید وضو کر رہی تھی تو میں مسجد کے وسیع وعریض دالان میں گھومتی پھرتی رہی۔ انجام کار مجھے محسوس ہوا کہ پگڑی والا ایک شخص میرا تعاقب کر رہا تھا۔ وہ مختصر ڈاڑھی والا ایک نوجوان تھا جس نے سبزی مائل زرد چغہ اور ایرانی مذہبی طالب علموں والی کالی عبا پہن رکھی تھی۔ قم میں اس قسم کے نوجوان اکثر دکھائی دیتے ہیں۔ جب میں پیچھے مڑی تو وہ ایک قدم مزید قریب آ گیا اور فارسی میں جلدی سے سرگوشی کی: ''Honim sigheh mishi?'' مجھے پریشانی تھی کہ اسے میرے غیر مسلم ہونے کا علم ہو گیا تھا اور شاید مجھے باہر چلے جانے کا کہہ رہا تھا۔ میں نے اپنی چادر مضبوطی سے کھینچ کر آنکھوں تک کر لی اور نظریں نیچی کیے تیز تیز قدموں کے ساتھ اس سے دور چلی گئی۔ ناہید نظر آئی تو میں اس کے ہمراہ زنانہ مدخل کی جانب بڑھی۔ دروازے پر ہم نے اپنے جوتے اتارے اور زیارت گاہ کے جھلملاتے اندرون میں چلی گئیں۔

اندر شمع دان پر جلتے ہوئے شعلے گردوپیش میں جھلملا رہے تھے۔ ناہید نے عورتوں کے ہجوم میں سے راستہ بنایا اور فاطمہ معصومہ کے روضے کی نقرئی جالیوں کو ہاتھوں سے چھوا۔ اس نے ایک بے دانت بوڑھی عورت اور ایک حاملہ لڑکی کے درمیان کھڑے ہو کر فاتحہ پڑھی۔

مہینوں بعد ایک ایرانی دوست سے اس زیارت گاہ کی خوب صورتی کا ذکر کرتے ہوئے میں نے اپنی مسرت کا اظہار کیا اور بتایا کہ کس طرح ایک ملا مجھے وہاں سے نکالنے ہی والا تھا۔ میرا دوست ہنس دیا: ''میں نہیں سمجھتا کہ اسے تمہارے مسلم ہونے پر شک ہوا تھا۔ اصل میں وہ تمہیں شادی کی دعوت دے رہا تھا۔'' اس نے پوچھا تھا　کیا خاتون میرے ساتھ عارضی شادی کرنا چاہتی ہے؟ یہ دستور sigheh یا متعہ کہلاتا ہے۔ دوست نے وضاحت کی، ''تم نے غالباً اپنی چادر الٹے رخ پر اوڑھی ہوئی ہوگی۔ sigheh کی خواہش مند عورتیں عموماً اس طریقے سے بھی اشارہ دیتی ہیں۔''

مرد و عورت کی مرضی اور ایک مذہبی عہدیدار کی منظوری کے ساتھ طے پانے والے sigheh کا دورانیہ چند منٹ سے لے کر نوے برس تک ہو سکتا ہے۔ مرد عموماً عارضی شادی کے بدلے میں عورت کو طے شدہ رقم ادا کرتا ہے۔ اکثر اس کا مقصد جنسی نوعیت کا ہوتا ہے، لیکن کچھ عارضی شادیاں دیگر مقاصد کے تحت بھی ہوتی ہیں۔ جنسی متعہ عام جسم فروشی سے اس طرح مختلف ہے کہ

جوڑے کو ایک مذہبی نمائندے کے سامنے پیش ہو کر اپنا معاہدہ ریکارڈ کروانا پڑتا ہے۔ ایران میں متعہ کے نتیجے میں پیدا ہونے والے بچوں کو جائز سمجھا جاتا ہے۔ بصورت دیگر sigheh شادی کی ذمہ داریوں سے مبرّیٰ ہے۔ جوڑا اپنی مرضی سے فیصلہ کر سکتا ہے کہ انہیں کتنا وقت اکٹھے گزارنا ہے، ایک فریق دوسرے کو کونسی جنسی یا غیر جنسی خدمات فراہم کرے گا اور کتنی رقم ادا کی جائے گی۔

شیعوں کا کہنا ہے کہ رسول اللہ نے sigheh یا متعہ کی اجازت دی تھی۔ اکثریتی سنی اس بات سے متفق نہیں۔ حتیٰ کہ شیعی ایران میں بھی sigheh ناپسندیدہ بن گیا تھا۔ 1988ء میں ایران۔عراق جنگ ختم ہونے کے بعد رفسنجانی نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ 1990ء میں اپنے ایک خطبے میں اس نے کہا کہ جنگ کے باعث بہت سی جوان بیوائیں موجود ہیں اور ان میں سے زیادہ تر کو دوبارہ شادی ہونے کی کوئی امید نہیں۔ اس نے کہا کہ اس قسم کی عورتوں کو ازدواجی مدد اور جنسی تسکین کی ضرورت ہے۔ دوسری طرف بہت سے ایسے نوجوان بھی موجود تھے جو گھر بسانے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے۔ جنسی تناؤ کو صحت مندانہ انداز میں زائل کرنے کی ضرورت تھی۔ رفسنجانی نے کہا کہ اسلام میں sigheh کا یہی مقصد ہے، تو پھر اس سے کام کیوں نہ لیا جائے؟

اس کے خیالات نے ایرانی عورتوں کے درمیان ایک گرما گرم بحث چھیڑ دی۔ کچھ عورتوں نے دستور کو استحصالی قرار دے کر سختی سے مسترد کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ ریاست کو جنگی بیواؤں کا خیال رکھنا چاہیے تاکہ انہیں sigheh میں اپنا جسم نہ بیچنا پڑے۔ لیکن دیگر نے اس کی حمایت کی۔ ان کا خیال تھا کہ sigheh محض دولت کا معاملہ نہیں۔ بیوہ اور مطلقہ عورتوں کو جنسی ضروریات پوری کرنے اور مردوں سے صحبت رکھنے کی اجازت ہونی چاہیے؛ sigheh شوہران کے گھروں میں بچوں کے لیے ایک خوش کن تبدیلی لائے گا۔ ایران کے ہفتہ وار مزاحیہ جریدے ''Golagha'' نے اس حوالے سے ایک کارٹون شائع کیا۔ اس میں شادی کے اجازت نامے دینے کے لیے دو ڈیسک دکھائے گئے تھے، ایک sigheh اور دوسرا مستقل شادی کے لیے۔ مستقل شادی والا ڈیسک بالکل خالی تھا، جبکہ sigheh والے ڈیسک کے سامنے دروازے تک ایک طویل قطار لگی تھی۔

زیادہ تر غریب عورتیں ہی sigheh کے لیے رضامند ہوتی ہیں۔ ایک وکیل دوست نے مجھے اپنی صفائی کرنے والی عورت کے متعلق بتایا جس کا شوہر دو بچوں کو چھوڑ کر جوانی میں ہی مر گیا تھا۔ میری دوست نے کہا، ''وہ کافی عرصہ تک بہت تلخ مزاج رہی۔ وہ میرے گھر آتی اور مجھے اپنے

شوہر اور بیٹی کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی گزارتے دیکھتی، جبکہ اس کی اپنی زندگی میں کام کے سوا کچھ نہیں تھا۔'' تب نوکرانی نے عارضی شادی کا معاہدہ کر لیا۔ ''اس کی شخصیت راتوں رات بدل گئی۔ یہ صرف پیسوں کا معاملہ نہیں تھا۔ اچانک اسے اپنے ساتھ وقت گزارنے اور تفریح بازی کے لیے ایک مرد مل گیا تھا۔ ہماری ثقافت میں مرد اور عورت کو ڈیٹ پر جانے کی اجازت نہیں، لیکن sigheh میں وہ ایسا کر سکتے ہیں۔''

کچھ شیعہ sigheh کی مدد سے ایسا تعلق بھی قائم کرتے ہیں جس کے ذریعہ کسی عورت کو نامحرم مرد کے سامنے بے پردہ آنے کی اجازت مل جاتی ہے　مثلاً گھر میں آ کر ٹھہرا ہوا کوئی دور کا رشتہ دار۔ sigheh کے ان معاہدوں میں تخصیص کی جاتی ہے کہ جنسی تعلقات قائم نہیں کیے جائیں گے۔ مغرب میں کچھ شیعہ گھرانے اسی طریقہ سے نوجوان جوڑوں کو شادی سے قبل ایک دوسرے کو جاننے کا موقع دیتے ہیں۔ جنسی تعقات پر پابندی عائد کرنے والے معاہدہ sigheh کے تحت لڑکے اور لڑکی کو اپنی منگنی کے عرصہ تک ملنے جلنے کی اجازت ہوتی ہے، اور اس میں مذہب یا روایت کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔

sigheh بانجھ پن کے مختلف مسائل کا بھی ایک جواب مہیا کرتا ہے جسے اہل مغرب متبادل مائیں بننے کے لیے قانونی معاہدوں کے ساتھ حل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اسلام کی سنی شاخ میں اگر کوئی عورت بانجھ ہو تو شوہر اسے طلاق دے دیتا یا دوسری بیوی لے آتا ہے۔ ایران میں ایک sigheh معاہدہ کیا جا سکتا ہے جس میں نشاندہی کی جاتی ہے کہ عارضی شادی کا مقصد بچہ پیدا کرنا ہے جس کی پرورش شوہر اور اس کی مستقل بیوی کریں گے۔

کسی شیعہ مسلمان کی ایک غیر مسلم عورت کے ساتھ شادی کا واحد ذریعہ بھی sigheh ہی ہے۔ دیگر اہل کتاب عورتوں کے ساتھ شادی کی اجازت دینے والے سنیوں کے برعکس شیعہ مسلمان مستقل شادی کو تبھی جائز مانتے ہیں جب غیر مسلم عورتوں یا مردوں کا مذہب تبدیل کر لیا گیا ہو۔

رفسنجانی کی جانب سے sigheh کی بحالی غیر مذہبی ایرانیوں کے لیے ایک نوید مسرت تھی جن کی نجی زندگیاں انقلابی دراندازیوں کی وجہ سے شدید گڑبڑ کا شکار تھیں۔ مثلاً ہفتے کے اختتام پر غیر شادی شدہ محبوب اور محبوبائیں گھومنے پھرنے نہیں جا سکتے تھے　انہیں نکاح نامے کے بغیر ہوٹل میں ڈبل روم نہ ملتا، اور انقلابی گارڈ کسی بھی موڑ پر انہیں پکڑ سکتے تھے۔ Lou نامی ایک یورپی

عورت فارسی ثقافت پر فریفتہ ہوئی اور ایرانی شہری بن گئی۔ اس کے خیال میں یہ صورت حال بہت سے مسائل کا باعث تھی۔ اگرچہ اس نے ایران میں رہنے کی خاطر اسلام قبول کر لیا تھا، لیکن اس کے مذہبی میلانات زین بدھ مت، یوگ اور روحانیت کا مغوبہ تھے۔ بہت گہرائی میں ایک بوہیمیائی Lou اسلامی جنسی قوانین کے ساتھ کوئی ٹکراؤ نہیں چاہتی تھی۔ اس نے متعدد عاشق بنائے اور متعدد خطرات مول لیے۔ آخر کار sigheh کا دستور دوبارہ جاری ہو گیا۔ اب وہ کوئی عاشق منتخب کرتے وقت چند ماہ کے لیے sigheh معاہدہ پر دستخط کرتی اور انقلاب کے پہریداروں کی جانب سے جانچ پڑتال کیے جانے پر دستاویز انہیں پیش کر دیتی۔ غالباً رفسنجانی کی مراد یہ نہیں تھی۔

تاہم، سنی اور شیعہ دونوں قسم کے مسلمانوں کے لیے گھر کی حدود سے باہر جنسی دلچسپیاں سنگین گناہ کا باعث بنتی ہیں۔ اسلام میں جنسی آزادی پر عائد کی گئی حدود کی بنیاد شادی کے بستر پر ہے، چاہے وہ عارضی ہو یا مستقل۔ ورائے شادی سیکس اور ہم جنس پرستی ممنوع ہیں، اور اسلامی ضابطہ تعزیرات میں یہ دونوں جرائم خوفناک سزاؤں کا مستوجب بناتے ہیں۔

اسلامی شریعہ میں موت کی سزا قتل کے مجرم کو دی جا سکتی ہے، جبکہ ایسے بدکاری کے مجرم کو سزائے موت دینا لازمی ہے جو شوہر/ بیوی کے ساتھ قانونی طور پر اپنی جنسی پیاس بجھا سکتا/ سکتی ہو۔ اگر زانی غیر شادی شدہ ہو، یا شوہر/ بیوی ارتکاب جرم کے وقت بہت دور ہو تو سزا گھٹ کر ایک سو کوڑے رہ جاتی ہے۔ ایران میں زانی کو اب بھی سنگساری کی سزا دی جاتی ہے۔ سعودی عرب میں بھی شادی شدہ زناکاروں کے لیے سنگساری کی سزا مقرر ہے۔ سوویت یونین کے ساتھ جنگ کے دوران کچھ افغان مجاہدین کو امریکی حکومت سے اس قدر حمایت حاصل ہو گئی کہ انہوں نے افغانستان میں سنگساری کا دستور دوبارہ نافذ کر دیا۔ تاہم، قرآن مجید میں بدکاری کے لیے سنگساری کی سزا کا کوئی حکم نہیں ملتا۔ قرآن میں کہا گیا ہے کہ بدکار بیویوں کو ان کے گھروں تک محدود کر دیا جائے، ''یہاں تک کہ موت ان پر غلبہ پا لے۔'' تاہم، آنحضرتؐ کے مدینہ میں قیام کے دوران شہر کے یہودی اکثر بدکاروں کو سنگسار کیا کرتے تھے۔ متعدد احادیث میں مسلمانوں کے لیے یہ سزا تجویز کی گئی۔ لیکن دوسرے خلیفہ حضرت عمر فاروقؓ کے دور میں ہی کہیں جا کر بدکار کو موت کی سزا دینے کا باقاعدہ قانون بنا۔

آج ایران میں مردوں کو سنگسار کرنے کے لیے انہیں کمر تک مٹی میں دفن کر دیتے ہیں (اور عورتوں کو چھاتی تک)۔ مارے جانے والے پتھروں کا سائز مخصوص ہے۔ اس کام میں بڑے پتھر اور نہ ہی کنکریاں استعمال کی جاتی ہیں، تاکہ موت واقع ہونے میں بہت جلدی یا بہت تاخیر نہ ہو جائے۔

مرنے کا اس سے بدتر طریقہ تصور کرنا مشکل ہے۔ تاہم، سدومیت کے لیے مقرر کی گئی سزائیں اس سے بھی زیادہ سخت ہیں۔ اگر ملوث مرد شادی شدہ ہوں تو انہیں زندہ جلا یا بلندی سے نیچے پھینکا جاتا ہے۔ اگر وہ غیر شادی شدہ ہوں تو مفعول شریک (بشرطیکہ وہ نابالغ نہ ہو) کو موت اور فاعل کو ایک سو کوڑوں کی سزا دی جاتی ہے۔ سزا میں کمی بیشی اس تصور سے مسلمانوں کے تنفر کی عکاس ہے کہ مرد مدخول شریک کا نسوانی کردار اپنائیں۔ ہم جنس پرستی کی مرتکب کنواری عورتوں کے لیے ایک سو کوڑوں کی سزا اپنائی گئی۔ شادی شدہ ہم جنس پرست عورتوں کو سنگسار کیا جانا چاہیے۔

جنس اور اسلام کے متعلق لکھنے والے وینکوور اسلامک ایجوکیشنل فاؤنڈیشن کے ایک مذہبی عالم محمد رضوی نے پوچھا: ''زنا کاری، سدومیت یا عورتوں کی ہم جنس پرستی کے معاملات میں اسلام اس قدر سخت کیوں ہے؟ اگر اسلامی نظام میں کسی گناہ کے بغیر اور جائز ذرائع سے جنسی خواہش کی تسکین کی اجازت نہ دی گئی ہوتی تو اسلام کو بجا طور پر ایک سخت گیر مذہب کہا جا سکتا تھا۔ لیکن اسلام میں جائز ذرائع سے جنسی جبلتوں کو پورا کرنے کی پوری اجازت ہے، اس لیے یہ کسی کجروی برداشت کرنے کو تیار نہیں۔''

لیکن نہایت متقی مسلمانوں میں بھی ''کجروی'' کا رویہ جاری رہا۔ 1990ء کے آخر میں جب امریکی افواج سعودی عرب کو صدام حسین سے بچانے کے لیے آ رہی تھیں تو میں سعودیوں کے ردعمل کی رپورٹ تیار کرنے گئی۔ وہاں پہنچنے کے بعد پہلی رات کو میں نے ایک بڑی آئل کمپنی کے ایگزیکٹو سے بات کی۔ اس نے جارج ٹاؤن یونیورسٹی اور وارٹن سکول سے تعلیم حاصل کی تھی۔ لہذا مجھے امید تھی کہ وہ مغربی اثرات کے تحت لبرل نکتہ نظر پیش کرے گا۔ اس کی بجائے اس نے توقع ظاہر کی کہ امریکی لوگ الکحل اور خواتین ڈرائیوروں جیسی ''ناپاک جسارتوں'' سے ہونے والی گمراہی روکنے کے لیے اپنے اڈوں میں ہی رہیں گے۔ اس نے کہا کہ فوجوں کی آمد کی رپورٹنگ

کے لیے سی این این کا ایک خاتون رپورٹر کرسٹیان امانپور کو بھیجنا نہایت ''گستاخانہ'' فعل تھا۔ اس کی نظر میں جنسوں کی برابری کے معاملے میں امریکہ کا خبط محض غیر اخلاقی پن کا دروازہ تھا۔ ''مجھے بتائیں کہ کیا کسی بھی کارپوریشن میں باس اپنی سیکرٹری کو دیکھنے اور اُسے پانے کے منصوبے بنانے کا نہیں سوچتا رہتا؟ اگر ایسا نہ ہو تو اس کی وجہ صرف ذاتی مفاد ہوتی ہے انہیں پکڑے جانے پر بہت کچھ کھونے کا خدشہ ہوتا ہے۔''

اس کی مطالعہ گاہ کی شیشے کی دیوار سے فلڈ لائٹ میں نہایا ہوا سوئمنگ پول اور ایک پھولوں بھرا باغ دکھائی دیتا تھا۔ اس نے وضاحت کی کہ اگر دیوار شیشے کی نہ ہوتی تو وہ میرے ساتھ نہ بیٹھ سکتا۔ ''اگر ایک مرد اور عورت اکیلے اکٹھے ہوں تو ان کے درمیان تیسرا شیطان ہوتا ہے۔'' تقریباً ایک گھنٹے بعد میں نے اپنی نوٹ بک بند کی اور انٹرویو کے لیے اس کا شکریہ ادا کیا۔ مجھے دروازے تک چھوڑتے ہوئے وہ جیسے کچھ سوچ کر رکا اور پوچھا کہ کیا میں اس کے کچھ دوستوں سے ملنا پسند کروں گی۔ میں نے کہا، یقیناً۔

ہال کمرہ پار کر کے اس نے ایک نیم تاریک کمرے کا دروازہ کھولا جو راک میوزک اور آپس میں گڈمڈ جسموں سے بھرا ہوا تھا۔ کالے مختصر لباس میں ایک حسین فلپائنی لڑکی ناچ رہی تھی اور وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اپنے سفید عبا والے پارٹنر کے ساتھ جسم رگڑتی۔ ایک اور آدمی زمین پر آلتی پالتی مارے بیٹھا ہوا اس کی ٹانگوں پر رنگین روشنی کے اشکارے ڈال رہا تھا۔ زمرودی سبز صوفوں پر ایک خوب صورت سنہرے بالوں والا ترک ایک مصری عورت سے بغل گیر تھا۔ کونے میں بنی بار میں مہمان جانی واکر وہسکی کے جام بنا رہے تھے۔ بلیک مارکیٹ میں جانی واکر کی ایک بوتل 135 ڈالر کی ہے اور اسے پینے والے کے لیے سرعام کوڑوں کی سزا مقرر ہے۔

برف والی سکاچ کا جام لہراتا ہوا میرا میزبان اپنی کہی ہوئی باتوں کی عین ضد معلوم ہوا۔ دوسرا پیگ پینے کے بعد وہ مجھے ایک امریکی خاتون کے ساتھ اپنی ناکام شادی کے متعلق بتانے لگا۔ ''وہ چہرے پر نقاب کیے بغیر میری رولز رائس میں گھومنے پھرنے پر مُصر تھی،'' اس نے ناگواری سے کہا۔ طلاق کے بعد اس نے بچے اپنے پاس ہی رکھے لیے تھے، جیسا کہ سعودی قانون اسے حق دیتا ہے۔ اس کا دوبارہ شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس نے فلپائنی لڑکی کی جانب اشارہ کر کے کہا، ''میں جب چاہوں ایک لڑکی مل سکتی ہے۔ پچھلے موسم سرما میں میں نے ایک ماڈل کو سوئٹزر لینڈ

میں اپنے ساتھ پندرہ دن گزارنے کے لیے ادائیگی کی تھی۔''

نجیب محفوظ کا ناول ''Palace Walk'' پڑھ لینے سے پہلے تک میں اس شخص کی منافقت پر جھلاتی رہی۔ اس ناول کا مرکزی کردار ایک راسخ العقیدہ شخص ہے جو اپنی عورتوں کو گوشہ نشین رکھتا ہے، لیکن خود ہر رات کو قاہرہ کی مشہور گلوکاراؤں کے ساتھ موج میلہ کرنے جاتا ہے۔ جب ایک شیخ نے اسے بدکاریوں پر فہمائش کی تو اس نے جواب دیا کہ ''آج کل کی تفریح فراہم کرنے والی پروفیشنل عورتیں ماضی کی لونڈیاں ہیں جنہیں بیچنے اور خریدنے کی خدا نے اجازت دی ہے۔''

سعودی ایگزیکٹو بھی اپنے ڈسکو روم میں ناچتی ہوئی عورتوں کو اسی حوالے سے دیکھتا تھا۔ ان میں سے زیادہ تر عورتیں قومی ایئر لائن السعودیہ کے لیے کام کرتی تھیں۔ سعودی عرب میں یہ غیر ملکی عورتوں کے لیے دستیاب چند ایک ملازمتوں میں سے ایک تھی۔ عام طور پر گھریلو نوکرانیوں کے سوا عورتوں کو ملازمتی ویزے نہیں دیے جاتے تھے۔ ایئر لائن کو غیر ملکی لڑکیوں کی ضرورت تھی، کیونکہ کوئی بھی سعودی عورت ایسی ملازمت نہیں کر سکتی تھی جس میں بغیر ولی کے سفر کرنا اور مردوں سے

ملنا جلنا پڑتا ہو۔

جب میں جانے کے لیے اُٹھی تو فلپائنی لڑکی نے پوچھا کہ کیا میرا ڈرائیور اسے لفٹ دے سکتا ہے۔ وہ اپنی عبایہ اور نقاب لینے گئی۔ اپنے اوپر گڑی ہوئی مردوں کی نظروں سے آگاہ ہونے کے باعث اس نے کالی ریشمی قمیض کو آہستہ آہستہ آگے کو کھینچا، اپنی چھاتی کی وادی کو دھیرے دھیرے منکشف کیا اور تھوڑا تھوڑا کر کے اپنی رانوں تک نیچے لے آئی۔ پھر اُس نے کپڑے کا ایک ٹکڑا لے کر اپنا چہرہ ڈھانپا، لمبے بالوں کو آگے کی جانب جھٹکا، مردوں کے سامنے لحہ بھر کو قصداً جھکی اور ہلکا سا مڑ کر اپنے اٹھے ہوئے کولہوں کا نظارہ پیش کیا۔ اس نے اپنا سر پیچھے کو جھٹکا اور سارے بال نقاب میں چھپا لیے۔ یہ سٹرپ ٹیز کا الٹا عمل تھا۔ ساری کارروائی مکمل ہونے پر وہ کالی ملفوف کون کی طرح کھڑی تھی　　سعودی نسوانی راست کرداری کی منہ بولتی تصویر۔

شروع میں مجھے بہت حیرت ہوئی کہ میرا منافق میزبان ایسے ملک سنگین خطروں سے بھرپور انداز زندگی اپنائے ہوئے ہے جہاں زناکاری کے خلاف اتنے سخت قوانین نافذ ہیں۔ لیکن انجام کار میں نے محسوس کیا کہ وہ اپنے مکان کی بلند دیواروں کے پیچھے بالکل محفوظ تھا۔ جنسی تنازعات میں سزائیں عموماً اسی وقت ملتی ہیں جب ملزم اقبال جرم کر لے۔ ورنہ اسلامی قوانین شہادت کے

مطابق الزام کو درست ثابت کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ قانون کی رو سے چار مرد (یا تین مرد اور دو خواتین) گواہوں کا دخول کا عمل آنکھوں سے دیکھنے کی گواہی دینا ضروری ہے۔ اگر گواہ پورے نہ ہوں تو الزام لگانے والا شخص اسی کوڑوں کی سزا کا مستحق ہوگا۔

لیکن عورتوں کے معاملے میں اکثر ان میں سے کوئی بھی قانون لاگو نہیں ہوتا، کیونکہ ملزم کے عدالت تک پہنچنے سے بہت پہلے ہی سزا دے دی جاتی ہے۔

تمام فاہلیہ (Tamam Fahiliya) نے اپنے کٹے ہوئے بل دار بالوں کی لٹ میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بتایا، ''جب میں نو برس کی تھی تو میرا باپ فوت ہو گیا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی۔ اگر وہ زندہ ہوتا تو میں بہت برس پہلے ہی مری جا چکی ہوتی۔''

تمام اپنے اپارٹمنٹ میں کافی ٹیبل کی دوسری جانب گئی اور ایک سگریٹ نکالا۔ جب وہ آگے جھکی تو اس کی گہرے گلے والی شرٹ کے اوپر سے گوشت نے باہر جھانکا۔ وہ اکیلی رہتی تھی۔ 37 سالہ فلسطینی عورت کے لیے اکیلا رہنا نہایت خطرناک تھا۔ تین سال تک ایک شخص اس کا عاشق رہا: ایک وجیہ نوجوان فلسطینی ڈاکٹر جو حقوق نسواں کا حامی ہونے کا دعویٰ کرتا تھا۔

''یقیناً، یہ محبت صرف باتوں کی حد تک تھی۔ آخر کار وہ واپس اپنے گاؤں گیا اور اپنی کزن سے شادی کر لی۔ مرد کے پاس ہمیشہ واپسی کی راہ ہوتی ہے۔ لیکن میرے پاس نہیں ہے۔ اب کسی بڈھے کھوسٹ یا پاگل مرد کے سوا کوئی بھی میرے ساتھ شادی نہیں کرے گا۔''

تمام کی اس بات میں مبالغہ نہیں تھا کہ اگر باپ کو اس کے معاشقے کا پتا چل جاتا تو وہ اسے مار ڈالتا۔ ہر سال تقریباً چالیس فلسطینی عورتیں ''غیرت کے نام پر'' اپنے باپوں یا بھائیوں کے ہاتھوں قتل ہوتی ہیں۔ یہ قتل لڑکی کے رشتہ داروں کے چہرے پر لگا قبل از شادی یا ورائے شادی سیکس کا داغ دھو ڈالتے ہیں۔ اس قسم کے زیادہ تر واقعات نسبتاً غریب یا دور افتادہ فلسطینی دیہات میں ہوتے ہیں۔ اکثر عورتیں جلا دی جاتی ہیں، تاکہ موت کو محض ایک حادثہ بنا کر پیش کیا جا سکے۔ قاتل عموماً علاقے میں ہیرو قرار پاتا ہے: ایک ایسا شخص جس نے اپنے خاندان کا نام بچانے کی خاطر حتمی اقدام کیا۔ اسرائیلی قبضے کے باعث کسی بھی اور جگہ کی نسبت فلسطینیوں کے ہاں ''غیرت''

کے نام پر قتل کا دستاویزی ریکارڈ کافی بہتر انداز میں موجود ہے: زیادہ تر اموات اسرائیلی فوج یا سویلین پولیس کے علم میں آجاتی ہیں۔

اسلامی دنیا میں ایک اور قسم کی قتل گری بھی رائج ہے۔ اس کی بدنام ترین مثال سعودی شہزادی مشعال بنت فہد ابن محمد کی سزائے موت تھی جو 1977ء میں جدہ کی ایک پارکنگ میں دی گئی۔ ایک سابقہ برطانوی شہری نے چوری چھپے یہ منظر دیکھا۔ ''Death of a Princess'' نامی ڈاکومنٹری میں اس قتل گری کی فلم دکھائے جانے کے نتیجے میں سعودی عرب میں برطانیہ کے سفیر کو نکال دیا گیا۔ امریکہ میں جب PBS نے فلم دکھانے کا ارادہ کیا تو ایک بہت بڑی آئل کمپنی کے سرمایہ کار نے ایسا نہ کرنے کو کہا۔ معاملے کے کچھ ایک حقائق کی تصدیق ہو چکی ہے۔ برطانوی ٹیلی ویژن پر دکھائی گئی ڈاکومنٹری میں بتایا گیا تھا کہ شادی شدہ خاتون مشعال اپنے عاشق خالد محلل کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ خالد سعودی عرب کے موجودہ وزیر اطلاعات کا بھتیجا تھا۔ مشعال نے چند راتیں اس کے ساتھ جدہ کے ایک ہوٹل میں بسر کیں اور پھر مردانہ ملبوس میں ملک سے فرار ہونے کی کوشش کی۔ اسے ایئر پورٹ پر پکڑ کر گھر والوں کے سپرد کر دیا گیا۔

لیکن ایک ممتاز سعودی گھرانے میں بیاہی ہوئی ایک امریکی عورت نے کیس میں ملوث افراد سے کچھ معلومات حاصل کیں اور وہ نہایت سنگین کہانی سناتی ہے۔ اُس کے مطابق مشعال غیر شادی شدہ تھی۔ اسے محض خاندانی رواج کو ٹھکرانے اور محبوب سے شادی کی خاطر زبردستی کا رشتہ مسترد کرنے کی وجہ سے مارا گیا۔ مشعال کے دادا پرنس محمد (حکمران خاندان کی شاخ کا بزرگ) نے اپنے چھوٹے بادشاہ بھائی کی رحم کی درخواستیں بھی ان سنی کر دیں۔ مشعال کو گولی مار دی گئی؛ خالد کا سر قلم ہوا۔ قتل کے بعد کوئی اعلان بھی نہ ہوا، جیسا کہ شرعی قانون کے تحت کرنا لازمی ہے۔

کہانی کی ہر دو تفصیلات میں، شرعی قوانین شہادت کے مطابق مشعال اور نہ ہی خالد کا جرم ثابت کرنا ممکن تھا۔ اگر ڈاکومنٹری والا بیان درست تھا اور مشعال ایک بدکاری کا ارتکاب کرنے والی ایک شادی شدہ عورت تھی تو موت کی سزا صرف اُس صورت میں مل سکتی تھی جب چار گواہوں نے جوڑے کو ہوٹل میں حالت دخول میں دیکھا ہوتا۔ ہوٹل میں اکٹھے رات گزارنے کی شہادت کافی نہیں تھی۔ اور اگر مشعال غیر شادی شدہ تھی تو اس نے شرعی قانون کی رُو سے کوئی قابل گردن زدنی جرم نہیں کیا تھا۔

السعود جیسے اعلیٰ طبقہ کے کسی خاندان کے لیے غیرت کے نام پر ورائے عدالت قتل کرنا ایک خلاف معمول واقعہ تھا۔ عام طور پر غریب اور ان پڑھ خاندانوں کی عورتیں ہی اس کا نشانہ بنتی ہیں۔

تمام کا باپ ناخواندہ اور غریب تھا اس نے بطور مالی کام کر کے اپنے سات بچوں کو پالا۔ گھرانہ اکو (Akko) کے قدیم شہر میں ایک گنجان آبادی میں رہتا تھا۔ چونکہ اس کا خاندان ان 1,56,000 فلسطینیوں میں شامل تھا جنہوں نے 1948ء میں عرب اسرائیل جنگ کے دوران نقل مکانی کی بجائے وہیں رہنا بہتر سمجھا، اس لیے تمام نے اسرائیلی شہریت کی حامل ایک عرب لڑکی کے طور پر پرورش پائی۔ وہ عربی جتنی ہی روانی سے عبرانی بھی بول سکتی تھی۔ وہ پانچ بہنوں میں سب سے چھوٹی تھی؛ اس کا نام "تمام" لڑکیوں کی لمبی قطار تمام کرنے کے لیے والدین کی ایک درخواست تھی۔ دعا قبول ہوئی اور کئی سال بعد دو بیٹے پیدا ہوئے۔

تمام کے لیے بھائی بھی مسئلہ بن سکتے تھے۔ لیکن جب وہ گھر سے بھاگی تو دونوں بہت چھوٹے تھے، اس لیے بہن پر اپنے ملکیتی حقوق محسوس نہ کر سکے۔ "اور بہت سوں کی طرح ہمارے بھائی بھی بڑے بڑے بھونکنے والے کتے ہیں جو ہمارے جسموں کی حفاظت کرنا اپنی زندگیوں کا واحد مقصد سمجھتے ہیں۔ یہ چیز خود ان کے لیے بھی ایک مشکل ہے۔ وہ زندگی بھر اس ذمہ داری کو اٹھائے رہتے اور متواتر پریشان رہتے ہیں کہ ہم کسی بھی لمحے ان کی عزت خاک میں ملا دیں گی،" تمام نے کہا۔

سکول کی پڑھائی مکمل کرنے کے بعد تمام فوراً معذور بچوں کے سکول میں پڑھانے کی ملازمت کرنے لگی تا کہ روزی کما سکے۔ بعد میں اس نے بطور نرس تربیت حاصل کی۔ جب 1993ء میں اس سے میری ملاقات ہوئی تو اسے اکیلے یا دوستوں کے ساتھ زندگی گزارتے ہوئے دس سال سے زائد عرصہ ہو چکا تھا۔ وہ مشرق وسطیٰ میں مجھے ملنے والی واحد ایسی مسلمان عورت تھی جو اپنے شوہر یا گھر والوں کے سہارے پر زندہ نہیں تھی۔

جون 1991ء میں تمام نے صبح کی اخبار اٹھائی اور گلیلی کے ایک گاؤں اکسال میں قتل کی چھوٹی سی خبر پڑھی۔ وہ بچپن سے ہی ایسی خبریں سنتی آئی تھی۔ انیس سالہ غیر شادی شدہ، سات ماہ کی حاملہ عورت کی مسخ شدہ لاش ایک آتش زدہ کار کے اندر پڑی ہوئی ملی۔ قاتل اس کا 74 سالہ باپ تھا۔

''مجھے لگا کہ یہ لڑکی مَیں ہوں۔ وہ ہم میں سے ایک ہے۔ یہاں ہم سب اپنی زندگی کے لیے لڑ رہی ہیں۔''

قتل ہونے سے کوئی چھ ماہ قبل تمام اور اس کی کچھ سہیلیاں ہفتے میں ایک بار اکٹھی ہو کر حقوق نسواں سے متعلق کتب پڑھا اور عرب اور مسلمان معاشروں میں عورتوں کو درپیش مسائل پر گفتگو کیا کرتی تھیں۔ حتیٰ کہ انہوں نے اپنے چھوٹے سے گروپ کا ایک نام بھی رکھ لیا تھا: الفنار یعنی لائٹ ہاؤس۔ ہم نے مصیبت کی ماری عورتوں کو اُمید کی ایک کرن دکھانے کے بہت بڑے بڑے خواب دیکھے۔ چنانچہ میں نے اپنے دوستوں کو بلایا اور کہا، 'اگر ہم نے اس معاملے میں کچھ نہ کیا تو ساری گفتگو کا کیا فائدہ؟' ''

تمام اور اس کی دوستوں نے پمفلٹ کارڈز بنائے جن پر لکھا تھا: ''اب، بھائی، میری مدد کرو، مجھے ذبح نہ کرو۔'' انہوں نے عورتیں کے تمام معلوم گروپس سے رابطہ کیا اور مدد مانگی۔ زیادہ راہنمائی نہ مل سکی۔ مغربی کنارے کے فلسطینی اخبارات میں سے کسی نے بھی یہ موضوع نہ چھیڑا۔ وہ عرب معاشرے پر کسی بھی تنقید سے بچنا چاہتے تھے جسے اسرائیلی بطور پراپیگنڈا استعمال کر سکتے۔ مغربی کنارے کے خواتین گروپوں نے دلیل دی کہ یہ موقع مناسب نہیں تھا، کہ اسرائیلی حکومت سے آزادی کی جدوجہد انجام کو پہنچنے کے بعد ہی عورتوں کے حقوق کا مسئلہ اٹھایا جا سکے گا۔ اسرائیلی عرب سیاسی جماعتوں نے بھی دامن بچایا کیونکہ وہ اپنے ووٹروں کو ناراض نہیں کرنا چاہتی تھیں۔

تمام اور اس کی درجن بھر دوستوں نے دو عرب اسرائیلی اخبارات میں احتجاج چھپوانے کے لیے رقم جمع کی۔ اسے فوراً ہی ٹیلی فون پر دھمکیاں ملنے لگیں۔ ''فون کرنے والوں نے ہمیں بدکرداری پھیلانے کا الزام دیا۔'' ایک کال کرنے والے نے قرآن کے اس حکم کا حوالہ دیا کہ مرد عورتوں کے نگہبان ہیں اور اس حکم کو چیلنج کرنا تکفیر دین ہوگا۔ ''انہوں نے کہا کہ اگر احتجاجی مظاہرہ مزید آگے بڑھا تو ہمارا انجام بھی اکسال والی لڑکی جیسا ہوگا۔''

پھر بھی ایک سوموار کی دوپہر کو جب کوئی چالیس عورتیں ناصرۃ کی مرکزی شاہراہ پر مظاہرے کے لیے جمع ہوئیں تو انہیں غصیلی نظروں سے دیکھنے والوں کے علاوہ کچھ حمایتی بھی نظر آئے۔

''کچھ نے ہمیں 'فحشائیں' کہا اور دیگر گالیاں دیں، لیکن کئی بوڑھی عورتیں اور حتیٰ کہ چند مرد بھی خود بخود ہمارے ساتھ شامل ہو گئے،'' تمام نے بتایا۔ ان کی کامیابی سے حوصلہ پا کر عورتیں دور دراز

دیہات میں جاتیں، وہاں غیرت کے نام پر قتل اور جبری شادیوں کے خلاف مواد تقسیم کرتیں۔

''ہمیں پتا چلا کہ ایسے وقت پر دیہات میں جانا بہترین ہے جب مرد اپنے کام پر گئے ہوں۔ ورنہ شوہر آ کر دروازے پہ کھڑا ہو جاتا، پمفلٹ پر بیوی کی نظر پڑنے سے پہلے ہی چھین کر پھاڑ دیتا۔''

نومبر میں غیرت کے نام پر ایک اور قتل نے احتجاجی مظاہرے کے لیے انگیخت مہیا کی۔ اس مرتبہ اسرائیلی عرب قصبے رملہ میں اسرائیلی پولیس ہدف تھی۔ پولیس نے گھر سے بھاگی ہوئی ایک سولہ سالہ عرب لڑکی کو ایک شادی شدہ مرد کے ساتھ چوری کی کار میں پھرتے ہوئے گرفتار کیا تھا۔ لڑکی نے بہت منت کی کہ اس کے والدین کو اطلاع نہ کی جائے۔''اس نے کہا کہ وہ اسے مار ڈالیں گے، لیکن پولیس نے توجہ نہ دی۔ انہوں نے گھر والوں کو بلایا اور کہا، 'تمہاری بیٹی ہمارے پاس موجود ہے۔ وہ بہت خوفزدہ ہے۔ تمہیں وعدہ کرنا ہوگا کہ اسے نقصان نہیں پہنچاؤ گے۔' گھر والوں نے وعدہ کر لیا، اس لیے پولیس نے لڑکی ان کے حوالے کر دی۔'' کچھ ہی دن بعد وہ مقتول حالت میں ملی۔

''الفنار'' کی سرگرمیاں اسرائیلی پریس کی توجہ حاصل کرنے لگیں۔ عورتوں نے رپورٹروں کا استقبال کیا اور پھر چھپنے والے مضامین پڑھ کر بہت مایوس ہوئیں۔ تمام نے بتایا: ''ہمیں لگا کہ ہم عرب مخالف پراپیگنڈا کا آلہ بن گئی تھیں۔ مضامین میں کچھ اس طرح کا تاثر دیا گیا تھا کہ 'دیکھو جاہل عرب اپنی عورتوں کو کیسے قتل کرتے ہیں! دیکھو جاہل عرب جدوجہد کرنے والی عورتوں کو کیسے ہدف بناتے ہیں۔' رپورٹر آ کر مجھ سے ملتے اور کہتے، 'تم عربوں جیسی نہیں ہو۔' مجھے افسوس ہے، میں نہیں چاہتی کہ یہودی لوگ مجھے بتائیں کہ عرب کیا ہوتا ہے اور کیا نہیں۔''

یہودی پریس کی جانب سے توجہ ملنے سے محض بنیاد پرستوں کے غصے میں اضافہ ہی ہوا۔ ''انہوں نے ہمیں بدکردار کے علاوہ اب غدار بھی کہنا شروع کر دیا۔'' جلد ہی عورتیں کسی گاؤں میں جانے پر گالیاں کھائے بغیر واپس نہیں آ سکتی تھیں۔ یا پھر انہیں بالکل نظر انداز کر دیا جاتا، جو زیادہ بری بات تھی۔ ''حتیٰ کہ عورتیں بھی ہمیں باہر سے آئی ہوئی مخلوق سمجھنے لگیں جس کی کہی ہوئی کسی بھی بات کا ان سے کوئی تعلق واسطہ نہیں تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ ہم اپنی ثقافت کو جانتی ہیں، لیکن درحقیقت ہمیں اپنے دوستوں کے حلقے سے باہر کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ اب اگر آپ کسی عرب گاؤں میں جا کر لوگوں سے الفنار کے متعلق بات کریں تو وہ ہنس دیں گے۔ ہم مذاق بن کر رہ گئیں: بدکردار

عورتیں جو دنیا کے نظام میں تبدیلی لانے کا سوچ رہی تھیں۔‘‘

اس ناکامی نے گروپ کے اندر طریقہ کار اور حکمت عملی کے حوالے سے بحث مباحثہ شروع کر دیا اور انجام کار دھڑے بازی ہوگئی۔ الفنار اپنے قیام کے دو سال بعد بالکل ناکارہ ہو کر رہ گئی۔ تمام نے کہا، ’’معاشرہ تیار نہیں تھا۔ اور ہم خود بھی تیار نہیں تھیں۔‘‘

لیکن آخر انہوں نے کوشش تو کی۔ اور کم از کم نو آزاد شدہ ایریٹریا کی گھریلو عورتیں اسلامی تعلیمات کو مسخ کرنے کے ذریعے عورتوں کو پہنچائے جانے والے نقصان کا ازالہ کرنے کی کوشش تو کر رہی ہیں۔ بہت سے مسلمان یہ دعویٰ کرنے پر قانع ہیں کہ غیرت کے نام پر قتل اور کلائٹورس کاٹنا اسلام نہیں؛ کہ وہ رواج قومی ثقافتوں کے پیدا کردہ ہیں اور ان کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ اس دعوے کے ساتھ مرکزی دھارے کے بہت سے مسلمان دوہرے مظالم سے لاتعلق ہو جاتے ہیں جو تقریباً ایک چوتھائی مسلمان عورتوں کی زندگیوں کو متشکل کر رہے ہیں۔

یہ امر قابل فہم ہے کہ ترقی پسند مسلمان اپنے عقیدے کو ان دساتیر کے ساتھ منسلک کیا جانا بالکل پسند نہیں کرتے۔ لیکن کم قابل فہم امر یہ ہے کہ وہ ان دساتیر پر تنقید کرنے والوں پر غصہ کرتے ہیں نہ کہ جرائم پر۔ اس کی ایک مثال رانا کبانی کی کتاب ’’Letter to Christendom‘‘ میں ملتی ہے جو اس نے سلمان رشدی کے خلاف خمینی کے فتویٰ کے بعد اسلام پر ہونے والی تنقید کے جواب میں شائع کی تھی۔ مصنفہ دمشق میں پیدا ہوئی، لیکن بیرون ملک پلی بڑھی اور اب لندن میں رہتی ہے۔ اس کی شکایت تفصیل سے بیان کیے جانے کی حقدار ہے: ’’میں مسلمان عورتوں کی زندگیوں کے متعلق اہل مغرب کی غلط تفہیم سے ہمیشہ تکلیف کا شکار ہوتی ہوں۔ مغرب اکثر اپنی لاعلمی کے باعث اس نکتہ نظر کی سرپرستی کرتا ہے جس کے مطابق ہم لاچار مظلوم عورتیں ہیں، مگر وہ یہ نہیں دیکھ پاتا کہ ہمارا تعلق بالکل مختلف ثقافتوں سے ہے۔ حال ہی میں لندن میں میری ملاقات ایک ناول نگار سے ہوئی جو اپنی اگلی کتاب کے لیے ایک مسلمان کردار کے متعلق گفتگو کرنے آئی تھی۔ اس نے پوچھا، ’تم جیسی ایک نسوانیت پسند عورت اسلام کا دفاع کیسے کر سکتی ہے، جبکہ یہ عورتوں کے ختنوں کی حمایت کرتا ہے؟‘ اتفاق سے مَیں نے اُسی روز مؤرخ مرینا وارنر کی ایک تحریر پڑھی تھی جس میں اس نے اسلام کو کلائٹورس کاٹنے کے دستور پر عمل کرنے والا مذہب قرار دیا تھا۔ کیا یہ

دونوں مصنف خواتین یہ معلوم کرنے کی زحمت گوارا نہیں کر سکتی تھیں کہ کلائیٹورس کاٹنے کا رواج افریقہ کا ہے جس کا اسلام سے ہرگز کوئی تعلق نہیں؟''

کیا رانا کبانی یہ غور کرنے کی زحمت نہیں کر سکتی تھی کہ ہر پانچ مسلمان لڑکیوں میں سے ایک ایسی آبادی میں رہتی ہے جہاں کلائیٹورس کاٹنے کی اجازت ہے اور مقامی اسلامی رہنما اس کو جائز قرار دیتے ہیں؟ یا کیا وہ اسلامی کتب کے بہت سے نئے ایڈیشنوں میں (بالخصوص مصر میں) 'عورتوں کے ختنے' کے زیر عنوان ابواب نہیں پڑھ سکتی؟

جب تک رانا کبانی جیسی اسلام کی ترجمان خواتین اپنی مسلمان بہنوں کو اس طرح گمراہ کرتی رہیں گی، تب تک اسلام کا دامن کلائیٹورس کاٹنے اور غیرت کے نام پر قتل جیسے جرائم سے داغ دار رہے گا۔

ꕥ

تیسرا باب

دُلہنیں

رانا — رانا — ناٹ — ناٹ بوم بوم بوم! رانا — رانا — ناٹ — ناٹ بوم بوم بوم!

میں نے اپنے سر پہ ایک اور تکیہ رکھ لیا، لیکن کام نہ بنا۔ بستر کی چادروں کا ڈھیر ہٹا کر میں نے آنکھ کھولی اور سائیڈ ٹیبل پر رکھے ہوٹل کے ڈیجیٹل کلاک پر نظر ڈالی۔ رات کے 30 11 بجے تھے۔ آخر مزید ایک یا دو گھنٹے بعد شور تھما۔ مجھے فلائٹ لینے کے لیے صبح 5 بجے اٹھنا تھا۔ لیکن نیند ایک ناممکن خواب بن چکی تھی۔

میں بستر سے اٹھ کر کھڑکی تک گئی۔ نیچے گلی میں باراتوں کی وجہ سے ٹریفک جام تھی۔ میں نے آگے پیچھے کم از کم تین لیموزین کاریں گنیں۔ ایک کار میں سے دلہن ابھی ابھی نکلی تھی اور سست رفتار جلوس کی صورت میں ہوٹل کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ ارد گرد بینڈ والے تھے۔ بے خوابی کے عالم میں کی ہوئی گنتی کے مطابق وہ اُس رات نویں دلہن تھی۔

رانا — رانا — ناٹ — ناٹ بوم بوم بوم!

میں پہلی اور دوسری خلیجی جنگ کے مختصر وقفے کے دوران بغداد میں تھی۔ عراق میں شادی کے جلوس پر گرتے ہوئے بموں کا سلسلہ کسی بھی وقت دوبارہ شروع ہو سکتا تھا۔ صدام حسین نے عراقیوں کو حکم دیا تھا کہ وہ شادیاں کریں اور محاذ پر ہونے والا جانی نقصان پورا کرنے کے لیے

اولاد پیدا کریں۔ یہ مقصد حاصل کرنے کی خاطر اس نے امتناع حمل پر پابندی عائد کردی تھی اور شادیوں اور پیدائشوں کے لیے نقد تحائف پیش کیے تھے۔

نیند آنے کا کوئی امکان نہیں تھا، اس لیے میں نے پبلک لابی میں نیچے جانے اور تقریبات کو بہتر انداز میں دیکھنے کا فیصلہ کیا۔ ڈھول، جھانجیں اور باجے سو رہے مہمانوں اور پانچ تکیے پار کرکے بھی بہرہ کیے دے رہے تھے۔ تقریب کی مرکز نوجوان لڑکی سوہا کسی کار حادثے کا نشانہ بننے والے شخص کی طرح حواس باختہ اور لرزاہٹ کا شکار تھی۔ کسی شہزادی جیسے لباس میں سجی ہوئی وہ باجے والے کے درمیان چلتے ہوئے ایک ضیافتی ہال کی طرف جا رہی تھی جہاں کھانے کی میزیں اور ایک گلابی پھولوں سے بنا تخت لگا تھا۔ شاید اسی رات یا چند راتیں قبل دلہن کے باپ نے ایک اسلامی مذہبی نمائندے کے فراہم کردہ کپڑے کے ٹکڑے تلے اپنے ہاتھ رکھے تھے۔ لڑکی کے باپ نے دلہے سے کہا تھا: ''میں خدا اور اس کے پیغمبرؐ کی شریعت کے مطابق اپنی بالغ کنواری بیٹی سوہا تمہیں نکاح میں دیتا ہوں۔'' دلہے نے جواب دیا: ''میں خدا اور اس کے پیغمبرؐ کی شریعت کے مطابق تمہاری بالغ کنواری بیٹی سوہا کو نکاح میں قبول کرتا ہوں۔'' تب لڑکی کے باپ نے پوچھا ''کیا تم میری بیٹی کو قبول کرتے ہو؟'' جس پر دلہے نے جواب دیا، ''میں نے اسے قبول کیا۔'' باپ نے کہا، ''خدا اس پر اور تم پر رحمت نازل کرے،'' اور دلہے نے جواب دیا، ''مجھے خدا پر یقین ہے کہ وہ ایک رحمت ثابت ہوگی۔'' تب کمرے میں موجود سب لوگوں نے قرآن کی پہلی سورۃ پڑھی۔

جب دلہن شادی کے معاہدے یا عقد پر دستخط کر دے تو شادی قانونی بن جاتی ہے۔ عموماً اس معاہدے کا بنیادی مقصد یہ تحریر میں لانا ہوتا ہے کہ دلہا شادی پر دلہن کو کتنی رقم ادا کرے گا اور بعد ازاں طلاق کا فیصلہ کرنے کی صورت میں اسے کتنی رقم (حق مہر) دے گا۔ اسلامی عقد مغرب کے قبل از شادی معاہدے جیسا ہے، ایک درشت دستاویز جو اس حقیقت کا سامنا کرتا ہے کہ شادیاں ناکام ہوتی ہیں۔ ایک صحیح انداز میں لکھا ہوا عقد اسلامی عائلی قانون کی کچھ نابرابریوں کو دور کر سکتا ہے۔ یہ عورت کو کام کرنے، اپنی تعلیم جاری رکھنے اور خلع لینے کا حق بھی دے سکتا ہے۔ مثلاً آج بہت سی عورتیں ''اسما'' نامی ایک شق کا اضافہ کرتی ہیں جس کے تحت وہ طلاق دینے کا حق رکھتی ہیں۔ دیگر میں شرط عائد کی جاتی ہے کہ اگر شوہر نے دوسری شادی کی تو وہ طلاق دینے کی حقدار بن جائے گی۔

میں پنجوں کے بل اٹھ کر شور وغوغا مچاتی ہوئی عورتوں کے کندھوں کے اوپر سے دیکھتی رہی، جبکہ دلہا سامنے والے کمرے میں دلہن کے ساتھ بیٹھنے کے لیے آ رہا تھا۔ جب اس نے دلہن سوہا کا نقاب اٹھا کر ماتھے پر بوسہ دیا تو وہ شرما کر ہنس دی۔ یہ خاندان ضرور آزاد خیال ہوگا؛ بیشتر اسلامی شادیوں میں لوگوں کے سامنے ذرا بھی محبت نہیں دکھائی جاتی۔

ہال کی دوسری جانب ایک ابتدائی پارٹی شروع ہو چکی تھی۔ جب دلہا اور دلہن لفٹ میں سوار ہو کر ہوٹل کے ایک لگژری سویٹ کی جانب روانہ ہوئے تو مہمان ضیافتی کمرے سے باہر آ کر تالیاں بجانے لگے۔ جب دلہن کے گھر والے اسے نئے شوہر کے حوالے کر دیں تو اسے دلہن کا استقبال کرنے کے لیے اس کے جوتے اتارنا اور پاؤں دھونا ہوتے ہیں۔ یہ ایک اجنبی شخص کے پہلے لمس کی رکاوٹ عبور کرنے کا ایک زبردست طریقہ ہے۔ تب دلہا مندرجہ ذیل الفاظ میں دعا کرتا ہے۔ ''اے اللہ مجھے اس کی چاہت، محبت اور قبولیت عطا کر: اور میرا دل اس سے خوش کر، اور ہماری ازدواجی زندگی خوش وخرم اور ہم آہنگی سے بھرپور ہو' یقیناً تو جائز باتوں کو پسند اور ناجائز باتوں کو ناپسند فرماتا ہے۔'' جب دلہن دعا کر چکے تو دلہا اپنا ہاتھ اس کی پیشانی پہ رکھتا اور خدا سے درخواست کرتا ہے کہ ان کے ملاپ سے پیدا ہونے والے بچے کو شیطان سے محفوظ رکھے۔

اس حواس باختہ اور تھکے ماندے جوڑے کو ان تمام مراحل سے گزرتا ہوا تصور کرنا مشکل تھا۔ وہ دونوں شدید ذہنی دباؤ میں تھے۔ نوجوان کے لیے شادی جاری رہنے کا دارومدار اپنی مردانگی کا مظاہرہ کرنے پر تھا؛ اگر عضو کھڑا نہ ہو پاتا تو بیوی اسے تضحیک کا نشانہ بنا سکتی تھی۔ لڑکی اپنے کنوارے پن کا ثبوت دینے کے لیے دباؤ میں تھی۔ اگر اس کا خون نہ نکلا تو ہو سکتا ہے اسے واپس گھر بھیج دیا جاتا اور گھر والے اسے قتل بھی کر سکتے تھے۔ عورتیں پردۂ بکارت سلامت نہ ہونے کی صورت میں صدیوں سے اپنی اندامِ نہانی میں خون سے بھیگے اسفنج یا شیشوں کے ریزے ڈالتی آئی ہیں۔ اب صرف دور دراز دیہات کے کسان ہی دلہن کے خون والا کپڑا لوگوں کے سامنے نمائش پر رکھتے ہیں۔ لیکن سوہا کے ''ایک بالغ باکرہ'' ہونے کا معاملہ ابھی تک اہم تھا، حتیٰ کہ جدید شہری خاندانوں میں بھی۔

ہوٹل کے لابی منیجر نے تھک کر ایک ستون سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا، ''تقریباً وہ بھی اپنے بیگ میں ایک چادر چرا کر لے جاتی ہیں۔ ان کے پرانے رشتہ دار اب بھی خون آلود چادر دیکھنے پر

اصرار کرتے ہیں۔''ہوٹل کے تقریباً ایک تہائی کمرے نئے شادی شدہ جوڑوں نے بک کروا رکھے تھے۔'' آج رات ان کی ایک بڑی تعداد اوپر والے کمروں میں جائے گی۔''

میں حیران ہوئی کہ سب کچھ کیسے ہو رہا ہے۔ بہت سے جوڑے ایک دوسرے کے لیے قطعی اجنبی تھے، ان کی نجی زندگیاں بالکل الگ تھلگ تھیں۔ ایران کے ساتھ جنگ کے دوران جب عراقیوں کے بیرون ملک سفر پر پابندی لگائی گئی تو اندرون و بیرون ملک آنے جانے والی پروازوں پر عموماً ایک میں ہی عورت ہوتی تھی۔ قاہرہ جاتے ہوئے ایئر پورٹ پر میں عراقیوں کے لیے نہایت سخت سکیورٹی انسپکشن کے لیے مصری مزدوروں کے مجمعے میں کھڑی اپنی باری کا انتظار کرتی۔ ایک مرتبہ ایک نوجوان انسپکٹر نے میرے سینیٹری پیڈز والے تھیلے میں جھانکا اور ایک پیکٹ باہر نکال لیا۔ اس نے پیڈز کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر سپروائزر کو بلایا۔ دونوں آدمیوں نے بیگ کو کاؤنٹر پر اٹھایا اور مل کر غور کرتے رہے۔ آخر کار ایک نے پیڈز کو اوپر اٹھا کر روشنی میں جانچا۔ نوجوان انسپکٹر ملامت آمیز لہجے میں چلایا: ''یہ کس لیے ہے؟'' جب میں نے سمجھانے کی کوشش کی تو وہ حواس باختہ نظر آیا۔ اگرچہ وہ مذہبی کتب میں ''حیض کے مرض'' کا ذکر پڑھ چکا ہوگا، لیکن شاید کسی نے اسے بتایا نہیں تھا کہ عورت کی ماہواری کیا ہوتی ہے۔

بیسویں صدی تک زیادہ تر مسلمان عنفوانِ شباب کے فوراً بعد شادی کر لیتے تھے۔ اب شادی میں بلوغت کی ضرورت وسیع پیمانے پر تسلیم کر لینے اور شادیوں کے اخراجات بہت بڑھ جانے سے بیش تر نوجوان شادی کو پچیس تا پینتیس سال کی عمر تک مؤخر کرنے پر مجبور ہیں۔ کسی نیک مسلم لڑکی سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ شادی ہو جانے تک کسی اجنبی لڑکے کے ساتھ نظر بھی نہیں ملائے گی۔ ڈیٹ پر جانا یا بوسہ دینا تو درکنار، وہ کسی مرد سے ہاتھ بھی نہیں ملاتی۔

مصر جیسے ممالک میں، جہاں عورتوں کو دفتروں میں کام کرنا پڑتا ہے، نوجوان لوگ اپنے گھرانوں کو مطلع کرنے سے پہلے ممکنہ شریک حیات سے اکثر مل لیتے ہیں۔ لیکن بہت سے ملکوں میں شادیاں دو گھرانوں کے درمیان بات چیت کے ذریعے طے پاتی ہیں۔ سعودی عرب میں 1981ء میں ہی کہیں جا کر اسلامی علماء کی ایک کمیٹی نے قرار دیا کہ جوان لڑکی شادی سے قبل اپنے منگیتر سے بے نقاب ہو کر مل سکتی ہے۔ کمیٹی نے اعلان کیا: ''اپنی بیٹی یا بہن کو منگیتر کے ساتھ روبرو ملنے سے منع کرنے والا کوئی بھی شخص گناہ کا مستوجب قرار پائے گا۔'' لیکن کچھ سعودی عورتوں نے

اس چھوٹی سی رعایت کا بھی فائدہ نہ اٹھانے کی راہ اپنائی۔ ایک سکول کی 38 سالہ پرنسپل باسلہ المحمود اکیس سال کی تھی جب اس کے باپ نے ایک رشتہ آنے کے متعلق بتایا۔ اس نے کہا، ''کیا تم اس سے ملنا چاہتی ہو، کیا تم اس کے ساتھ بیٹھنا چاہتی ہو؟'' میں نے کہا، ''آپ اس سے مل لیں تو یہی کافی ہے۔'' اس نے اپنے شوہر کو بالائی کھڑکی سے پہلی مرتبہ اس وقت دیکھا جب وہ شادی کی رات کو وہاں آیا تھا۔ ''وہ اپنے کچھ رشتہ داروں کے ہمراہ گھر کے اندر داخل ہو رہا تھا۔ میری نظریں سیدھی اس پر پڑیں اور دعا کی کہ وہی میرا شوہر ہو۔'' باسلہ کو یقین تھا کہ اس نے اپنے باپ پر بھروسہ کر کے اچھا کیا۔ ''ان سے زیادہ میری خوشی کا خواہش مند کون ہوگا؟ مجھے ان سے بڑھ کر کون جانتا ہے؟ اس طریقے سے انجام پانے پر میری شادی صرف دو افراد کی نہیں۔ اس میں میرا اور میرے شوہر کا پورا خاندان شامل ہے۔ اور خاندانوں کے ملوث ہونے کے باعث میں 'کیا میں طلاق لے سکتی ہوں؟' کا سوال اٹھانے سے پہلے ایک ہزار مرتبہ سوچوں گی۔''

لیکن کچھ لڑکیاں اتنی خود اعتماد نہیں تھیں۔ تہران میں انگلش زبان کی اٹھارہ سالہ طالبہ Arezoo Morad an نے کہا، ''ہمارے لیے شادی ایک مکمل خطرہ ہے۔ شوہر کو آپ پر اس قدر اختیار حاصل ہوتا ہے کہ کسی قطعی اجنبی شخص سے شادی کرنا پاگل پن ہوتا ہے۔ لیکن ہمارے معاشرتی نظام کے تحت لڑکے کو اچھی طرح جاننا ممکن نہیں۔ آپ اس کے ساتھ باہر نہیں جا سکتے، آپ اس کے ساتھ اکیلے وقت نہیں گزار سکتے۔''

ایک مرتبہ شادی ہو جائے تو شوہر کی بات ہی قانون ہوتی ہے، جیسا کہ ''سعودی گزٹ'' میں مذہبی مفسر نے 9 جنوری 1993ء کے اخبار میں ایک خط کے جواب میں لکھا تھا۔ جدہ کی ایک خاتون نے نام نہ بتانے کی درخواست کرتے ہوئے لکھا، ''آج کل کی آزاد خیال دنیا میں اکثر یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ بیوی کو اپنے شوہر پر قطعی مساوی حقوق حاصل ہوں گے۔ میرے خیال میں اگر آپ بیوی کے موزوں رویے کی وضاحت کر دیں تو کافی ہوگا۔''

بے نام خاتون بلاشبہ توضیح سے خوش تھی۔ مفسر نے لکھا، ''خاندان کی سربراہی مرد کو سونپی گئی ہے۔ اگر عورت شوہر کے ساتھ مکمل اور کامل مساوات کا مطالبہ کرے تو ایک خاندان میں دو سربراہ بن جائیں گے اور اسلام میں ایسا نہیں ہے۔'' نیز، ''جب شوہر ہم بستری کرنے کا کہے تو عورت کا اسے انکار کرنا ایک سنگین غلطی ہے...... عورت کا ضرورت سے زیادہ گھر سے باہر نکلنا بری عادت

ہے۔ اگر شوہر کو اعتراض ہو تو اسے گھر سے باہر نہیں جانا چاہیے۔''

اگر یہ سب کچھ برداشت سے باہر ہو جائے اور بیوی اپنی بہتری کی خاطر طلاق حاصل کرنا چاہے تو یہ کام مشکلات سے بھرپور ہے۔

تکنیکی اعتبار سے بات کی جائے تو اسلام طلاق کو ناپسند کرتا ہے۔ ایک حدیث میں کہا گیا ہے کہ تمام جائز چیزوں میں سے طلاق خدا کے نزدیک مکروہ ترین ہے۔ شادی کو ختم کرنے کے لیے قرآن میں تقاضوں کی پوری ایک فہرست موجود ہے۔ مثلاً لڑکے اور لڑکی دونوں کے خاندانوں سے ثالث بلوانا تاکہ معاملات کو راہ راست پر لایا جا سکے۔ بہت سے ملکوں میں مسلم حکام نے اس امر پر کافی بحث مباحثہ کیا ہے کہ آیا ثالثی واجب ہے یا محض مسنون۔ ایک ناراض مسلمان دانشور محمد رشید رضا (جو 35ء میں اپنی وفات تک مسلم ممالک میں مغربی اقدار کی تجاوزات کے عقلی ردعمل کا نمائندہ تھا) نے لکھا: ''کسی نے بھی آگے بڑھ کر نہ پوچھا کہ آیا یہ واجب ہے یا محض مسنون۔ اس وضح حکم کے اطلاق کے لیے کوئی عملی اقدام نہیں کیے گئے۔'' اس نے اور عورتوں کے مسائل پر ایک بارسوخ ایرانی مفسر مرتضٰی مطہری نے طلاق سے متعلق قرآن کے پیش کردہ اصولوں کا دوبارہ مطالعہ شروع کیا۔

لیکن ابھی تک شیعہ اور چاروں سنی مکاتب فکر طلاق کے ایک طریقہ کار کو مقدس مانے ہوئے ہیں جو قرآن کی نہایت مسخ شدہ اور عورتوں سے نفرت پر مبنی عامیانہ تفسیر پر مبنی ہے یعنی شوہر کا اپنی بیوی کو تین مرتبہ ''میں تمہیں طلاق دیتا ہوں'' کہہ دینا۔ مسلمان عورت کو طلاق پر کوئی فطری حق حاصل نہیں، اور کچھ اسلامی ممالک میں طلاق حاصل کرنے کی کوئی محفوظ راہ بھی میسر نہیں۔ حنبلی مکتبہ فکر (جس پر سعودی لوگ عمل کرتے ہیں) عورت کو اپنے شوہر کی مرضی کے بغیر ناخوشگوار ازدواجی زندگی سے نکلنے کی کوئی راہ نہیں دیتا۔ شیعہ اور حنفی مکتبہ فکر کے سنی عقد میں عورت کو طلاق کا حق دینے کی گنجائش دیتے ہیں۔ شیعی، حنفی اور مالکی فقہ شوہر کی نامردی کی صورت میں عورت کو طلاق کی درخواست کا حقدار بناتے ہیں۔ اور شیعیوں اور مالکیوں کے ہاں کفالت میں ناکامی، ناقابل علاج مرض یا سنگین بدسلوکی طلاق لینے کی بنیاد بن سکتی ہیں۔

نوجوان ایرانی خاتون آرزو نے اپنے نقاب (magneh) سے باہر نکلے ہوئے بالوں کے چھلے اندر کرتے ہوئے کہا، ''میں آپ کو بتاتی ہوں۔ میرا خیال ہے کہ میں کبھی محبت میں گرفتار نہیں

ہوں گی۔ آپ جانتی ہیں کیوں؟ کیونکہ لڑکیاں محبت میں گرفتار ہونے پر اپنی قوت فیصلہ کھو بیٹھتی ہیں۔ جی ہاں، یقیناً وہ نکاح ناموں میں ہر قسم کی شرائط شامل کروا سکتی ہیں، لیکن ایسا کرتا کون ہے؟ ہمیشہ بات 'آہ، اسے مجھ سے محبت ہے، وہ مجھے کبھی دکھ نہیں دے گا' تک پہنچ کر ہی ختم ہو جاتی ہے۔ میں نے انہیں چہروں پر بے وقوف مسکراہٹ سجا کر زندگی کی سب سے بڑی بھول کرتے ہوئے دیکھا ہے۔"

بلاشبہ کچھ عورتوں کی خطا فائدہ مند ثابت ہوتی۔ مجھے معصوم مسرور تین جوڑے آج تک مجھے ملنے والے مسلمانوں میں سب سے زیادہ کٹر تھے۔ خدیجہ ایک نوجوان کویتی شیعہ لڑکی تھی جس کا رشتہ طے کر دیا گیا۔ اس نے منگیتر سے ملے بغیر ہی رشتہ قبول کر لیا تھا، بس اتنی سی شرط رکھی کہ شوہر اسے اپنی تعلیم جاری رکھنے کی اجازت دے گا۔ منگنی کے عرصہ میں دونوں نے چوری چھپے ملاقات کا اہتمام کیا اور ایک دوسرے کو پسند آئے۔

خدیجہ کا شوہر ایک امپورٹر تھا اور زیادہ تر کاروبار ایران کے ساتھ کیا کرتا تھا۔ جب وہ تہران جاتا تو ہمیشہ خدیجہ اور بچوں کو بھی ساتھ لے جاتا۔ ان کا رات کو تفریح منانے کا پروگرام تہران کے کسی حسینیہ میں جا کر کسی انقلابی ملا سے اسلامی انقلاب پر لیکچر سننا تھا۔ یقیناً وہ دونوں الگ الگ بیٹھتے　خدیجہ موٹے کالے نقاب میں دیگر عورتوں کے درمیان الگ کمرے میں بیٹھتی۔

کبھی کبھی میں خدیجہ سے ملنے اس کے ہوٹل کے کمرے میں جاتی اور وہاں اس کے شوہر کو بچوں کو بہلاتے ہوئے دیکھتی۔ خدیجہ دن کا وقت کسی اسلامی کالج برائے خواتین میں لیکچر سنتے ہوئے گزارتی تھی۔ ہوٹل کے کمرے میں فرش پر سفید چادریں بچھی ہوتیں تاکہ کھیلتے ہوئے بچے فرش کے قالین میں موجود جراثیم کا شکار نہ ہوں۔

جب خدیجہ نے لندن میں پوسٹ گریجوایشن کا فیصلہ کیا تو شوہر نے اس کے مطابق ہی اپنا کاروباری شیڈول ترتیب دے لیا۔ دونوں میاں بیوی کسی کے سامنے کبھی بھی باہمی محبت کا کوئی مظاہرہ نہیں کرتے تھے۔ لیکن ان کی نظروں میں ایک بجلی کی سی تڑپ اور گفتار میں کھنک محسوس ہوتی جس سے ان کے تعلق کی شدت عیاں ہو جاتی۔ میں نے خدیجہ سے پوچھا کہ اس کی شادی اس قدر کامیاب کیوں رہی جبکہ اتنے بہت سے تعلقات بے وزن دکھائی دیتے تھے۔ وہ مسکرا کر بولی:
''میرا شوہر ایک اچھا مسلمان ہے۔ وہ عورت اور مرد کے درمیان تعلقات کے بارے میں قرآن

کی تعلیمات سے بخوبی واقف ہے اور انہی کے مطابق زندگی گزارتا ہے۔ بس اتنی سی بات ہے۔"
مصر میں میری دوست سحر کی منگنی ہو گئی تھی۔

نقاب پہننا شروع کرنے کے چند ہفتے بعد وہ خوشی کی خبر لیے کام پر آئی۔ اپنے منگیتر کی تصویر مجھے دکھاتے وقت اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ وہ ایک پیڈیاٹریشن اور سحر کا سیکنڈ کزن تھا۔ تصویر میں ایک نوجوان، سنجیدہ اور خوبرو چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے ایک پکے مسلمان جیسی کالی ڈاڑھی رکھی ہوئی تھی۔

سحر اُسے برسوں سے جانتی اور خاندانی اجتماعات میں ملتی بھی رہی تھی۔ لیکن وہ اسے بطور شوہر نہیں سوچتی تھی۔ وہ یونیورسٹی میں پڑھنے کے دوران اسلامی گروپس میں سرگرم رہ چکا تھا اور ایک دور میں حکومت کے عتاب کا نشانہ بھی بنا۔ "میں ہمیشہ سے جانتی تھی کہ وہ ایک با نقاب لڑکی سے ہی شادی کرے گا،" سحر نے بتایا۔ ایک خاندانی پارٹی میں اسے نقاب میں دیکھنے کے بعد ہی اس نے رشتہ بھجوایا۔

بہت سے نوجوان مصری پروفیشنلز کی طرح سحر کے منگیتر کو بھی مصر میں اچھی تنخواہ والی ملازمت نہ ملی۔ اس کی بجائے وہ سعودی عرب میں ایک نوکری قبول کرنے پر تیار ہو گیا۔ اسے گھر چلانے کے قابل بننے کے لیے کئی ماہ تک وہاں کام کرنا پڑا۔ منگنی سے قبل ہارورڈ میں سحر کی درخواست داخلہ قبول ہو گئی تھی، وہ اس تاخیر سے فائدہ اٹھا کر گریجوایٹ سکول میں پڑھنے جا سکتی تھی۔ مگر وہ نہ گئی۔ سحر نے وضاحت کی کہ کسی سچی مسلمان عورت کے لیے امریکہ کے شہر میں اکیلا رہنا مناسب نہیں۔ اب وہ سعودی عرب کے کسی کالج میں اسلامک سٹڈیز میں داخلہ لینے کا سوچ رہی تھی۔

منگیتر کی سعودی عرب روانگی سے قبل سحر کے خاندان نے منگنی کی ایک شاندار تقریب منعقد کی۔ سحر پھولوں سے سجے ایک سٹیج پر بیٹھ گئی۔ اردگرد اُسے شوہر کی جانب سے بطور جہیز ملنے والے زیور پڑے تھے۔ اس نے بعد میں بتایا: "میری آنٹی چاہتی تھی کہ میں تقریب کے لیے حجاب اتار دوں۔ اس نے کہا کہ منگنی کے دن تم خوب صورت لگنا چاہو گی۔" سحر نے صاف انکار کر دیا اور سفید ساٹن کا سکارف پہنے پہنے ہی سٹیج پر بیٹھ گئی۔

لیکن جلد ہی محسوس ہونے لگا کہ سحر کے سکارف منگیتر کی نظر میں کافی نہیں تھے۔ سعودی عرب کے کٹر مذہبی ماحول میں پہنچنے کے چند ہفتے بعد ہی وہ فون پر سحر کو سمجھا رہا تھا کہ اپنے سب کو پیروں

تک لمبا کرلے اور جرابیں پہنا کرے۔" میں نے اسے بتایا کہ ابھی میں اس کے لیے تیار نہیں۔ میں نے اسے بتایا کہ آہستہ آہستہ یہ کرلوں گی، تاکہ مجھے معلوم ہو کہ کیا کررہی ہوں۔ میں نے عورتوں کو ایک دم دستانے اور نقاب کا استعمال شروع کرتے دیکھا ہے، لیکن وہ چند ماہ میں ہی قوت برداشت کھو بیٹھیں۔ میں ایسی چیز نہیں پہننا چاہتی جو کچھ عرصہ بعد اتار دینی ہو۔" کچھ ماہ گزرنے پر میں سوچنے لگی کہ آیا اس کا منگیتر بنیاد پرستی کی ایک اتنی تنگ گلی میں تو نہیں جارہا تھا جہاں سحر کا کشادہ ذہن، درست نقاب اوڑھنے کے باوجود، سمانہ سکے۔

دریں اثنا اپنے بے خم لباس کے نیچے وہ فربہ ہونے لگی۔ ہمارے اپارٹمنٹ کی عمارت میں ایلیویٹر اتنا قدیم تھا کہ مصری میوزیم سے آیا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ وہ جتنے دن ٹھیک رہتا، اتنے ہی دن خراب بھی رہتا۔ چھ منزلہ زینہ عبور کرنا سحر کے لیے ایک مشکل امتحان بننے لگا۔ وہ خوشگوار ترین صبحوں میں بھی پسینے سے شرابور اپنی کرسی پہ آگرتی اور مجھے ایئر کنڈیشنر آن کرنے کا کہتی۔ جب ہم رپورٹنگ کرنے باہر جاتیں تو اسے اپنے تہ دار لباس میں گرمی لگتی اور چلنے میں مشکل ہوتی۔ وہ جلد ہی اس قدر موٹی ہوگئی کہ ایک بلاک جتنا پیدل چلنے پر ہی ہانپنے لگتی۔ وہ میری آنکھوں کے سامنے بوڑھی ہو رہی تھی۔

سعودی عرب سے آنے والی کالز ہمیشہ بری خبر ہی لاتی تھیں۔ اس کے منگیتر کو ملازمت دینے والے میڈیکل سنٹر میں مریض نہیں آرہے تھے۔ اسے کچھ انتظار کرنا تھا، کیونکہ کاروبار بہتر ہونے کے بعد ہی شادی کی تاریخ مقرر کی جاسکتی تھی۔ کاروبار میں بہتری نہ آئی تو وہ ایک بہتر ملازمت تلاش کرنے لگا۔ لیکن مہینوں بعد بھی کوئی کامیابی نہ ہوئی۔

کچھ دیگر مایوسیوں کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ حجاب پہننا شروع کرنے سے چند ماہ قبل ایک روز سحر اپنی قریب ترین دوست کی شادی کی وڈیو مجھے دکھانے کے لیے لائی۔ یہ اصراف پسند مصری بالائی طبقے کی ایک مخصوص تقریب تھی جو Nile Hilton میں منعقد ہوئی۔ رقاص اپنے سروں پر شمعدان رکھے ہوئے چل رہے تھے، ڈھول و نفیری نواز دھنیں بجا رہے تھے۔ ہر کسی نے بھڑکیلا لباس پہن رکھا تھا۔ سحر نے مجھے بتایا کہ اس کی دوست نے اپنے بال بنوانے پر 60 پونڈ سول سرونٹ کی ایک ماہ کی تنخواہ خرچ کیے تھے۔ اس نے حیرت سے کھلے ہوئے منہ اور چمکتی آنکھوں کے ساتھ ٹیپ دیکھی۔ اس کے تاثرات دیکھ کر مجھے اپنی ایک پانچ سالہ بھانجی یاد آگئی جو اسی طرح

مجھ سے پری کہانیاں سنا کرتی تھی۔ مجھے یقین نہ آیا کہ یہ سنجیدہ، باروڈ جانے کو تیار لڑکی اس بھڑ کیلے پن کو پسند کر سکتی تھی۔لیکن اسے یہ سب کچھ پسند آیا۔اس نے کہا،''اللہ نے چاہا تو میری شادی بھی ایسی ہی ہوگی۔''

لیکن لگتا تھا کہ اللہ یا کم از کم اس کا الوہی منگیتر کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔منگیتر نے فیصلہ کیا کہ ان کی شادی کی تقریب مختصر اور سادہ ہوگی۔سحر نے بے یقینی سے کہا،''میرے خیال میں وہ ٹھیک کہتا ہے۔ان تمام بڑی بڑی تقریبات میں کوئی بھی شخص دلہن یا اس کے خاندان والوں کے متعلق اچھی بات نہیں کہتا۔اگر دلہن زیادہ خوب صورت نہ ہو تو وہ اس پر تنقید کرتے ہیں، اگر وہ بہت خوب صورت ہو تو شوٓف کرنے کا مرتکب ٹھہراتے ہیں۔سحر نے امید بھرے لہجے میں کہا:''سعودی عرب میں لباس کافی خوب صورت ہیں۔'' شاید ایسا ہو،لیکن میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکی کہ ایک بنیاد پرست شخص اپنی بیوی کے لیے کس قسم کی عبا منتخب کرے گا۔

میری مصری دوستوں میں سے کسی کو بھی جیون ساتھی آسانی سے نہیں ملا۔جیسے جدی سے جلدی شادی کرنے کی دوڑ لگی ہوئی تھی: بنیاد پرست جس نے اپنی شادی کم و بیش خود ہی طے کی تھی، یا میری نہایت غیر بنیاد پرست دوست جو اپنے لیے رشتہ ڈھونڈ رہی تھی۔اس کے عربی نام کا مطلب خوب صورت پھول بنتا تھا،لہٰذا میں اسے گُل ہی کہوں گی۔وہ غیر معمولی لڑکی تھی امیر، مغرب سے تعلیم یافتہ اہل قاہرہ کے درمیان بھی ایک کمیاب چیز۔تقریباً سبھی غیر شادی شدہ مصری لڑکیوں کی طرح وہ اپنے والدین کے ساتھ رہتی تھی، لیکن تمام نوجوان لڑکیوں کے برعکس وہ ایک ملازمت کرتی تھی جس کی وجہ سے اُسے بیرون ملک اکیلے جانا پڑتا تھا۔

اسی قسم کے ایک سفر کے دوران وہ پیرس میں مقیم ایک امریکی نوجوان کی محبت میں گرفتار ہو گئی۔جب میری ملاقات اُس سے ہوئی تو وہ سرتاپا عشق میں ڈوبی ہوئی تھی۔نوجوان نے اسے شادی کی پیش کش کی، لیکن اس نے مسترد کر دی۔اگرچہ سنی مسلمان مردوں کو اہل کتاب یعنی یہودی اور عیسائی لڑکیوں سے شادی کرنے کی اجازت دیتے ہیں، لیکن عورتوں کو یہ سہولت نہیں دی گئی۔ چونکہ اسلام پدرسری خطوط پر منتقل ہوتا ہے، اس لیے غیر مسلم باپوں کی اولاد عقیدے سے محروم ہو جاتی ہے۔گُل کے عاشق کا تعلق ایک بنیاد پرست عیسائی گھرانے سے تھا اور اس کا کہنا تھا کہ مذہب تبدیل کرنے سے اس کی ماں مر جائے گی۔گُل کو بھی یقین تھا کہ ایک عیسائی سے شادی کر

کے وہ اپنے گھر والوں سے بالکل کٹ جائے گی۔ اس نے وضاحت کی: ''میں گناہ کی زندگی گزاروں گی۔ اور میں خود بھی کسی مسلمان سے ہی شادی کرنا چاہتی ہوں۔ میں اپنے بیٹوں کا نام عمر یا عبداللہ رکھنا چاہتی ہوں۔ میری خواہش ہے کہ شیخ کے پاس جاؤں اور میری شادی کی تقریب میں رقاص اور ڈھول نواز موجود ہوں۔ میں کسی فرانسیسی بیوروکریٹ کے ساتھ چھوٹی سی بے رنگ سول تقریب نہیں منانا چاہتی۔''

مذہبی رکاوٹ نے انجام کارعشق کا خاتمہ کر دیا۔ گل شکستہ دل ہونے کے علاوہ مصری عورتوں والی خوفناک تشویش کا بھی شکار تھی اس کی عمر تیس سے اوپر ہو چکی تھی۔ ''میں اپنے والد کے پاس گئی اور کہا، 'ٹھیک ہے۔ میں ہار مانتی ہوں۔ آپ نے ہمیشہ میرا رشتہ طے کرنے کی کوشش کی ہے۔ سو دیکھتے ہیں کہ آپ کیا کر سکتے ہیں۔ رشتے لے آئیں۔'''

متمول، ذہین اور خوب صورت، عرب شاعروں کی سراہی ہوئی بڑی بڑی غزال آنکھوں والی گل کے پاس سبھی کچھ موجود تھا۔ اپنے وسیع خاندانی اور کاروباری روابط استعمال کرتے ہوئے اس کے والدین نے جلد ہی رشتوں کی ایک فہرست مرتب کی اور گل نے اس پر یوں نظر ڈالی جیسے پائلٹ روانگی سے قبل چیکنگ کرتا ہے۔ اس کی پہلی ملاقات ایک ڈاکٹر کے ساتھ ہوئی جو اپنے باپ کے ہمراہ اس کے گھر آیا اور سب نے مل کر چائے پی۔ ''میں نے اُس سے پوچھا کہ کیا وہ کبھی باہر کہیں گیا ہے تو اس نے سکندریہ اور اسماعیلیہ کا نام لیا۔ سکندریہ اور اسماعیلیہ! کوئی شخص 32 سال کی عمر کو پہنچنے کے باوجود مصر چھوڑے بغیر کیسے رہ سکتا ہے؟ اس کا گھرانہ امیر تھا؛ وہ کہیں بھی جا سکتا تھا۔ میں اس قدر بور آدمی کے ساتھ ہرگز خوش نہیں رہ سکتی تھی۔''

اس کے بعد اس نے گھر میں ملاقاتوں سے انکار کر دیا۔ ''پہلے پانچ منٹ میں میں بتا سکتی تھی کہ یہ بے تُکا تھا لیکن سب کے سامنے مجھے شرما کر بیٹھے رہنا پڑتا اور ساری دوپہر ضائع ہو جاتی۔'' اس نے آئندہ کسی بھی اُمیدوار سے ان کے دفاتر میں ملنے پر اصرار کیا۔ چند مایوس کن ملاقاتوں کے بعد اُس نے بتایا، ''وہ پہلا آدھا گھنٹہ بھی بہ مشکل نکال پائے۔''

ایک تاجر گھرانے کا نوجوان امیر بیٹا پہلے انٹرویو کی مار سہہ گیا اور لگتا تھا کہ پاس ہو جائے گا۔ حتیٰ کہ گل اس گھرانے کے ہمراہ تین ہفتے طویل چھٹیاں منانے لاس اینجلس بھی گئی۔ ''میں امریکہ کی محبت میں گرفتار ہو گئی،'' اس نے واپس آ کر بتایا۔ لیکن لڑکا اس کی محبت کا مستحق ثابت نہ ہوا۔

''مجھے اس کی خواہش پر ہر کام کرنا پڑتا تھا۔ جو فلم وہ دیکھ رہا ہوتا، اگر میں اسے پسند نہ کرتی تو معاملہ گڑبڑ ہو جاتا۔ اور اُسے میرا ڈرنک نہ کرنا پسند نہیں تھا۔ اس نے کہا کہ دن کے اختتام پر گھر واپسی پر وہ ایک بیئر پینا پسند کرتا ہے۔ میں نے کہا کہ میں کوک پی لیا کروں گی اور تم بیئر' کچھ وقت اس طریقے سے بھی ساتھ گزارا جا سکتا ہے۔ اس نے کہا، ہاں لیکن ہم بیئر تو ساتھ نہیں پی رہے ہوں گے۔ یہ نہایت مضحکہ خیز بات تھی۔''

مصری وزارت خارجہ میں ایک ممکنہ شوہر، ایک نوجوان سفیر بیرون ملک اپنی پہلی تعیناتی کی تیاریاں کر رہا تھا۔ گُل نے مختصر ملاقات کے بعد آہ بھر کر کہا، ''وہ بالکل موزوں ثابت ہوا۔ وہ بزلہ سنج اور نفیس تھا۔ لیکن اس کی انگلیوں کے ناخنوں میں مَیل تھی۔''

میں نے بے یقینی کے عالم میں کہا، ''گُل، کیا تم مجھے بتا رہی ہو کہ تم نے صرف اس لیے اُسے ٹھکرا دیا کیونکہ اس کی انگلیوں کے ناخن گندے تھے؟ خدا کا خوف کرو! تم اس کی انگلیوں کے ناخن خود صاف کر لیتی۔'' گُل نے سر اوپر اٹھایا، اپنی بڑی بڑی کالی کالی آنکھوں میں اداسی بھر کر میری جانب دیکھا اور بولی: ''جیرالڈین، تم سمجھی نہیں۔ آپ محبت کے لیے شادی کرتے ہو۔ اپنے محبوب کی انگلیوں کے گندے ناخن کیا کہیں گے؟ لیکن اگر آپ کسی ایسے شخص سے شادی کرنے جا رہے ہوں جس کے ساتھ آپ کو محبت نہیں، تو ہر چیز، ہر چیز کامل ہونی چاہیے۔''

☆ ☆

میں سوچنے لگی کہ کیا میری فلسطینی دوست رباب (Rehab) نے اپنی روایتی شادی سے کاملیت کا تقاضا کیا تھا۔ اگر ایسا تھا تو میں اس کی مایوسیوں کی گہرائیوں کا محض تصور ہی کر سکتی تھی۔

رباب یروشلم کے مغرب میں ایک پہاڑی پر رہتی تھی، ایک قدیم پتھر کے گھر میں جو اس کی مسجد کے مینار کے ذریعے زمین پر پن کیا ہوا لگتا تھا۔ وہاں پہنچنے کے لیے کوئی نصف درجن نئی یہودیوں بستیوں کی کرینوں اور بلڈوزروں میں سے گزرنا پڑتا تھا۔ قریب ترین کیبوتس (Kibbutz) وادی کے عین اُس پار تھی۔ اس کے جدید سبزی کے کھیت عربوں کے قدیم باغات کے کنارے کنارے تھے۔

مَیں جب بھی گاؤں گئی رباب اور محمد کو بلوایا۔ رباب ایک چھوٹی سی پرجوش لڑکی تھی جو بطور ہیئر ڈریسر کام کرتی اور گھر گھر جا کر گاؤں کی عورتوں کو شادیوں اور تہواروں کے لیے بنایا سنوارا

کرتی تھی۔ وہ گاؤں میں عورتوں کے متعلق ایک ایک بات کی خبر رکھتی۔ اس کا شوہر محمد ایک شوخ مزاج دکاندار، مضبوط جسم کا مالک، عضلاتی کلائیوں والا تھا جس کی نسواری آنکھیں مسکراتی رہتیں۔ وہ اپنی رنگ برنگی، ٹوٹی پھوٹی انگلش میں مزاحیہ باتیں کرنے کی کوشش کرتا رہتا۔ میں اکثر ان کے گھر گئی، دو مرتبہ ٹونی بھی میرے ہمراہ تھا۔ ہم اکٹھے کھانا کھاتے، ان کی چار سالہ بیٹی سے کھیلتے، ''آزادیٔ فلسطین چکن'' کے لیے ان کے تعمیر کردہ نئے پولٹری فارمز کو سراہتے جو انہیں اسرائیلی مرغیوں سے آزاد کرنے والے تھے۔

ٹونی کو اور مجھے فلسطینیوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ بزلہ سنج، صاف گو لوگ تھے اور ان میں مصریوں جیسے طبقاتی شعور اور خلیجی عربوں والی کم آمیزی کا فقدان تھا۔ جو چیز ہمیں بہت حیران کن معلوم ہوئی وہ عورتوں اور مردوں کا آزادانہ ملنا تھا۔ عورتیں اسرائیلی قبضے کے خلاف مظاہروں میں موجود ہوتیں، ہسپتالوں میں بیماروں کی دیکھ بھال کرتیں، گھر میں میز پہ بیٹھ کر غیر ملکیوں کے ساتھ مردوں جتنی ہی بلند آواز میں سیاست پر بحث مباحثہ کرتیں۔ محمد اور رباب کا مکان ہمیشہ دوست مردوں اور عورتوں سے بھرا نظر آتا۔ ٹونی اور مجھے بھی خوش آمدید کہا جاتا۔

موسم گرما کے اواخر میں ایک خوب صورت دن کو میں اکیلی گاؤں پہنچی اور چھوٹے سے بازار میں اس کی دکان پر ملی۔ وہ پریشان اور الجھا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اس نے کہا کہ وہ تب سے پریشان تھا جب میں پچھلی مرتبہ اسے ملنے آئی تھی۔ وہ مجھ سے ایک اہم بات پوچھنا چاہتا تھا۔

اسے دوسری بیوی کی ضرورت تھی۔ وہ گاؤں میں کسی پر بھی اپنے ارادے ظاہر نہیں کر سکتا تھا کیونکہ بیشتر فلسطینیوں کی طرح اس کے پڑوسی بھی کثیر الازدواجی کو پسماندگی خیال کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اگر رباب کو یہ بات معلوم ہوتی تو وہ دیوانی ہو جاتی۔ کیا میں کسی ایسی غیر ملکی خاتون کو جانتی ہوں جو اس کے ساتھ خفیہ شادی کر لے؟ کیا اُسے باہر جانے اور کوئی لڑکی ڈھونڈنے کے لیے ویزہ مل سکتا ہے؟

اس کے سوالات پر حیرت کے ساتھ میں نے نفی میں جواب دیا۔ میں کسی کو نہیں جانتی تھی، اور بیرون ملک مقیم کسی رشتہ دار کے بغیر ویزے ملنا مشکل تھا۔ محمد میرے جوابات پر ناراض نظر آیا۔

''کیا آپ سمجھتی ہیں کہ میں غریب آدمی ہوں؟ میں غریب نہیں ہوں!'' اس نے کہا اور کود کر باہر آیا، پھر میری بازو پکڑ کر گھسیٹتا ہوا کاؤنٹر کے پیچھے لے گیا۔ اس نے چیزوں کے متعدد ڈبے ہٹا کر

نیچے ہاتھ ڈالا اور سونے سے بھری ہوئی مٹھیاں باہر لایا۔ میں نے پہچان لیا: منقش چوڑیاں اور گلوبند جو خلیجی ریاستوں کے ہندوستان سناروں نے دلہنوں کے لیے بنائے تھے۔ یہ سب خالص سونا تھا، 22 یا 24 قیراط کیونکہ عرب خریدار اسی کا تقاضا کرتے تھے۔ ''میں یہ سب اسے دیدوں گا۔ بس میرا بیٹا ہونا چاہیے۔ بیٹی کی پیدائش کے وقت میری بیوی کا آپریشن ہوا اور اب وہ ماں نہیں بن سکتی۔ اس گاؤں میں بیٹے کے بغیر میں کچھ بھی نہیں۔'' اس کی آواز رندھ گئی۔ ''پلیز، آپ کو میری مدد کرنا ہوگی۔ کیا آپ میرے لیے ایک لڑکی ڈھونڈ دیں گی؟''

''تیری کوکھ سوکھ جائے!'' عربی کی بدترین بددعاؤں میں سے ایک ہے۔ یقیناً رہاب کو یہ بددعا لگ گئی تھی۔ محمد اپنے خاندان کی دولت میں سے بچت کیے بغیر یہ خزانہ ہرگز جمع نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے تصور کیا کہ ہر چھوٹی چھوٹی سہولت مہیا کرنے سے انکار کرتے وقت محمد نے کیا کیا جھوٹ بولے ہوں گے۔ زندگی کی آسائشوں سے چار سال تک محرومی: صرف بیٹی پیدا کرنے کی سزا۔

مجھے یاد آیا کہ میں نے کبھی بھی رہاب کی کنیت نہیں سنی تھی۔ عرب عورتیں شادی کے بعد اپنے شوہروں کا نام نہیں لیتیں، بلکہ مرد اور عورتیں دونوں اپنے پہلے بیٹے کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ لوگ انہیں ''اُمِ فارس'' یا ''ابوعزیز'' وغیرہ کے نام سے ہی بلاتے ہیں۔ بانجھ ہو چکی رہاب کی کنیت کبھی نہیں ہو سکتی تھی۔ محمد نئی بیوی سے بیٹا پیدا کر کے کنیت کا اعزاز حاصل کر سکتا تھا۔

مجھے حیرت ہوئی کہ مسلمان اپنے نبی (ﷺ) کی سنت کو بہت زیادہ اہمیت دینے کے باوجود بیٹیوں کا باپ بننے جیسی بنیادی چیز کو قابلِ تقلید نہیں سمجھتے تھے۔ ایک رائے کے مطابق حضرت محمدؐ کے ہاں تین یا چار بیٹے پیدا ہوئے دو یا تین حضرت خدیجہؓ اور ایک حضرت ماریہ قبطیہؓ کے بطن سے۔ ان میں سے کوئی بھی بیٹا کم سنی کی عمر سے آگے نہ جا سکا۔ اس کی بجائے حضرت محمدؐ نے چار بیٹیوں کی پرورش کی۔ ایک بیٹی حضرت فاطمۃ الزہرہ کو آپؐ نے اپنا حصہ قرار دیا۔ آپؐ نے فرمایا: جو اُسے دکھ پہنچاتا ہے، وہ مجھے دکھ پہنچاتا ہے، اور جو مجھے دکھ پہنچاتا ہے وہ خدا کو دکھ پہنچاتا ہے۔ آپؐ کے بعد زندہ رہنے والی اولاد میں سے بس ایک حضرت فاطمہ ہی تھیں۔

جب رہاب کے شوہر محمد نے سونے سے بھری ہوئی مٹھی میرے سامنے کی تو اس کے اشک بہنے ہی والے تھے۔ اُسے تسلی دینے کی خاطر میں نے ویزوں کے حوالے سے کچھ کہا۔ وہ فوراً جوش

سے بھر گیا اور مسکرا کر بولا،" زبردست۔ اب میں آپ کو ایک اور چیز دکھاتا ہوں!"

اس نے دکان کی بالائی منزل پر جانے کے لیے ایک خصوصی راستہ بنا رکھا تھا جہاں بیٹھ کر وہ گشت کرتے ہوئے اسرائیلی سپاہیوں کی جاسوسی کر سکتا تھا۔ میں سیڑھی چڑھ کر اوپر گئی اور اُس کے اس اصرار کا مذاق اُڑایا کہ باریک میٹرس پر اس کے ساتھ لیٹ جاؤں اور گلی کا واضح نظارہ دیکھوں۔ جب وہ بجلی کی تاروں کے درمیان ایک فلسطینی جھنڈے کی نشان دہی کرنے کے لیے میرے قریب لیٹا تو میں یکدم اٹھی اور سیڑھیاں اُتر کر نیچے آ گئی۔

اس کے پاس میرے آرٹیکل کے لیے ایک اور خبر بھی تھی۔ اس نے بتایا کہ اسرائیلیوں نے پانی پر پابندیاں عائد کی تھیں، لیکن دیہاتیوں نے گاؤں کی بیرونی حدود پر رومن عہد کے قدیم مرتبانوں کو دریافت کر کے ان کی پابندی کو زائل کر دیا تھا۔ محمد مجھے وہ قدیم مرتبان دکھانا چاہتا تھا۔ ہم اس کے زنگ آلود ٹرک میں بیٹھے اور گاؤں سے باہر گئے۔

مرتبان اچھی طرح چھپائے گئے تھے۔ جب میں پتھریلی زمین پر ڈگمگاتی ہوئی چل رہی تھی تو محمد مجھے سہارا دینے آگے آیا۔ اس نے اپنا ہاتھ میری ران پر مضبوطی سے رکھ دیا۔ میں نے سوچا کہ ایسا غلطی سے ہو گیا ہوگا۔ اُس نے قصداً اپنا ہاتھ وہاں نہیں رکھا ہوگا۔ کچھ کہے بغیر میں نے اس کی گرفت ڈھیلی کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اُس نے میرا ہاتھ پیچھے جھٹکا اور اپنے ہاتھ کی گرفت کرخت اور واضح انداز میں سخت کر لی۔ تب اس نے میرے بازو پکڑ کر مجھے ایک دم سینے سے لگا لیا، جیسے کوئی پہلوان جکڑتا ہے۔ اس کے بھاری جسم نے مجھے لڑکھڑاتے ہوئے پتھر کی قدیم دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ جب وہ میرے جسم کو سہلا رہا تھا تو اس کے بوجھ تلے سانس لینا بھی مشکل ہو گیا۔ مجھے چیخنے کے لیے بھی سانس نہ مل سکی۔ قریب کوئی شخص بھی نہیں تھا کہ جو میری آواز سنتا۔ ایک بازو چھڑا کر میں نے اسے مکے مارنے شروع کیے، لیکن وہ بالکل بے حس لگتا تھا۔ اس نے میری شرٹ کا کنارہ پکڑا اور پیٹ سے اوپر اٹھانے کی کوشش کی۔ پھر دوسرے ہاتھ سے میرے ٹراؤزرز کو نیچے کھینچا۔

"تمہیں دیکھنا ہوگا کہ انہوں نے میری بیوی کے ساتھ کیا کیا یہاں بالکل یہاں انہوں نے اس کو چیر لگایا اتنا بدصورت کہ میں دیکھ نہیں سکتا۔ میں اس قسم کے جسم کے ساتھ مجامعت نہیں کرنا چاہتا۔"

اچانک پتھروں کی کھڑکھڑاہٹ سن کر محمد نے اوپر دیکھا۔ بھیڑوں کی خالی نظریں نیچے دیکھ

رہی تھیں۔ ایک ریوڑ آہستہ آہستہ وہاں سے گزر رہا تھا۔ اس کے پیچھے کہیں گاؤں کا ایک لڑکا بھی ہو گا۔ محمد نہیں چاہتا تھا کہ وہ یہ منظر دیکھے۔ جب اُس نے اپنی گرفت ڈھیلی کی تو میں گرتی پڑتی پہاڑی کے اوپر سڑک کی جانب بھاگی۔ مَیں پھر کبھی محمد سے نہ ملی۔

معلوم نہیں کہ محمد دوسری شادی کر پایا کہ نہیں۔ لیکن چند میل دور ایک فلسطینی پناہ گزین کیمپ میں میری جان پہچان ایک ایسے گھرانے سے ہوئی جس کے مرد نے یہی راہ اپنائی اور پہلی بیوی کے گھر میں دوسری بیوی لے آیا۔

ان سے میری پہلی ملاقات 1987ء کے موسم سرما میں ہوئی، جب فلسطینی تحریک آزادی کو شروع ہوئے چند ہفتے ہی ہوئے تھے۔ میں ایک شدید برفیلی بارش میں ڈرائیو کر رہی تھی کہ کنکریٹ کا ایک ٹکڑا میری کار کے بڈ سے آٹکرایا اور ونڈ شیلڈ پر باریک ریزے اُڑ کر لگے۔ کار تارکول والی گیلی سڑک پر پھسلی اور ایک قدیم صنوبر کے چوڑے تنے سے کچھ انچ دور رُک گئی۔ پیچھے دیکھنے والے آئینے میں مجھے سرخ رنگ کی ایک جھلک نظر آئی۔ سرخ چیک والے کیفیہ اوڑھے ہوئے لڑکوں کا ایک ٹولہ ملبے کے ایک ڈھیر پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں اپنی کار سے باہر نکل کر اُن کی جانب بھاگی۔ انہوں نے مجھے مسلح اسرائیلی سمجھا اور ہراساں پرندوں کی طرح منتشر ہو گئے۔ میں نے عربی میں کہا، ''پلیز، میرے پاس پستول نہیں ہے۔ میں ایک صحافی ہوں اور تمہارے ساتھ بات کرنا چاہتی ہوں۔''

ایک لڑکا ملبے کے ڈھیر پر دوبارہ سامنے آیا اور بالکل ٹھیک انگلش میں بولا: ''Get out of here! اس کیمپ کے لوگ تمہیں مار ڈالیں گے!''

مَیں اپنی جگہ پر کھڑی رہی اور اس سے انٹرویو دینے کو کہا۔ اس نے کہا ''مَیں بہت مصروف ہوں،'' اور گزرتے ہوئے ٹرک کی نمبر پلیٹ پر نظر ڈالی تاکہ پتا چلا سکے کہ وہ پیلی اسرائیلی یا نیلی فلسطینی ہے۔ ''اور اگر مَیں ایک مرتبہ شروع ہو گیا تو رکوں گا نہیں۔'' پیلی نمبر پلیٹ والی ایک فیئٹ کار قریب آئی تو وہ گھوڑے کی طرح پیچھے گھوما اور کنکریٹ کا ایک ٹکڑا اس کی ونڈ شیلڈ پر مارا۔ نشانہ خطا گیا۔ اُس نے کہا، ''آج کا دن میرے لیے اچھا نہیں۔ آج کسی بھی کار کو نقصان نہیں پہنچا سکا۔''

فوج کے سائرن کی قریب آتی ہوئی آواز نے اشارہ دیا کہ آج معاملات مزید خراب ہوں

گئے۔ وہ اپنے تین ساتھیوں کو بلند آواز میں ہدایات دیتا ہوا واپس مڑا اور کیمپ میں بھاگ گیا۔ اُس نے اپنا کیفیہ مضبوطی سے منہ پر لپیٹ رکھا تھا تا کہ کیمپ میں موجود کوئی جاسوس اُسے پہچان نہ سکے۔ میں مُڑی اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کیمپ کی مرکزی گلی کی جانب گئی۔ مجھے اپنے پیچھے ہلچل کی آواز سنائی دی کیونکہ ایک اسرائیلی جیپ وہاں آ کر رکی تھی اور سپاہی اتر کر کیمپ کے مدخل پر پوزیشنیں سنبھال رہے تھے۔ چند بلاک گزر کر مجھے ایک نیم مسمار شدہ عمارت کی کھڑکی میں سرخ رنگ کی جھلک دکھائی دی۔ یہ وہی لڑکا تھا۔ اُس نے اپنے ہونٹوں پہ انگلی رکھ کر مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

ملبے پر لڑکھڑاتے ہوئے ہم پچھلی راہداریوں میں گئے اور کنکریٹ کی دیوار میں نصب بہت بڑے دھاتی دروازے پر پہنچے۔ چار نسوانی ہاتھوں نے اسے کالر سے پکڑ کر اندر گھسیٹا، فوراً اُس کی جیکٹ اور ٹی شرٹ اتاری اور جلدی جلدی دوسرے کپڑے پہنائے۔ ''کہیں کوئی دیکھ نہ لے،'' اس نے وضاحت کی، اور پھر دونوں میں سے چھوٹی عورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا، ''یہ میری ماں رحمے ہے۔'' پھر وہ دوسری عورت کی جانب مڑا اور کہا، ''یہ فاتن ہے، یہ بھی میری ماں ہے۔ ویسے یہ میری ماں نہیں۔ مجھے اس کے لیے انگریزی کا لفظ معلوم نہیں... لیکن اس کی..... شادی میرے باپ کے ساتھ ماں کے بعد ہوئی۔''

''درّا؟'' میں نے کہا۔ شریک بیوی۔ اس عربی لفظ کا مطلب ''ضرر رسانی'' بنتا ہے۔

''ہاں، شریک بیوی،'' لڑکے نے کہا۔

پندرہ سالہ رعد (Raed) چودہ بچوں میں سب سے بڑا تھا۔ چونکہ اسرائیلی حکام نے سکول بند کر دیے تھے، اس لیے وہ سب اُس بارش کے دن گھر پر ہی تھے؛ چار کمروں پر مشتمل گھٹیا سے گھر میں ٹھونسے ہوئے۔ کنکریٹ کے ننگے فرش میں سے ٹھنڈ رِس رہی تھی اور دراڑوں والی چھت سے بارش کا پانی ٹپک رہا تھا۔ زیادہ تر بچوں کی ناک بہہ رہی تھی۔ اگلے چھ برس کے دوران میں کئی مرتبہ اس گھر میں گئی، کبھی کبھی زمین پہ بچھے پتلے سے میٹرس پر رحمے فاتن اور رعد کی بہنوں کے درمیان دب کر رات گزاری۔ رعد اور اس کے بھائی دوسرے کمرے میں اپنے باپ محمود کے ساتھ سوتے۔ مکان میں بچوں کی تعداد کے پیشِ نظر سونے کے انتظامات ہمیشہ سے اتنے خراب نہیں تھے۔ اتنے گنجان گھر میں ذاتی گفتگو ناممکن ہونے کی وجہ سے مَیں رحمے یا فاتن کے ساتھ اس قسم کے حساس

موضوع پر بات نہیں چھیڑ سکتی تھی۔ میں نے اُسی علاقے میں رہنے والی ایک قریبی دوست سے پوچھا کہ اس قسم کے حالات میں لوگ سیکس کیسے کرتے تھے۔ اس کی بتائی ہوئی تفصیل پریشان کن تھی ''اگر کُل تین کمرے ہوں تو ایک کمرے میں عورتیں، دوسرے میں لڑکے، جبکہ تیسرے میں شوہر اور بیوی (جس سے وہ مباشرت کرنا چاہتا ہو) چلے جاتے ہیں۔ لیکن کیمپ کے کچھ گھروں میں تین کمرے نہیں ہوتے، اور جنسی عمل ایک کونے میں جلدی جلدی اور خاموشی سے انجام پاتا ہے، یہ امید کرتے ہوئے کہ بچوں کی آنکھ نہیں کھلے گی۔ یقیناً شوہر اور بیوی دونوں میں سے کوئی بھی ننگا نہیں ہوتا۔''

میں تحریک سے متعلق لکھنے کے لیے کیمپ میں گئی تھی۔ لیکن جلد ہی مجھے رحمے اور فاتن کی کہانی میں زیادہ دلچسپی ہونے لگی۔ جب بھی میں ان سے ملنے جاتی تو مجھے دوسری بیوی کی آمد کے متعلق ایک بربری لوک گیت یاد آجاتا:

اجنبی عورت آئی ہے؛ مکان میں اس کی اپنی جگہ ہے۔
اس کے جسم پر بنے ہوئے نقوش ہمارے جیسے نہیں،
لیکن وہ جوان اور خوب صورت ہے، جیسی اُس کا شوہر چاہتا تھا'
راتیں اتنی لمبی نہیں کہ وہ ایک دوسرے سے لطف اندوز ہو سکیں.....
اُس کے آنے کے بعد گھر پہلے جیسا نہیں رہا،
لگتا ہے جیسے گھر کی دہلیزیں اور دیواریں غصے میں تھرتھرا رہی ہوں'
شاید صرف میں نے ہی اس چیز پر غور کیا ہے،
اپنی خالی ناند کے سامنے کھڑے ایک خچر کی طرح۔
لیکن مجھے اپنی نئی قسمت کو تسلیم کرنا ہوگا،
کیونکہ میرا شوہر اپنی نئی بیوی کے ساتھ خوش ہے۔
کبھی میں بھی خوبصورت تھی، لیکن میرا وقت بیت چکا ہے۔

کسی بیرونی شخص کی نظر میں رحمے اور فاتن کا تعلق اس دلگیر گیت کے ساتھ بہت کم مماثلت کا حامل ہوگا۔ دونوں عورتیں دشمنوں کی بجائے پُرمحبت بہنوں جیسی لگتی تھی۔ اگر فاتن کھانا پکاتی تو

رحمے کپڑے سیتی۔ اگر رحمے روٹی پکاتی تو فاتن بچوں کو سنبھالتی۔ آخر کار جب رعد اسرائیلی سپاہیوں پر ایک Molotoc کاک ٹیل پھینکنے کے جرم میں پکڑا گیا تو اس کی ماں رحمے کی بجائے فاتن ہی عدالت میں اس کی صفائی پیش کرنے گئی۔ اور جب محمود بھی معمول کی سکیورٹی کارروائی کے دوران جیل گیا تو دونوں عورتوں نے مل کر اس کی رہائی تک طویل چھ ماہ گزارے۔ وہاں گزارے ہوئے سارے وقت کے دوران مجھے ان کی آپس میں ایک تلخ کلامی بھی سننے کو نہ ملی۔

یہ رعد تھا جس نے مجھے گہرائی میں دیکھنا سکھایا۔ اس نے تحریک میں اپنے کردار کی وجہ سے پانچ سال جیل میں گزارے۔ فروری 1993ء میں رہا ہونے پر پندرہ سالہ غصیلے نوجوان (جس نے میری کار پر کنکریٹ کا ٹکڑا مارا تھا) کی جگہ سنجیدہ بیس سالہ نوجوان نے لے لی تھی جس نے اپنی رہائی کی خوشی مغربی کنارے کی پتھریلی پہاڑیوں پر طویل چہل قدمی کرتے ہوئے منائی۔ ایک مرتبہ چہل قدمی کے دوران وہ ایک خاتون سے بات کرنے کے لیے چند منٹ رکا جسے وہ تھوڑا بہت جانتا تھا۔ جب ہم واپس پلٹے تو اس نے کہا، ''اس کی زندگی بڑی کرب ناک ہے۔'' پھر اس نے مجھے عورت کی ناخوشگوار ازدواجی زندگی کی کہانی سنائی۔ شوہر نے اسے چھوڑ دیا اور میکے واپس جانے پر بچے پیچھے اپنے باپ کے پاس ہی رہ گئے۔ رعد نے غیر متوقع طور پر اضافہ کیا: ''یہ میری ماں کی کہانی ہے، ماسوائے انجام کے۔''

رحمے کی کہانی اُردن میں شروع ہوئی۔ 1972ء میں رعد کی دادی اپنی بیٹی کے ہمراہ وہاں پہنچی جس کا رشتہ عمان میں ایک عزیز سے طے پایا تھا۔ اُردن میں دادی نے سرخ گالوں والی راسخ الایمان لڑکی رحمے کو دیکھا جو اپنے چھوٹے قد وقامت کے باعث دیکھنے میں حقیقی سترہ سالہ عمر سے کافی کم لگتی تھی۔ وہ لڑکی کو اپنے ساتھ گھر لائی اور اپنے پندرہ سالہ بیٹے محمود کی دلہن بنا دیا۔

''پندرہ سال کی عمر میں اسے کیا معلوم ہوگا؟ کچھ بھی نہیں۔ باپ کے لیے وہ بس ایک اچھی لڑکی تھی۔ لیکن وہ اُسے محبت کیسے کر سکتا تھا۔ وہ تو اُسے جانتا تک نہیں تھا،'' رعد نے کہا۔

ایک سال کے اندر اندر رعد پیدا ہو گیا۔ اس کا بھائی مراد ڈیڑھ سال بعد دنیا میں آیا، اور تین سال بعد دو بہنیں۔ رحمے چوتھے حمل سے گزر رہی تھی کہ اس نے مجبوراً اس حقیقت کا سامنا کیا جس کے متعلق سارا کیمپ باتیں کر رہا تھا۔ محمود اٹھارہ سالہ حسینہ فاتن کی زلف کا اسیر ہو گیا تھا جو کچھ ہی عرصہ پہلے اپنے رشتہ داروں کے ہمراہ کیمپ میں آئی تھی۔

دونوں عورتیں زیادہ مختلف نہیں ہو سکتی تھیں۔ رحمے شرمیلی اور پرہیزگار، جبکہ فاتن صاف گو اور سیاسی مزاج کی حامل تھی۔ رحمے خاموش اور گھٹی گھٹی رہتی، جبکہ فاتن ہنسی کھیلتی اور خود کو منواتی۔ لگتا تھا کہ دراز قد اور بھڑکیلی فاتن نے ننھی مُنی رحمے کو گہنا دیا تھا۔ انجام کار محمود وہ خبر لے کر گھر آیا جس کا رحمے کو ہر دم دھڑ کا لگا رہتا تھا۔ اُس نے فاتن کا ہاتھ مانگ لیا تھا، اور اُمید تھی کہ وہ مان جائے گی۔ محمود نے کہا کہ رحمے اگر چاہے تو طلاق لے سکتی ہے۔

رحمے جانتی تھی کہ طلاق لینے کا مطلب مغربی کنارے کو چھوڑ کر اردن میں اپنے اہل خانہ کے پاس واپس جانا ہوگا۔ کچھ حوالوں سے اُسے راحت ملتی۔ نوجوان محمود چھ سال کے دوران تیز مزاج مرد بن گیا تھا جو کبھی کبھی اُسے اور رعد دونوں کو مارتا پیٹتا۔ کم سن رعد کرخت حوصلے کا مظاہرہ کرنے لگا تھا۔ اس کی واحد بیوی بن کر رہنا کافی دشوار کام تھا۔ وہ اپنے شوہر کی محبوبہ کی ماتحت بننے سے بڑی ذلت کا تصور بہ مشکل ہی کر سکتی تھی۔

لیکن جب اُس نے محمود کی طرف نظر اٹھا کر جواب دیا تو وہ اس کی توقع ہرگز نہیں کر رہا تھا۔ رحمے دھیمے لہجے میں بولی: ''میں طلاق نہیں لینا چاہتی۔'' اسلامی قانون کے تحت طلاق کا مطلب تھا کہ اس کے بچے محمود اور اُس کی نئی بیوی کے پاس ہی رہیں گے۔ رحمے نے کہا، ''میں اپنے کنبے کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ کیا تم مجھے اس کی اجازت دو گے؟''

محمود بد مزاج اور خود غرض تھا، لیکن وہ اتنا ظالم نہیں تھا کہ رحمے کو اس کے بچوں سے محروم کر دے۔ اس نے کہا کہ اگر رحمے وہیں رہنا چاہتی ہے تو وہ اُس کی کفالت کرنے کو تیار ہے۔ لیکن اُسے محض برائے نام اس کی بیوی بن کر رہنا ہوگا۔ اگرچہ قرآن میں ارشاد ہے کہ مرد کو اپنی تمام بیویوں سے مساوی سلوک کرنا چاہیے، لیکن محمود نے واضح کر دیا کہ صرف اور صرف فاتن ہی اس کی جنسی دلچسپی کا مرکز ہے۔ وہیں رہنے کی راہ منتخب کرنے کے باعث 23 سالہ رحمے ایک پرہجوم مکان میں تجرد کی زندگی منتخب کر رہی تھی ایک ایسی عورت کے پہلو میں جس کے لیے اُس کا شوہر زبردست شہوانی کشش محسوس کرتا تھا۔ محمود نے صاف صاف بتا دیا کہ اگر دونوں عورتوں کے درمیان تعلق خراب ہوا تو سارا قصور رحمے کا ہوگا۔

رحمے نے اپنے آنسو پی لیے اور محمود کی شرائط قبول کر لیں۔ چند ہفتے بعد اُس نے اپنا بہترین کشیدہ کاری والا لباس نکالا اور شوہر کی شادی میں ڈھول کی تھاپ پر رقص کیا۔

جب ہم گھر واپس آئیں تو مجھے اچانک ہر چیز بدلی بدلی نظر آئی۔ رحمے ایک کونے میں ظہر کی نماز پڑھ رہی تھی، جبکہ فاتن محمود کے ساتھ بیٹھی دیوانہ وار ہنس رہی تھی۔ فاتن گیارہویں بچے کی ماں بننے والی تھی محمود کے احساس تفاخر سے لبریز۔

رعد نے نئی ماں کو جد قبول نہ کیا۔ چونکہ تعمیراتی جگہوں پر اُس کے باپ کی مصروفیت بے تواتر تھی، اس لیے رعد کنبے کی کفالت کے لیے روزانہ چودہ گھنٹے ایک جوتا فیکٹری میں کام کرتا۔ وہ غصے میں پھنکارا، ''یہ حماقت ہے! وہ اپنے پیدا کیے ہوئے بچوں کا پیٹ نہیں پال سکتا، اور مزید بچے پیدا کرتا جا رہا ہے۔''

1987ء میں جب مَیں پہلی مرتبہ فاتن سے ملی تو وہ کمرے کے ایک کونے میں بیٹھی نومولود بچے کو دودھ پلا رہی تھی۔ مَیں رعد کے ساتھ انتفضہ کے متعلق بات چیت کرتی رہی۔ اس نے صرف ایک مرتبہ مداخلت کی، جب رعد کی انگلش لفظ ''peace'' پر ڈگمگا گئی۔ میں نے رعد سے پوچھا تھا کہ کیا کیمپ میں موجود فلسطینی اسرائیل کے ساتھ امن قائم کرنے کو تیار تھے۔ اسے peace کا مفہوم سمجھنے میں دشواری ہوئی تو میں نے عربی لفظ ''سلام'' بولا۔ فاتن زور سے چلائی: ''اسلام'' یعنی ''امن نہیں۔ کیمپ کے لوگ جنگ چاہتے ہیں!'' تب میں نے سوچا کہ فاتن اختلاف رائے رکھنے والے کسی بھی شخص کے ساتھ بہت سختی سے پیش آتی ہوگی۔

فاتن کی پے در پے زچگیوں نے اسے اس کے حسن و تازگی سے محروم کر دیا۔ اس نے مجھے اپنے منہ میں سے نکلے ہوئے دانتوں کی خالی جگہ دکھائی۔ تاہم، یہ اپنے شوہر کی منظور نظر رہنے کے لیے اس کی قبول کردہ قیمت تھی اور رحمے پر امتیاز کی نشانی بھی۔

رعد نے کہا، ''میری ماں صرف ہمارا انتظار کر رہی ہے۔ جونہی میری بہنوں کی سکول کی تعلیم مکمل ہوئی اور میں ان کی کفالت کرنے کے قابل ہو گیا تو ماں کو یہ سب کچھ مزید نہیں سہنا پڑے گا۔''

البتہ میں سوچنے لگی کہ کیا خاندان میں اس قدر باہم مربوط رشتوں کو آسانی سے توڑا جا سکتا ہے۔ رعد نے خود کہا تھا کہ وہ اپنے سگے اور سوتیلے بہن بھائیوں میں کوئی فرق نہیں کرتا۔ وہ ان سب سے محبت کرتا اور ان سب کو اپنے باپ کے خراب رویے سے بچانے کے لیے ذمہ دار محسوس کرتا تھا۔ فاتن کے بارے میں اس کے خیالات بھی ژولیدہ تھے۔ اس نے کہا، ''میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ مجھے اُس عورت سے نفرت ہے۔ لیکن میں صرف اس لیے اُس سے نفرت کرتا ہوں کیونکہ وہ

میری ماں کے دکھ کا باعث بنی۔"

ایک نادر نجی لمحے میں مَیں نے رحمے سے اُس کے احساسات دریافت کیے۔ اس کے گلاب چہرے پر ایک مسحور کن مسکراہٹ پھیل گئی۔ اُس نے میرے ہاتھ اپنے کٹے پھٹے اور کام کے باعث سخت ہو چکے ہاتھوں میں لیے اور سرگوشی کی: "انشاء اللہ۔" تب وہ وضو کرنے گئی اور نماز پڑھنے لگی۔ گھر کی زندگی اس کے گرد غیر محسوس طور پر چکر کھاتی رہی۔ چند لمحوں بعد اس نے سجدہ کیا اور اپنی پیشانی فرش پر لگائی۔

آخر اس کا مذہب اسلام اطاعت کا مذہب تھا۔ لگتا تھا کہ اسلام کے اصول رحمے سے بہت کچھ تسلیم کرنے کا تقاضا کرتے تھے۔

چوتھا باب

نومسلم

طلوع آفتاب کے وقت، حرارت دھرتی پر اترنے اور ہوا ڈیزل کے دھوئیں سے بوجھل ہونے سے قبل، تہران تازہ پکی ہوئی روٹی کی خوشبو سے مہکتا ہے۔ پڑوس کی بیکریوں میں عورتیں اپنی پھولوں والی چادریں لیے قطار بنائے کھڑی ہوتی ہیں۔ ان کے چہرے اس سے کم تھکے ہوئے لگتے ہیں جتنے کہ تھوڑی دیر بعد لگنے والے ہوتے ہیں جب پر ہجوم شہر اور بچوں کی مصروفیات اور غریب ممالک میں نسوانی پریشانیاں ان پر غلبہ پالیتی ہیں۔ اس وقفے میں انہیں کسی اور کو محنت کرتے ہوئے دیکھنے کی مختصر راحت ملتی۔

کبھی کبھی جب میں ہالہ ہوٹل میں اقامت گزیں واحد عورت ہونے کی وجہ سے گھورتی نگاہوں اور سوالات سے تنگ آجاتی تو شمالی بستی کی طرف چلی جاتی تاکہ ایک گھرانے کے ساتھ کچھ وقت گزار سکوں جس کے ساتھ اچھی خاصی دوستی ہوگئی تھی۔ وہ مسجدوں، دکانوں، اور ہر قسم کے بنگلوں والی بل کھاتی سڑک پر رہتے تھے۔ صبح کے وقت میں ناک کی سیدھ میں قریبی بیکری تک جاتی۔ ہوا میں پکتے ہوئے میدے اور لکڑی کے دھوئیں کی ملی جلی خوشبو رچی ہوتی۔ بیکری کے اندر چار آدمیوں کی ایک ٹیم پیڑے بنانے اور روٹیاں پکانے میں مصروف ہوتی۔ نانبائی ٹشو جیسی نرم روٹی کی پتلی اور چپٹی شیٹس بناتے جنہیں لوش کہا جاتا تھا۔ وہ کرتب سازوں جیسے لگتے ایک لڑکا

پیڑا پھینکتا، دوسرا اسے بیلتا، تیسرا چھڑیوں پہ گھما کر پھیلاتا اور چوتھا تنور کی دیوار پر لگاتا۔ دیگر عورتوں کو دیکھ دیکھ کر میں نے اپنی چادر کے پلو میں گرم گرم روٹی پکڑنا سیکھ لیا۔ میں اُسے لے کر ماموو زاہد کی ناشتے کی میز پر پہنچاتی۔

اسلامی دنیا میں دیگر مقامات کے مکانات کی طرح ماموو زاہد کا مکان بھی عین گلی پر واقع تھا۔ اس کا بڑا سا لوہے کا گیٹ باہر کی دنیا پر مکمل بند ہو جاتا اور اندرون خانہ زندگی کو خفیہ رکھتا۔ گیٹ ایک کیری میں کھلتا تھا جہاں بچوں کی سائیکلیں پڑی ہوتیں اور شہتوت کا ایک درخت بھی موجود تھا جس سے جینٹ ماموو زاہد ایک مزیدار جیم تیار کرتی۔ میں سامنے والے دروازے پر اپنے جوتے اتارتی اور ہاتھ سے بُنے ہوئے نمدوں کی نرماہٹ پر قدم رکھتی۔ اندر پہنچتے ہی میں اپنی چادر ایک ریک پر رکھ دیتی جہاں دوپٹا، سکارف اور کوٹ بھی لٹکے ہوتے جو جینٹ عام طور پر پہنتی تھی۔ وہ اپنی بیٹی کے گریڈ سکول میں بطور استانی ملازمت کرتی تھی۔

جینٹ کا شوہر محمد بازار بزرگ میں ایک تاجر تھا۔ وہ فارسی قالینوں اور غیر ملکی کرنسیوں کا کاروبار کرتا تھا۔ جینٹ سے اُس کی ملاقات پنس برگ کنساس کے کالج میں ہوئی جہاں محمد انجینئرنگ اور وہ کمپیوٹر سائنس کی تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ جینٹ اس پر فریفتہ ہوگئی، اسلام قبول کیا اور ساتھ ہی ایران چلی آئی۔

جینٹ نے اسلامی انقلاب سے پہلے محمد کے ساتھ شادی کی تھی جب غیر مسلموں کا اپنے شوہر کے ہمراہ ایران میں رہنا ممکن تھا۔ آج کل تبدیلی مذہب لازمی ہے کیونکہ شیعی نکتہ نظر کے مطابق مستقل شادی صرف دو مسلمانوں کے درمیان ہی ہو سکتی ہے۔ اس معاملے میں سنت قرآنی آیات کی خاطر خواہ وضاحت نہیں کرتی۔ (مصنفہ نے یہاں صفیہ بنت ابی سفیان، لونڈی ریحانہ اور حضرت ماریہ قبطیہؓ کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ان تین خواتین کے ساتھ آپ ؐ کا تعلق ازدواجی قواعد سے باہر ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ مسلم نکتہ نظر کے مطابق مثلاً حضرت ماریہ قبطیہ آپؐ کی لونڈی تھیں اور بعد میں وحی آنے پر آپؐ نے ان سے باقاعدہ نکاح کیا۔ البتہ مصنفہ کے خیال میں مصری کتب کے سوا تمام ذرائع میں یہی کہا گیا ہے کہ حضرت ماریہؓ نے کبھی بھی اپنا مذہب تبدیل نہیں کیا تھا۔ مترجم) جینٹ نے اس لیے اسلام قبول کر لیا کیونکہ اس کا شوہر اپنے بچوں کی پرورش بطور مسلمان کرنا چاہتا تھا اور جینٹ کو یقین تھا کہ ایک ہی مذہب کی پیروی کرنے سے گھر کا ماحول

زیادہ ہم آہنگ ہو جائے گا۔ تبدیلی مذہب اس کی نظر میں ایک امر واقعی تھا۔ ''اللہ اور خدا ایک ہی ہستی کے دو نام ہیں نا؟ اگر آپ قرآن پڑھیں تو میری اور یسوع وہاں بھی موجود ہیں بس انہیں حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ کہا جاتا ہے۔''

جینٹ کا قبولِ اسلام ایک سادہ سا معاملہ تھا۔ کنساس میں اپنے خاندانی رہائشی گھر میں اس نے دو گواہوں کے سامنے کلمہ شہادت پڑھا۔ شوہر ایک شیعہ ہونے کی وجہ سے اسے کلمے میں حضرت علیؓ کے حوالے سے ایک جملے کا اضافہ کرنا پڑا۔ کلمہ پڑھتے ساتھ ہی وہ مسلمان ہو گئی۔ ایک اچھی مسلمان بننے کے لیے اسے دیگر چار ارکان دین کے مطابق زندگی گزارنا تھی: پنجگانہ نماز، صیام رمضان، زکوٰۃ کل جائیداد یا دولت پر 2.5 فیصد سالانہ کے حساب سے اور (اگر استطاعت ہو تو) زندگی میں کم از کم ایک مرتبہ حج بیت اللہ۔

جینٹ کا فیصلہ میرے لیے نہایت دلچسپ تھا۔ 1984ء کے موسم سرما میں ایک صبح کو میں نے بھی اسی طرح کا فیصلہ کیا تھا۔ میں کلیولینڈ کی ایک بستی کے ٹھنڈے کمرے میں گئی، بارش کے پانی سے بھرے ایک تالاب میں ڈبکی لگائی اور باہر آتے ہوئے کہا: ''سنو، اے اسرائیل، خداوند میرا خدا ایک ہے۔'' بعدازاں میں نے اپنے ربی اور منگیتر کے ساتھ قریبی یہودی ریسٹورنٹ میں جشن منایا۔

میری تبدیلی مذہب کا تعلق ایمان سے زیادہ تاریخ کے ساتھ تھا۔ اگر مجھے ایک یہودی کے ساتھ شادی کرنا تھی تو خود کو اس کی اکثر معتوب برادری کی قسمت کا ساجھے دار بنا لینا اہم معلوم ہوا۔ تب میں یہ نہیں جانتی تھی کہ مجھے اپنی زندگی کے اگلے عشرے کا ایک بڑا حصہ مشرق وسطیٰ میں گزارنا ہوگا جہاں اپنے شوہر کی ہم مذہب ہونے کی وجہ سے میں اپنے اردگرد رہنے والے زیادہ تر لوگوں کی نظر میں خود بخود دشمن بن جاتی۔

جینٹ بھی اپنے شوہر کی ہم مذہب ہونا چاہتی تھی۔ لیکن 70ء کی دہائی کے اواخر کے ایران میں اس کی قومیت ایک ایسی رکاوٹ تھی جسے اس کا نیا مذہب پوری طرح عبور نہیں کر سکتا تھا۔ ''کنساس سٹی کی کسی دلہن کے لیے تہران میں گھر بسانے کا وہ زمانہ اچھا نہیں تھا'' اس نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔ اس کی آمد کے کوئی دو مہینے بعد ہی شہر احتجاجی مظاہروں، آتش زنی اور فائرنگ کی وجہ سے مفلوج ہو کر رہ گیا۔ 1979ء میں جب خمینی جلاوطنی سے واپس آیا تو محمد بہت خوش تھا۔ متعدد نوجوان پڑھے لکھے ایرانیوں کی طرح وہ بھی پرانے نظام کی بدعنوانی کو بہ نظر حقارت دیکھتا اور عظیم

طاقتوں کے سامنے خمینی کی جرأت کا مداح تھا۔

جینٹ کو خاندانی محفلوں میں بیٹھ کر اپنے شوہر کو امریکہ کے خلاف تقریریں کرتے ہوئے سننا پڑا۔ اپنی فارسی بہتر ہونے پر وہ انہیں چیلنج کرنے لگی۔ ''وہ کہتے، 'اوہ جینٹ، تم جانتی ہو کہ ہمیں امریکہ کے لوگ پسند ہیں، لیکن اس کی حکومت سے ہم نفرت کرتے ہیں۔' میں کہتی، 'اچھا؟ یہ بات ہے تو میرے ملک میں عوام ہی حکومت ہیں۔' ''

جب ایرانی طلبا نے 1979ء میں تہران میں امریکی سفارت خانے پر قبضہ کیا تو محکمہ خارجہ نے تمام امریکہ باشندوں کو ایران چھوڑ دینے کا کہا۔ جینٹ نے ہزاروں امریکیوں کو شہر سے خروج کرتے دیکھا جنہوں نے کبھی وہاں کافی دولت کمائی تھی۔ جلد ہی صرف مٹھی بھر امریکی باقی رہ گئے۔ ان میں سے زیادہ تر ایرانیوں کی بیویاں تھیں۔ ''محکمہ خارجہ نے کہا کہ اگر ہم ایران میں ہی رہے تو انجام کے ذمہ دار خود ہوں گے۔ اور ہم نے اپنی ذمہ داری خود اٹھائی۔ لیکن اگر آپ کو اپنے شوہر سے محبت ہو تو اسے چھوڑ کر نہیں جاتے۔''

آہستہ آہستہ جینٹ کو ایران میں اپنی زندگی کے کئی پہلوؤں سے محبت بھی ہوگئی۔ اس نے دیکھا کہ ایرانی لوگ پیچھے رہ جانے والے چند ایک امریکیوں سے محبت کرتے تھے۔ کچھ ایرانیوں کے دل میں امریکی استادوں اور ٹیکنیشنوں کے متعلق بڑی پرجوش یادیں تھیں جنہوں نے ان کے ملک کو مدد دی۔ جبکہ کچھ دیگر کے خیال میں جینٹ جیسے کچھ امریکی شہری ایران کے ساتھ مل گئے تھے۔ اس نے ہر جگہ اپنے لیے دشمنی اور حقارت کی بجائے محبت پائی اسے راشن لینے کی قطاروں میں آگے کر دیا جاتا، بہترین گوشت دیا جاتا، اور ہر ممکنہ طریقے سے مدد کی جاتی۔ اس نے کہا ''یہاں وہ میرے ساتھ ملکہ جیسا سلوک کرتے ہیں۔''

لیکن کنساس سٹی میں رہنے والے اپنے والدین کو قائل کرنا نہایت مشکل تھا، بالخصوص بیٹی محمودی کی کتاب ''Not Without My Daughter'' کی اشاعت کے بعد۔ یہ کتاب ایک امریکی بیوی کی خوف ناک کہانی سناتی ہے جو تہران میں اپنے شوہر کے خاندان سے ملنے پر رضامند ہوگئی، لیکن خود کو ایرانی قوانین میں گھرا ہوا پایا جس میں عورتوں کو شوہر کی اجازت کے بغیر ملک چھوڑ کر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ یہ ایران میں زندگی کی ایک نہایت تاریک تصویر ہے جس میں بیوی کو مار پیٹ، غلیظ گھروں اور کیڑوں بھرے کھانوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

''میرا باپ فون کرتا اور کہتا، 'مجھے پتا ہے کہ محمود تمہیں مارتا پیٹتا ہے،' اور میں کہتی، 'ڈیڈ، وہ مجھے اُس سے زیادہ نہیں مارتا جتنا آپ نے مارا ہے۔' حتیٰ کہ میں نے اپنے فریزر کی تصاویر بھی اتار کر بھیجیں تا کہ باپ کو دکھا سکوں کہ میرے پاس کتنا کھانا موجود ہے۔'' اس نے اپنے کشادہ بنگلے کی آسائشیں بیان کرنے کی کوشش کی، روزانہ صفائی والی کی خدمات میسر ہونے کے متعلق بھی بتایا، نیز یہ کہ اس کے تینوں بچوں کو علاج معالجے کی سہولت آسانی سے حاصل تھی۔ یہ زندگی بہت سے امریکیوں کی نظر میں قابلِ رشک تھی۔ لیکن والدین کو کسی طرح بھی تسلی نہ ہوئی۔ چنانچہ وہ اس امید میں مجھے ملنے پر بھی رضامند ہوئی کہ شاید ایک بیرونی خاتون کی رپورٹ پر انہیں یقین آ جائے۔ اس کی کیلی فورنیا سے تعلق رکھنے والی ایک دوست نے بھی ایرانی آدمی سے شادی کر رکھی تھی۔ جینٹ نے اسے بھی مجھ سے ملنے کے لیے بلوا لیا۔

جب جینٹ نے اپنی سہیلی کی آمد پر دروازہ کھولا تو دم بخود رہ گئی۔ اس ہفتے خمینی کی تجہیز و تکفین ہوئی تھی اور سارا تہران کالی چادروں میں لپٹا ہوا تھا۔ عوامی عمارات پر کالے علم لہرا رہے تھے، مردوں نے کالی قمیصیں پہن رکھی تھیں، عورتوں نے اپنے رنگین سکارف چالیس دن کے لیے سنبھال کر کالی چادریں اوڑھ لی تھیں۔ اس ساری افسردگی کے درمیان میں جینٹ کی دوست خانقاہ میں کسی مسخرے کی طرح کھڑی تھی۔ چھ فٹ لمبی اور حمل کے ساتویں ماہ میں اس نے ایک بڑا سا سوتی جبہ پہن رکھا تھا جس پر گلابی اور سرخ پھولوں کی بیلیں کاڑھی ہوئی تھیں۔ ایک گلابی ریشمی سکارف اس کے دھوپ جلے بالوں کو بہ مشکل ڈھانپے ہوئے تھا۔

''یا خدا۔ امید ہے کہ حاجی یوسف کی نظر تم پہ نہیں پڑی ہو گی!'' جینٹ نے سنسناتی آواز میں پڑوسی کا ذکر کیا جو مقامی کمیٹی برائے نفاذ اسلامی نظام کا رکن تھا۔ عورت (جسے میں مارگریٹ کہوں گی) نے بس کندھے اُچکائے اور ایک آرم چیئر پر دراز ہو گئی۔ وہ بولی، ''کسے پروا ہے؟ یہاں آتے ہوئے راستے میں ایک عورت پرانا سا تھیلہ لیے چادر اوڑھے میرے پاس آئی اور کہنے لگی، 'تم اس قسم کا لباس کیسے پہن سکتی ہو؟ کیا تم نہیں جانتی کہ امام فوت ہو گئے ہیں؟' میں نے کہا، 'تو میں کیا کروں؟ میں امریکی ہوں۔ میں نے اسے بتایا کہ مجھے زیادہ طور پر معلوم ہے کہ قرآن میں عورتوں کے لباس کے بارے میں کیا ہدایت کی گئی، اور کہیں بھی یہ نہیں کہا گیا کہ ایک بڑا سا کالا چیتھڑا اوڑھنا لازمی ہے۔''

مارگریٹ جانتی تھی کہ قرآن کیا کہتا ہے، کیونکہ وہ ہر صبح آلتی پالتی مار کر اپنی ساس کے پاس بیٹھتی اور حرف بہ حرف قرآن پڑھتی تھی۔ مارگریٹ نے اسلامی جمہوریہ کے طبقہ اشراف کی ایک ممتاز شخصیت سے شادی کی تھی۔ اس کا شوہر ممتاز آیۃ اللہ شخصیات کے سلسلے سے تعلق رکھتا تھا۔ خاندان نے لڑکے کی پسند کو برداشت کیا کیونکہ مارگریٹ نے دو کام کر کے منظوری حاصل کر لی تھی: قبول اسلام اور فوراً حاملہ ہونا۔ ساس کو اچھی طرح یقین تھا کہ ایک شخص کو اسلام میں داخل کرنا بہشت میں جانے کی سند تھا۔ اس کے کسی بھی بیٹے کے ہاں اولاد نہیں ہوئی تھی، لہٰذا وہ مارگریٹ کے حمل سے بہت زیادہ امیدیں رکھتی تھی۔

مارگریٹ نے صاف صاف لفظوں میں یہ بھی بتایا کہ وہ جنسی لحاظ سے اپنے شوہر پر کس قدر قادر تھی۔ کیلی فورنیا کی شہوت پسندانہ ساحلی ثقافت میں پرورش پانے کے باعث اس نے ایسی جنسی شہرت حاصل کی کہ مذہبی پیشواؤں کے زیر سایہ رہنے والا کوئی ایرانی نوجوان اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ''وہ پلے کی طرح میرے پیچھے بھاگتا ہے۔'' مارگریٹ ہنس کر بولی۔ اسے یقین تھا کہ یہ سب کچھ اسے ایرانی معاشرے کے آہنی ضوابط سے بچائے ہوئے تھا جس کے متعلق جینٹ سوال اٹھانے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ تہران میں تمام سرکاری عمارات پر پہریدار خواتین تعینات تھیں جو لباس کے اسلامی ضوابط پر سختی سے عملدرآمد کرواتیں، اور حال ہی میں مارگریٹ کو لپ سٹک لگانے کی بنیاد پر پوسٹ آفس کے دروازے سے واپس کر دیا گیا تھا۔ ''میں نے ٹشو پیپر مانگا اور اس نے 'یہ رہا تمہارا ٹشو پیپر' کہہ کر میرے منہ پہ چانٹا رسید کر دیا۔'' مارگریٹ نے اپنے گھر والوں سے شکایت کی اور انہوں نے گارڈ کو معزول کروا دیا۔

جینٹ کے گھر میں ہماری ملاقات سے چند روز بعد میں نے دونوں خواتین کو شہر میں لنچ پر بلایا۔ مارگریٹ نے اپنی پسندیدہ جگہ منتخب کی، ایک سابقہ فرانسیسی ریسٹورنٹ جس میں کپڑے کے میز پوش اور سرخ کرسیاں تھیں۔ ریسٹورنٹ کے ویٹروں نے اسے یوں خوش آمدید کہا جیسے وہ ان کی طویل عرصے سے بچھڑی ہوئی بہن ہو۔ ایک ویٹر نے مارگریٹ کے شوخ لباس کی تعریف کرتے ہوئے پوچھا کہ اس کی دو سہیلیاں اتنا سادہ سا حجاب کیوں پہنے ہوئے تھیں۔ مارگریٹ نے فارسی میں تڑاخ سے کچھ کہا۔ ویٹر ایک دم بوکھلا سا گیا اور پھر ہنس دیا۔ مارگریٹ نے ہمیں بتایا، ''میں نے اس سے کہا ہے کہ you were ass kissers۔''

لیکن مارگریٹ نے بھی حدود کو جان لیا تھا۔ ایک مرتبہ اس کی بے ادبی حد سے بڑھ گئی۔ وہ اپنی گلی کے آخر میں دیوار پر امریکہ کے خلاف لکھے ایک نعرے کی وجہ سے کافی غصے میں تھی۔ ایک رات کو اس نے پینٹ کا ڈبہ لیا اور حروف میں اس طرح ترمیم کر دی کہ تحریر ایرانی حکومت کے ہی خلاف ہو گئی۔ دن چڑھنے پر اس ترمیم شدہ نعرے نے سراسیمگی کی لہر دوڑا دی اور مجرم کی تلاش شروع ہوئی۔ اپنی پیدا کردہ دیوانگی پر خوش مارگریٹ نے چپکے سے شوہر کو بتا دیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ یہ بات مذاق میں لے گا۔ ''مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ اس قدر غصے میں بھی آ سکتا ہے،'' مارگریٹ نے بتایا۔ شوہر غضب ناک انداز میں اس پر چلایا اور اسے پاگل عورت قرار دیا۔ ''کیا تم مرنا چاہتی ہو؟ کچھ باتیں ایسی بھی ہیں جن سے میں تمہیں نہیں بچا سکتا۔'' انجام کار کوئی بھی اصل مجرم کی شناخت نہ کر سکا۔

جینٹ کی دوستی میرے لیے ایران میں عورتوں کی زندگی میں جھانکنے کا ایک ذریعہ تھی۔ محمد کے وسیع خاندان میں امیر اور غریب، کٹر اہل ایمان اور متشکک سبھی شامل تھے۔ میں جب بھی شہر جاتی، یہ واضح ہو جاتا کہ میں خاندان کی تمام مصروفیات میں شامل ہوں گی۔

میرے بے یہودی بنا دستور ایک تجرید تھا: ایک ایسی چیز جس نے میری شادی کی نوعیت کا تعین کیا، اور بعد ازاں پاس اوور کے موقع پر سالانہ خاندانی ضیافت، یوم کپر پر ایک روزہ، کرسمس کے دنوں میں کچھ اجنبی پن اور مشرق وسطیٰ کے ممالک کے لیے ویزا فارم پُر کرنا کافی تھا۔ لیکن جینٹ کی زندگی کا ہر معمول مذہب تھا۔

ماموزادہ خاندان میں کوئی بھی شخص غیر مذہبی زندگی نہیں گزارتا تھا۔ محمد کی ماں صبح سورج چڑھنے سے پہلے اٹھ کر نماز کی تیاری کرتی۔ محمد اور جینٹ نماز کے اتنے پابند نہیں تھے، لیکن جینٹ تک نے کہا کہ وہ اپنی ساس کے ساتھ نماز پڑھنے کے لحات میں مسرت محسوس کرتی ہے۔ اس نے بتایا: ''یہ ہمارے دن کے نہایت پُرسکون لحات ہوتے۔ اگر بچے آواز دیں یا کوئی شخص دروازے پر دستک دے تو بس اونچی آواز میں ''اللہ'' کہہ کر اسے بتا دیتے ہیں کہ آپ نماز پڑھ رہے ہیں۔ کوئی بھی مداخلت نہیں کرتا۔''

جینٹ اور اس کی ساس نماز پڑھنے سے پہلے وضو کرتیں۔ ایران میں لوگوں کو نیل پالش لگانے

کی اجازت نہیں، کیونکہ ہاتھوں کو نماز کے لیے صاف ہونا چاہیے۔ ایئرپورٹ پر غیر ملکی عورتوں کو بھی پٹرول میں بھیگے ہوئے کپڑے دیے جاتے ہیں تاکہ وہ نیل پالش اتار دیں۔ لیکن نماز کے وقت خوشبو لگانے کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ چنانچہ جینٹ اور اس کی ساس اپنے کپڑوں پر عطر چھڑکتیں، اپنی بہترین کشیدہ کاری والی چادریں لیتیں، جائے نماز بچھاتیں اور نماز شروع کر دیتیں۔ مردوں کے لیے اتنی بلند آواز میں نماز پڑھنا ضروری ہے کہ قریب کھڑا کوئی شخص لفظوں کو سن سکے۔ عورتیں بس سرگوشی ہی کرتی ہیں کیونکہ ان کی آواز کو شہوانی لحاظ سے باعث انگیخت خیال کیا جاتا ہے۔

محمد ہر سال لاٹری میں اپنا نام درج کرواتا جس کے ذریعے حج پر جانے والے خوش نصیبوں کو منتخب کیا جاتا تھا۔ حج کے موقع پر لاکھوں مسلمان خانہ کعبہ کے گرد جمع ہوتے اور احرام باندھتے ہیں۔ ایرانیوں کا سیاسی رنگ میں رنگا ہوا مذہبی نکتہ نظر سعودیوں کو پسند نہیں، اس لیے سعودی عرب نے ہر سال ایرانی زائرین کے لیے ایک مخصوص کوٹہ مقرر کر رکھا ہے۔ آخر کار، 1993ء میں محمد کے نام کا قرعہ نکل آیا۔ اس نے اپنی ماں اور بہن کو بھی ایک ماہ طویل زیارت پر ساتھ لیجانے کا منصوبہ بنایا۔ لیکن جینٹ نے فرائض حج کا مطالعہ کرنے کے بعد نہ جانے کا فیصلہ کیا۔ اس نے کہا، ''حج محض کعبہ کا طواف کرنے اور میدان عرفات میں اپنے گناہوں کی معافی مانگنے کا نام نہیں۔'' اسے پتا چلا کہ زائرین کو جنسی فعل سے اجتناب کرنا پڑتا ہے۔ ''حتیٰ کہ شہوت انگیز خیالات بھی آپ کے حج کو بے قدر بنا دیتے ہیں۔'' اس کے علاوہ ذہن میں کوئی برے خیالات بھی نہیں آنے چاہئیں۔ ''میں خود کو روحانی لحاظ سے ابھی اتنا مستحکم نہیں سمجھتی۔'' اس نے محمد کی بہن کو اپنی جگہ پیش کیا جو خوشی خوشی تیاری کے لیے ایک خصوصی حج کورس کرنے لگی۔

ماموں زادوں کی زندگی کے تقریباً ہر ہفتے میں کوئی نہ کوئی مذہبی رسم ضرور ہوتی تھی؛ مثلاً پیدائش، منگنی، شادی یا جنازہ۔ ایک مرتبہ اس کے ساتھ ہفتہ بھر قیام کے دوران دو نہایت مختلف اموات کے ذریعے مجھے ایرانی زندگی کے متعلق بہت کچھ معلوم ہوا۔

محمد کے ننھیال میں کوئی نوے سالہ بوڑھی خاتون مر گئی۔ ہم سب اکٹھے شب ہفت (ساتویں رات) کے لیے روانہ ہوئے یہ رات بھر جاری رہنے والی سوگ کی ایک رسم ہے جو موت کے

ایک ہفتے بعد منعقد کی جاتی ہے۔ متوفی کے بچوں اور ان کی اولادوں اور ان کی اولادوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ اچھا خاصا بڑا گھر بھی کم پڑ گیا۔ مہمانوں کو پڑوس کے ایک گھر میں ٹھہرانا پڑا۔ دونوں گھروں پر کالے پرچم لگائے گئے تھے، صحنوں میں قالین بچھا کر ان پر تکیے رکھے گئے اور روشنی کا انتظام بھی کیا گیا۔ محمد نے کار پارک کی اور ہم باہر نکلے۔ محمد پڑوس کے دیگر مردوں کے ہمراہ ساتھ والے ایک گھر میں چلا گیا۔ عموماً کسی اجتماع کے موقع پر پڑوسی مردوں کے لیے اپنے گھر میں جگہ دے دیتے ہیں کیونکہ عورتیں اور بچے کافی گڑبڑ پھیلاتے ہیں۔ جینٹ اور میں عورتوں اور بچوں میں شامل ہو کر متوفی خاتون کے گھر میں داخل ہوئے۔

ساتھ گھر میں مردوں کے درمیان بیٹھے ہوئے مولوی نے قرآن مجید پڑھا۔ اس کی آواز لاؤڈ سپیکر کے ذریعے عورتوں تک پہنچ رہی تھی۔ ان کاموں کے لیے خوش الحان ملاؤں کو منتخب کیا جاتا ہے۔ قرآن کی تلاوت کے بعد وہ دھیمی آواز میں ایک مرثیہ پڑھتا ہے، جس میں، وں کے فضائل بیان کیے جاتے ہیں۔ پرہجوم کمرے کے اردگرد بیٹھی خواتین سسکیاں بھرتی ہیں۔ مرثیے کے اختتام پر تاثر ایک دم بدل جاتا ہے۔ خادم قالینوں کے اوپر پلاسٹک کی بڑی بڑی شیٹس بچھا دیتے اور بکرے، مرغی، چاول اور سبزی کی ڈشز لا کر رکھتے ہیں۔

اس قسم کے اجتماعات خاندانوں کو اکٹھا ہونے کا موقع دیتے ہیں، لیکن اس شب ہفت سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ جنگ اور انقلاب کے دس برسوں نے ایرانی خاندانوں کو کس قدر منتشر کر دیا تھا۔ متوفی خاتون کا ایک پوتا عراق کے ساتھ جنگ میں ''شہید'' ہوا تھا جس کی تصویر لیونگ روم کی دیوار کے درمیان میں آویزاں تھی۔ اس نوجوان کی بہن تصویر کے نیچے بیٹھی تھی ''خمینی مردہ باد'' کا نعرہ لگانے کے جرم میں سات سال جیل کی سزا کاٹ کر حال ہی میں رہا ہوئی تھی۔ شہید بھائی نے اسے انقلابی دستوں کے حوالے کیا تھا۔

جینٹ نے کہا، ''متوسط طبقے کے تقریباً ہر ایرانی گھرانے میں تمہیں یہ سب کچھ دیکھنے کو ملے گا، بشرطیکہ تم انہیں اپنے ساتھ بات کرنے پر آمادہ کر لو۔ انقلاب نے یہاں لوگوں کو واقعتاً بانٹ کر رکھ دیا ہے۔ پرجوش معتقد اور غیر معتقد سب ایک ہی چھت تلے رہتے ہیں۔'' قریب ہی اس لڑکی کی خالہ بیٹھی تھی۔ اس کے تینوں بچے مارے گئے تھے دو حکومت کے لیے لڑتے ہوئے اور تیسرا اس کے خلاف جدوجہد میں۔ ایک بیٹی تھی جو رضاکار خواتین کی ملیشیا میں تربیت کرتے ہوئے

ہلاک ہوگئی۔ رائفل رینج کی پہلی مشق کے موقع پر وہ آٹومیٹک فائر کے برسٹ سے سہم کر ایک دم خندق میں سیدھی کھڑی ہوگئی اور گولی عین اس کے سر میں لگی۔ ایک بیٹا ایران عراق جنگ کے محاذ پر لڑنے گیا اور ''کارروائی کے دوران لاپتا'' قرار پایا۔ میں نے خاتون کو یہ نہ بتایا کہ مَیں اس محاذ جنگ پر جا چکی تھی جہاں اس کا بیٹا لڑا تھا۔ میں عراق کی طرف سے گئی، کیونکہ ایران خاتون رپورٹروں کو محاذ پر نہیں جانے دیتا تھا۔ جب مَیں پہنچی تو عراق کو ایک بڑی فتح ملی تھی، اور ایرانیوں کی قیمہ شدہ لاشیں ادھر اُدھر مورچوں میں بکھری ہوئی تھیں۔ عراقی سپاہی اپنے حاصل کردہ چند میٹر صحرائی علاقے پر چوکیاں مضبوط بنانے کا کام شروع کر چکے تھے۔ مٹی ہٹانے والی دیو قامت مشینیں لاشوں کو روندتی چلی گئیں اور پیچھے ریت اور گوشت کا آمیزہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس قسم کی لاشوں کی کوئی شناخت ممکن نہیں تھی۔ اس ریت میں سینکڑوں، شاید ہزاروں نوجوان ہمیشہ ''لاپتا'' رہیں گے۔

اس کے دوسرے بیٹے کی موت سب سے اندوہناک تھی۔ اسے اسلامی جمہوریہ نے ایک مخالف عسکری گروپ ''عوامی مجاہدین'' کی رکنیت کی وجہ سے سزائے موت دی۔ اس نے کہا کہ وہ ایک سرپھرا نوجوان تھا جسے ایک منظم گروپ نے اپنا شکار بنالیا۔ میں اس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ کیا وہ اپنے بیٹے پر رحم نہ کرنے والی ایرانی حکومت کو الزام دیتی ہے یا نہیں، لیکن جینٹ (جو میری مترجم کا کام کر رہی تھی) نے اپنا سر تھوڑا سا ہلا دیا اور سوال نہ پوچھا۔ اس کی بجائے میں نے پوچھا کہ کیا وہ اپنی تمام قربانیوں کو قابل قدر محسوس کرتی ہے۔ اُس نے بلاہچکچاہٹ ہاں میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا: ''شاہ کا مجسمہ سب سے پہلے ہمارے گاؤں نے مسمار کیا تھا، اور ہم اپنے راستے سے نہیں ہٹے، چاہے اہل مغرب کچھ بھی سوچتے رہیں۔'' ہم نے دیہی سکول میں بطور استاد اس کے کام کے متعلق بات چیت کی۔ اس نے کہا کہ تمام نقصانات اور صدمات برداشت کرنے کے بعد اب وہ شاگردوں کو ہی اپنے بچے سمجھتی تھی۔

چند دن پہلے جینٹ اور محمد نے ایک اور شب ہفت میں شرکت کی تھی۔ پرسکون انداز میں اپنے خدا سے جا ملنے والی نوے سالہ بڑھیا کی موت کے برعکس یہ دوسری موت اچانک اور ہلا کر رکھ دینے والی تھی۔

اناپیتا صرف تیرہ برس کی تھی۔ موت سے چند ہفتے قبل وہ ایک استاد کے شدید دباؤ کا شکار

ہوئی تھی جو اس کے سکول کا وائس پرنسپل بھی تھا۔ پہلے تو استاد نے اس کے نقاب پر اعتراض کیا اور بتایا کہ بالائی حصہ بہت زیادہ پیچھے کھسکا ہوا تھا، جس کے باعث اس کے بال اشتہا انگیز انداز میں دکھائی دے رہے تھے۔ ایک اور موقع پر استاد نے اناہیتا کے جوتے اتروا دیے کیونکہ اس کے خیال میں وہ ایک سکول کی غریب بچی کے لیے ضرورت سے زیادہ فیشن ایبل تھے۔ پھر استانی نے لڑکیوں کی ایک ٹولی کو سکول کے کمرے کی کھڑکی سے ایسی جگہ پر جھانکتے ہوئے دیکھا جہاں سے اکثر مرد گزرا کرتے تھے۔ بعد میں اناہیتا نے اپنے والدین کو بتایا کہ وہ قریب ہی بیٹھی خاموشی سے سویٹر بُن رہی تھی کہ غضب ناک استانی نے شاگردوں کو آن دبوچا اور برا بھلا کہنے کے بعد صرف اسے ذلیل کیا اور کلاس روم سے باہر کھڑا رکھا۔ یہ واقعہ ماہ رمضان کا تھا۔ روزے دار اناہیتا چمکتے سورج تلے سارا دن کھڑی رہی۔ شام کو اس نے اپنے بڑے بھائی (جو میڈیکل کا طالب علم تھا) کو بتایا: ''وہ روزانہ مجھے ہراساں کرتے ہیں۔ اگر آج بھی ایسا ہوا تو میں سکول نہیں جاؤں گی۔'' بھائی کو اندازہ نہیں تھا کہ وہ یہ بات کتنے گہرے عزم کے ساتھ کہہ رہی تھی۔

اگلے روز سکول میں وائس پرنسپل نے اناہیتا کی ماں کو بلوا کر اس کے طرز عمل کی شکایت کی۔ اس نے کہا کہ لڑکی کا نام سکول سے خارج ہونے والا ہے، اور اس کا ایک فاحشہ بننا قرین قیاس ہے۔ ماں نے استانی کے دعووں کو سختی سے مسترد کیا اور کہا کہ اناہیتا کو تو ابھی جنس مخالف کی تمیز بھی نہیں تھی: ''وہ تو چھوٹی سی بچی ہے۔ میں ننھے بچوں کی طرح اسے گود میں بٹھا کر زبردستی اس کے بال بناتی ہوں۔ وہ اپنے بناؤ سنگھار کا کوئی وقوف نہیں رکھتی۔'' ابھی یہ بحث چل رہی تھی کہ دل برداشتہ اناہیتا سکول سے نکل کر گھر گئی؛ وہ چھت پر چڑھی اور نیچے کود پڑی۔

چند روز بعد ایک اور جوان لڑکی نے حجاب اور جنسیت کے حوالے سے دباؤ کی شکایت کرتے ہوئے اسی انداز میں خودکشی کی۔ اس کی جیب میں اناہیتا کی ایک تصویر تھی جو اس نے اخبار میں سے پھاڑی تھی۔ ان دو کیسز نے ایرانی میڈیا میں بے چینی کی ایک لہر دوڑا دی۔ ''Today's Woman'' نامی ایک جریدے میں خودکشیوں کے متعلق ایک مضمون کی سرخی تھی: ''ہم مستقبل کی ہزاروں امیدیں باندھ کر اپنے بچوں کو سکول بھیجتے ہیں۔'' مضمون میں پوچھا گیا تھا کہ ہم سے غلطی کس جگہ پر ہوئی تھی؟ اس موضوع پر دیگر بیشتر مضامین کی طرح اس میں بھی حد سے زیادہ سخت گیر استاد کو الزام دیا گیا، اور استادوں کو بچوں کی نفسیات پڑھانے کا مطالبہ بھی کیا گیا۔ کسی نے بھی یہ

سوال نہ اٹھایا کہ آیا بچیوں کے ناتواں کاندھوں پر اسلامی ضوابط کا بھاری بوجھ بہت جلد تو نہیں لادا جا رہا تھا۔

جب میری ملاقات جینٹ کی بیٹی لیلیٰ سے ہوئی تو وہ کچھ ہی دن پہلے نو برس کی عمر کو پہنچی تھی، وہ عمر جس میں لڑکیاں اپنے مذہب کی ذمہ داریاں قبول کرتی ہیں۔ ایران میں نو سالہ بچی کے لیے پورا حجاب کرنا، صبح سویرے نماز کے لیے اٹھنا اور رمضان کے روزے رکھنا لازمی ہے۔ لڑکوں کو نسبتاً کم سمجھ دار خیال کرتے ہوئے ان سے پندرہ سال کی عمر تک روزے رکھنا کا تقاضا نہیں کیا جاتا۔ خمینی نے ایران واپس آنے پر شاہ کا ''فیملی پروٹیکشن ایکٹ 75'' منسوخ کیا جس میں بچوں کی شادی اور کثیر الازدواجی پر پابندی عائد کی گئی تھی۔ اب ایران میں ایک نو سالہ لڑکی کا شادی کرنا غیر قانونی نہیں ہے۔

لیلیٰ کی پرورش ایران میں ہی ہوئی، لیکن وہ گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے نانا نانی کے پاس میسوری جایا کرتی تھی۔ کنساس سٹی میں اس نے اپنی امریکی سہیلیوں کی فری وہیلز گیمز کا حظ اٹھایا۔ لیکن وطن واپس آنے پر وہ گھر کی چار دیواری میں قید ہو جاتی۔ جب گلی کے اُس پار کاریں مرمت کرنے کی ایک ورکشاپ کھل گئی تو اسے اپنی بائیک ایک طرف رکھنا پڑی۔ جینٹ نے بتایا: ''وہاں ہر وقت نوجوان مرد کھڑے اپنی کاروں کے بارے میں باتیں کرتے رہتے ہیں۔ اگر وہ اپنے بھائیوں کے ساتھ ادھر اُدھر بائیک پر گھومی تو اسے گھورا جائے گا۔''

ایک مکان کا مکینک شاپ میں تبدیل ہو جانا جینٹ کے لیے باعث مسرت نہیں تھا، لیکن وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ اول تو دکان کا جواں سال پروپرائیٹر عراق میں جنگی قیدی رہ چکا تھا اور اس نے آزمودہ کار سپاہیوں کو حکومت کی جانب سے ملنے والی امدادی رقم سے کاروبار شروع کیا تھا۔ جینٹ نے آہ بھری، ''مقامی حکام اس بات پر میرے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں کریں گے کہ میں اپنی بیٹی کے کھیلنے کے لیے ماحول کو آزاد رکھنا چاہتی ہوں۔ ان کی نظر میں اس کی جگہ چار دیواری کے اندر ہے، چاہے گلی کے اُس پار ایک آٹو شاپ موجود ہو یا نہ ہو۔''

لیلیٰ کو اپنی پہلی چادر مل چکی تھی جسے کاٹ کر چھوٹا کیا گیا اور کناروں پر کشیدہ کاری کی گئی۔ وہ چادر لینا بہت پسند کرتی تھی۔ جینٹ نے بتایا، ''اس طرح وہ خود کو جوان محسوس کرتی ہے۔ میرے خیال میں اس کا باغی نہ ہونا میری خوش قسمتی ہے۔'' جینٹ اس بارے میں پریشان تھی کہ اس کا

قبول اسلام کا فیصلہ انجام کار اس کی بیٹی پر کیا اثر ڈالے گا۔ وہ بغاوت کی کسی بھی علامات پر گہری نظر رکھتی جو لیلیٰ کی زندگی کو گھر سے باہر مشکل بنا سکتی تھیں۔

لیکن جب لیلیٰ خوب صورت بچی سے بڑھ کر حسین لڑکی بنی تو مذہب سکول میں اس کے پسندیدہ ترین مضامین میں سے ایک بن گیا۔ وہ نماز کے وقت اپنے چودہ سالہ بھائی کا خیال رکھتی جو ابھی نماز پڑھنے کی عمر کو نہیں پہنچا تھا۔

''موما، یوسف نماز کیوں نہیں پڑھتا؟'' وہ اتنی بلند آواز میں پوچھتی کہ اس کا ٹی وی دیکھتا ہوا بھائی سن کر منہ بناتا۔ ''ابھی وہ پندرہ سال کا نہیں ہوا،'' جینٹ تھکی ہوئی آواز میں کہتی۔ ''لیکن موما، ہماری استاد کہتی ہے کہ اگر وہ نماز پڑھنا جانتا اور سمجھتا ہے تو اسے بھی نماز پڑھنی چاہیے، چاہے اس کی عمر کتنی ہی ہے۔ اور یوسف کو نماز پڑھنی آتی ہے۔''

جینٹ نے بغاوت کے بارے میں پریشان ہونا چھوڑ دیا اور تنگ نظر تعصبیت سے ڈرنے لگی جو گھر کے اندر کھنچاؤ کا باعث بنی تھی۔ جینٹ کی ایک امریکی سہیلی کی بیٹی اس قدر راسخ العقیدہ بن گئی تھی کہ ماں کے ہمراہ سیر کے لیے ''روحانی گمراہی'' کے شکار امریکہ جانے سے انکار کر دیا۔

لیلیٰ کے دن کا آغاز نماز سے ہوتا۔ اس کے بعد وہ ''مرگ بر امریکہ'' (امریکہ مردہ باد) کا فقرہ بار بار دہراتی۔ اس کا سکول، ''شہید علم''، ایرانی ماحول میں ایک معقول حد تک ترقی پسند ادارہ تھا اور اس میں طالبات سے چادریں اوڑھنے کا تقاضا نہیں کیا جاتا تھا۔ سکول کی بچیوں کے لیے چادریں لینے کا معاملہ چند سنگین کار حادثات کے بعد متنازع بن گیا تھا کیونکہ طلوع آفتاب سے قبل ڈرائیور کالی چادر والی چھوٹی چھوٹی شبیہوں کو دیکھ نہ سکے جو سڑک پار کر رہی تھیں۔ اس کی بجائے لیلیٰ کے سکول کا یونیفارم فاختہ رنگ کی عبا تھا جو پینٹس کے اوپر پہنی جاتی۔ سر پہ magneh لیا جاتا تھا۔ بچیاں اپنے magneh کو پیشانی تک کیے کھیل کے میدان میں دوڑتی بھاگتی رہتیں، حالانکہ دوسرے مرد تو در کنار، طالبات کے باپ بھی سکول کی حدود میں داخل نہیں ہو سکتے تھے۔ بچیاں پردے لگے گیٹ کے راستے اونچی دیواروں والے احاطے میں جاتیں جس کی نگرانی ایک بوڑھا سکیورٹی والا کرتا تھا۔

سکول کے اندر جانوروں کے کٹ آؤٹ اور فطری اشیا کے اوپر ''مرگ بر امریکہ'' کے بینر لگے ہوئے تھے۔ لیکن سکول کا سرکاری امریکہ مخالف جوش وجذبہ جینٹ کی انگلش کلاس میں داخلے

کے لیے کشمکش نے جھٹلا دیا۔ انقلاب کے پہلے دس سال کے دوران سرکاری سکولوں میں انگلش پڑھانا ناپسندیدہ بن گیا تھا۔ لیکن امام خمینی کی وفات کے بعد یہ رجحان چپکے چپکے دوبارہ بڑھتا گیا۔ لیلیٰ کے سکول میں انگریزی کی دو استانیاں تھیں، لیکن جینٹ کی کلاس پر دباؤ بہت زیادہ ہوتا کیونکہ والدین اپنی بچیوں کو نیم مغربی لہجے میں انگریزی سکھانے پر مُصر تھے۔

I am a girl!‹This is a desk!‹This is a pen!'' ''چھ چھ سال کے 23 ننھے منے، magneh میں فریم کیے ہوئے چہروں نے یک زبان ہو کر پڑھا۔ جینٹ نے بچیوں کو ABC سنانے یا بورڈ (جس پر عموماً فارسی انداز تحریر کے تو سی حروف ہی لکھے ہوتے تھے) پر غیر مانوس لاطینی حروف تہجی لکھنے کو کہا۔ اپنے کام بہتر انداز میں کرنے والی بچیوں کو بطور انعام ایک ٹافی اور تالیوں سے نوازا جاتا۔

ہر مرتبہ جینٹ سے ملاقات ہونے پر وہ اپنی برادری میں پہلے سے زیادہ رچی بسی اور نجی زندگی میں زیادہ مطمئن نظر آئی۔ ابھی تک لیلیٰ بنیاد پرستی کی کھائی میں گرے بغیر ہی راسخ الایمان ہے۔ ایران کی خاندان پر مرکوز دنیا میں جینٹ اور محمد نے بیشتر مغربی جوڑوں کی نسبت ایک دوسرے کو زیادہ سمجھا اور بطور والدین اپنے فرائض کو زیادہ مساوی طور پر بانٹا ہے۔ جمعے کا دن ان کے لیے ہمیشہ سے ایک گھریلو دن ہے جب وہ بچوں کو قریب کے پہاڑوں پر لے جاتے، رشتہ داروں سے ملتے، یا بس گھر میں بیٹھ کر نئی ویڈیوز دیکھتے۔

''جب میرا شوہر مجھے یہاں لایا تو شروع شروع میں مجھے یہ سب بہت برا لگا'' جینٹ کی ایک امریکی سہیلی نے کہا جو ایک دوپہر کو چائے کے لیے رک گئی تھی۔ ''مجھے اپنے اٹھائے ہوئے ہر قدم سے نفرت تھی۔'' وہ اپنے شوہر کو چھوڑ کر واپس امریکہ چلی گئی تھی۔ ''واپس پہنچ کر میں اس ساری چوہا دوڑ پر یقین نہ کر سکی۔ میری جاب توانائی کا ایک ایک اونس نچوڑ لیتی۔ میں یہاں کی سست روزندگی کی آرزو کرتی رہی، جہاں گھر اور خاندان سب سے پہلے آتا ہے، اور ملازمت ان کے درمیان ہی کسی وقت کی جاتی ہے۔ تب مجھے کینسر ہو گیا اور میں خود کو بہت تنہا محسوس کرنے لگی۔ یقیناً میرے رشتہ دار موجود تھے، لیکن وہ میری خاطر سب کچھ چھوڑنے سے قاصر تھے۔ میں سوچتی رہی کہ اگر میں ایران میں ہوتی تو گھر والے میرے لیے سب کچھ چھوڑ دیتے۔ صحت مند ہوتے ہی میں یہاں واپس چلی آئی۔ یہ زندگی واقعی بہت اچھی ہے۔''

☆ ☆
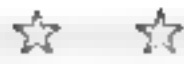
لیکن گھریلو مسرت کی داستانیں پوری کہانی بیان نہیں کرتیں۔ جینٹ کی دوست مارگریٹ کے ساتھ میرا رابطہ منقطع ہو گیا تھا۔ ہماری پہلی ملاقات کو دو سال گزر چکے تھے، لیکن ایک روز دوبارہ رابطہ ہوا اور اس نے مجھے اپنی ساس کی rosees میں سے ایک پر آنے کی دعوت دی۔ راسخ العقیدہ عورتوں کے لیے یہ اجتماعات دوپہر کی چائے پارٹی اور مذہبی درس کی کلاس کا امتزاج ...... میل جول کا بڑا ذریعہ ہیں۔

گھر پہنچنے پر میں کالی چادر میں ملفوف شبیہ کو بہ مشکل ہی پہچان سکی جس نے دروازہ کھولا تھا۔ مارگریٹ نے اپنے زرد چہرے سے میک اَپ اتار دیا تھا اور سنہرے بالوں کو کس کر پیچھے باندھ ہوا تھا۔ حتیٰ کہ اس کی ڈرامائی قدوقامت بھی سکڑی ہوئی لگی جیسے وہ کبڑی ہو گئی ہو۔ جب ہم اکٹھی چلتی ہوئی اس کی ساس کے صحن میں جا رہی تھیں تو میں نے درمیان میں بنے نیلی ٹائلوں والے فوارے کو سراہا۔ ''میری ساس یہاں وضو کرتی ہے۔ اس کی ایک ایک ٹائل کو روزانہ صاف کرنا میرا کام ہے۔ مجھے ہر چٹائی پر اس کے ساتھ جھاڑو بھی دینا پڑتا ہے،'' اس نے ایک جھاڑو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میرے پاس ویکیوم کلینر موجود ہے، لیکن اسے استعمال کرنے کی اجازت نہیں۔ ساس کو اعتبار نہیں ہے کہ وہ گرد صاف کر سکتا ہے۔ ایک نومسلم ہونے کے ناتے مجھے ہر کام پیدائشی مسلمان سے بہتر انداز میں کرنا ہوتا ہے تاکہ دوسروں کو اپنے ناپاک کافر نہ ہونے کا یقین دلا سکوں۔'' اس کی آواز جھکی ہوئی اور ترش لگ رہی تھی۔ لگتا تھا جیسے اس کی ساری سرکشی اور شرارت کوٹ کوٹ کر نکال دی گئی ہو۔

اس نے مجھے ایک دیوان خانے کی جانب بڑھایا جس میں کالے کپڑے میں لپٹی ہوئی ایک خالی مسجع کرسی کے سوا اور کوئی فرنیچر نہیں تھا۔ کوئی درجن بھر دیگر مہمان عورتیں دیوار کے ساتھ لگے بڑی بڑی گدیوں پر بیٹھی تھیں۔ جونہی ملا آیا، انہوں نے اپنی چادروں کے کنارے چہروں تک سرکا لیے۔ ملا نے کوئی سلام دعا بھی کیے بغیر کرسی پر جگہ سنبھالی اور دکھ بھری، ہذیانی آواز میں کچھ پڑھنے لگا۔ چند منٹ کے اندر اندر زیادہ تر عورتیں آہیں بھرنے لگیں۔ مارگریٹ کی ساس زیادہ جذباتی ہو گئی۔ اس کے کندھے کالی چادر تلے لرز رہے تھے۔ عورتوں نے ہاتھوں سے ٹٹول کر سامنے رکھے ڈبوں میں سے ٹشو پیپر نکالے۔

مُلا حضرت امام حسینؓ کی کہانی سنا رہا تھا جو میدان کربلا میں کوئی 1300 سال قبل شہید ہوئے۔ ہر شیعہ کو یہ کہانی زبانی یاد ہے۔ میں یہ دیکھ کر بہت حیران ہوئی کہ کہانی نئے سرے سے سننے پر بھی اس قدر جذباتیت طاری ہو سکتی ہے۔ فرش پر میرے پہلو میں بیٹھی مارگریٹ نے سرگوشی کی: ''یہ صرف حسینؓ کے لیے نہیں رو رہیں۔ ان کا رونا اپنی زندگیوں کی تمام خوفناکیوں پر بھی ہے۔۔۔ گرے ہوئے حمل، بیماری سے مرجانے والے بچے، جنگ میں بھائی کی ہلاکت، شوہر سے طلاق۔ تیسری دنیا کے اس جیسے ملک میں عورتوں کے پاس رونے کے لیے کافی کچھ ہوتا ہے۔''

ملا کی مترنم آواز بلند ہوتے ہوتے ایک دم رک جاتی۔ وہ جس طرح ایک دم آیا تھا اسی طرح باہر بھی چلا گیا۔ جونہی وہ دروازے سے باہر نکلا، عورتوں نے اپنی اپنی چادریں اتار دیں۔ انہوں نے زرق برق ریشمی کامدار لباس پہن رکھے تھے۔ فوراً ہی درجن بھر گپیں شروع ہو گئیں۔ مارگریٹ فوراً اٹھ کر باورچی خانے میں گئی اور کئی چکر لگا کر پھل، چھوٹے چھوٹے کھیرے، مٹھائیاں اور چائے لائی۔ مہمانوں نے اپنا بناؤ سنگھار درست کیا اور ایک دوسرے کا پھیلا ہوا مسکارا ٹشوز سے صاف کرنے کے بعد چائے کے چھوٹے چھوٹے بلوریں میں چینی انڈیلی۔ کچھ دیر بعد میں ٹیکسی کے لیے فون کرنے اٹھی۔ چند منٹ گزرنے پر فون کی گھنٹی بجی اور مارگریٹ نے مجھے بلاتے ہوئے اپنی نند کی طرف بھی ہلکا سا اشارہ کیا۔ وہ اپنی چادر کی تہہ میں ریسیور کو احتیاط سے لپیٹے ہوئے تھی۔ مارگریٹ نے سرگوشی کی: ''یہ نجیظ کا فرو الا معاملہ ہے جس کے متعلق میں نے تمہیں بتایا ہے۔ تم مسلمان نہیں ہو، اس لیے وہ تمہاری چھوئی ہوئی کسی بھی چیز کو اچھی طرح دھوئے بغیر دوبارہ ہاتھ نہیں لگائے گی۔'' میں نے سوچا، یہ خوش قسمتی ہے کہ مارگریٹ کی نند کو میرے یہودی ہونے کا علم نہیں، ورنہ وہ تو فون ہی اٹھا کر باہر پھینک دیتی۔ کچھ ایرانیوں میں یہودیوں کی ناپاکی کا خوف اس قدر گہرا ہے کہ اسلامی انقلاب سے بھی کافی عرصہ قبل حکومت نے قانون منظور کیا تھا کہ یہودی لوگ بارش یا برف باری کے دوران گھروں سے نہیں نکلیں گے کہیں پانی ان کے جسموں کو چھونے کے بعد بہتا ہوا وضو کرتے ہوئے کسی مسلمان کی طرف نہ چلا جائے۔

جب مارگریٹ نے ایک کونے میں تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھی اپنی زیادہ دانش مند ساس کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے سب کی خاطر مدارت کر لی تو مجھے اشارے سے اپنے کمرے میں تھوڑی دیر باتیں کرنے کے لیے بلایا۔

یہ ''کمرہ'' ایک تنگ سی کوٹھڑی تھا جسے ایک مہین سا پردہ مرکزی کمرے سے الگ کرتا تھا۔ اس کوٹھڑی میں دو سالہ بیٹا بھی اس کے ساتھ رہتا تھا۔ گنجائش اور راز داری کا فقدان تھا۔ اس کا شوہر طویل کاروباری دورے پر امریکہ گیا ہوا تھا۔ وہ اسے والدین سے ملوانے کے لیے ساتھ لیجانے کی بجائے گھر کے کام کاج میں اپنی ماں اور بہن کا ہاتھ بٹانے کی خاطر پیچھے ہی چھوڑ گیا۔ مارگریٹ نے کہا، ''میری ماں زیدہ خوش نہیں۔ وہ فون کرتی اور کہتی ہے، 'تم دوبارہ اس کے رشتے داروں کا انتظار کر رہی ہو؟' وہ جانتی ہے کہ یہ لوگ مجھے موت کی جانب دھکیل رہے ہیں۔ وہ چاہتی ہے کہ میں گھر واپس چلی جاؤں۔''

مارگریٹ ٹیکسی کے انتظار میں میرے ہمراہ گھر کے پچھواڑے میں گئی۔ پڑوسیوں کے باورچی خانے سے آتا ہوا تیز دھواں ہوا میں مسالوں کی خوشبو بکھیر رہا تھا۔ میری ٹیکسی جب آہستہ آہستہ قریب آئی تو میں نے پوچھا کہ وہ اپنی ماں کے مشورے پر عمل کر کے کچھ عرصہ ان کے پاس کیوں نہیں گزار آتی۔ اس نے اپنے جھکے ہوئے کاندھوں کو اوپر اٹھایا اور مٹھی بھینچ کر بولی: ''میں نہیں جا سکتی۔ میرا شوہر نہیں چاہتا کہ میں جاؤں۔'' اُسے بیرونِ ملک جانے کی اجازت دینے کے لیے کاغذات پر شوہر کے دستخط لازمی تھے۔ جب میں نے الوداع کہتے ہوئے ہاتھ لہرایا تو مارگریٹ کا ہاتھ سر کی جانب چلا گیا اور باہر نکلے ہوئے سنہری بالوں کی چند لٹوں کو سکارف کے اندر سمیٹنے لگا۔

پانچواں باب

عورتیں اور جہاد

ہاجرہ داویش (Hadra Dawish) کو شروع شروع میں رائفل رینج پر جھکی ہوئی پوزیشن میں مشکل ہوئی۔ ''میں ہمیشہ سوچتی رہتی کہ کیا یونیفارم میں میری بے پردگی تو نہیں ہورہی؟ کیا میرے پیچھے سے کوئی مرد تو نہیں گزر رہا؟''

لیکن پانچ ماہ بعد جب اس نے متحدہ عرب امارات کی ملٹری اکیڈمی سے اول پوزیشن کے ساتھ گریجوایشن کی تو ساری توجہ صرف اور صرف ہدف پر مرکوز کرنا سیکھ چکی تھی۔ اس نے M-16 رائفل چلانا سیکھی، روسی راکٹ گرنیڈ چلانے کی تربیت لی، ہلکی پر مشین گنوں کا استعمال سیکھا، ہینڈ گرنیڈ اور 9mm پستول چلائے۔ اسے رسے کی مدد سے ہیلی کاپٹر سے نیچے اترنا اور رات کے وقت صحرا میں خفیہ آپریشن کرنا آتا تھا۔ 1992ء میں اس نے خلیج کے کسی ملک کی پہلی ایسی عورت بننے کا اعزاز حاصل کیا جس کا نام برٹش ملٹری اکیڈمی، سینڈہرسٹ میں افسرانہ تربیت کے لیے شامل ہوا۔

ان سب باتوں پر خود ہاجرہ سے زیادہ اور کوئی بھی حیران نہیں تھا۔ وہ 1967ء میں ایک نہایت رجعت پسند مسلمان معاشرے میں پیدا ہوئی۔ اُن دنوں امارات کی زیادہ تر عورتوں کو سختی سے گوشہ نشین رکھا جاتا۔ خاندان سے باہر جانے پر وہ لمبا عبایہ پہنتیں اور چہرے بھی کپڑے سے

ڈھانپتیں۔حتیٰ کہ متعدد عورتیں گھر کے اندر بھی برقعہ پہنا کرتی تھیں		کینوس یا چمڑے سے بنا ہوا ایک کالا اور طلائی نقاب جو آنکھوں کے سوا سارا چہرہ چھپالیتا۔اپنی بیٹی کو لڑکیوں کے سکول میں بھیجنا ایک خطرناک اقدام خیال کیا جاتا تھا۔ایک عشرہ سے بھی کم عرصہ پہلے راسخ العقیدہ گھرانے اپنے بیٹوں کی شادی ایسی لڑکی سے نہیں کرتے تھے جسے خاندان سے باہر کے کسی بھی مرد یا عورت نے دیکھا ہو۔

ہاجرہ کا خاندان اتنا روشن خیال ثابت ہوا تھا کہ اسے سکول میں داخل کروایا اور معذور بچوں کے سکول میں بطور معالج کام کرنے کی اجازت بھی دی		ایسی نوکری جس میں مردوں کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں پڑ سکتا تھا۔وہ عبایہ اور نقاب پہن کر آتی جاتی۔اس نے کہا،''میں نے اس پر کبھی بھی سوال نہیں اٹھایا۔سچی بات تو یہ ہے کہ میں اب بھی اس لباس کو ترجیح دیتی ہوں۔لیکن ایک سپاہی کے لیے یہ ممکن نہیں۔''اب وہ خاکی رنگ کا کیموفلاج لباس اور ایک اتنی لمبی اور کھلی جیکٹ پہنتی ہے کہ جسم کے خطوط ظاہر نہ ہوں۔فوجیوں والی ٹوپی کے نیچے ایک سکارف میں اس کے بال لپیٹے ہوئے ہوتے۔

ہاجرہ بھی بہت سے لوگوں والی وجوہ کی بنا پر ہی سپاہی بنی:''مجھے اپنے ملک سے محبت ہے۔میں اسے تباہ ہوتا نہیں دیکھنا چاہتی۔''1990ء میں ہاجرہ نے پڑوسی ملک کویت پر عراق کا حملہ دہشت زدگی کے عالم میں دیکھا۔کویت کی بے وقعت فوج کوئی مدافعت نہ کر سکی۔کویتی تارکین وطن زنا اور تباہی کی داستانیں ساتھ لیے امارات کی جانب بھاگے۔

متحدہ عرب امارات کویت کا نقش ثانی ہے۔امیر،چھوٹا اور آمروں کے لیے باعث تحریص۔ امارات کے صدر شیخ زید کے محل میں فوجی حکمت عملی تیار کرنے والے اہلکار اپنی 50 000 فوجیوں پر مشتمل چھوٹی سی فوج کو بہتر بنانے کے لیے دماغ لڑا رہے تھے۔آخر امارات کے پاس فوجی خدمت کے قابل پانچ لاکھ سے کم لوگ تھے۔زید کی بیوی شیخا فاطمہ نے تجویز دی کہ چھوٹی سی ریاست اپنی آبادی کا نصف ضائع کروانے کی متحمل نہیں ہو سکتی۔اس نے عورتوں کو بھرتی کرنے کی انقلابی تجویز پیش کی۔

شیخا فاطمہ زید کی پہلی یا واحد بیوی نہیں تھی۔شیخ زید امارات کے ایک جدید ریاست بننے سے قبل ایک قبائلی سردار تھا۔اس نے اپنے معاہدوں کو مضبوط بنانے اور سیاسی اتحادوں کو مستحکم کرنے

کی خاطر اکثر شادیاں کیں۔ عموماً بیویاں اس کے ساتھ چند سال ہی گزارتیں اور پھر انہیں طلاق دے کر کافی دولت اور عزت کے ساتھ واپس میکے بھیج دیا جاتا۔ لیکن فاطمہ نے اس کا دل اور احترام بھی حاصل کر لیا تھا۔ وہ سرکاری طور پر امارات کی خاتون اول بن گئی۔ وہ جب شیخ کی بیوی بنی تو کم سن تھی اور قرآن کی بنیادی تعلیم کے علاوہ بہ مشکل ہی پڑھی لکھی تھی۔ اس نے محل کے ذرائع کو استعمال کرتے ہوئے اپنی تعلیم جاری رکھی، انگریزی اور کلاسیکی عربی کا مطالعہ کیا۔ 1973ء میں اس نے عورتوں کی بیداری کے لیے ابوظہبی سوسائٹی کا اجرا کیا جس کا مقصد ناخواندگی کا خاتمہ اور عورتوں کو مختلف پیشوں کی تربیت دینا تھا۔

1990ء کی دہائی میں بھی امارات کی عورتیں خال خال ہی ملازمت کرتی دکھائی دیتی تھیں۔ مٹھی بھر عورتوں نے ایسی ملازمتیں اختیار کرنا شروع کیں جن میں ان کا واسطہ مردوں سے پڑتا تھا۔ شیخا کی ایک پہل کار دوست حیسا الخالدی (Hessa al-Khaledi) امارات کی پہلی خاتون سول انجینئر تھی۔ زید کی منظوری سے شیخا نے حیسا کو امارات کی اولین سپاہی خواتین کی بھرتی کا مسئلہ حل کرنے اور مذہبی اداروں سے مفاہمت کروانے کی ذمہ داری سونپی۔

حیسا نے پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ میں اپنی ملازمت سے رخصت لی اور فوراً اسلامی تاریخ کی کتابوں سے رجوع کیا۔ اس وقت معاملہ جہاد کا تھا: عقیدے کو پھیلانے اور مسلم برادری کے تحفظ کی عظیم جدوجہد۔ جہاد تمام مسلمانوں پر فرض ہے لیکن اس کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ مغربی ذہن میں جہاد کا مطلب محض دہشت گردی کی کارروائیاں ہیں جو دہشت پسند اسلامی گروپ انجام دیتے ہیں۔ لیکن مثالی زندگی گزارنے کے ذریعے عقیدے کی تعلیمات کو پھیلانا بھی جہاد ہے۔

جہاد میں عورتوں کا کردار آنحضرتؐ کے دور میں بھی ایک قابل بحث مسئلہ تھا۔ بعثت اسلام کے ابتدائی برسوں میں جب مسلم امہ کو پہلے سے موجود مذہبی گروہوں کی جارحیت کا مقابلہ کرنا پڑا تو کچھ عورتوں نے بھی حصہ لینے کا ارادہ کیا۔ فاتح سپاہیوں کو اللہ کی رحمت اور مال غنیمت کا کچھ حصہ ملتا تھا۔ ایک عورت آنحضرتؐ کے پاس آئی اور کہنے لگی: ''میں عورتوں کی نمائندہ بن کر آپ کے پاس آئی ہوں۔ تمام مردوں پر جہاد فرض کیا گیا ہے۔ اگر وہ جیت جائیں تو انہیں دنیاوی دولت اور انعامات ملتے ہیں۔ اگر وہ مارے جائیں تو اللہ کے حضور ابدی زندگی پاتے ہیں۔ لیکن ہم مسلمان عورتیں ان کی خدمت کرتی ہیں، ہمیں اس خدمت کے عوض کیا ملتا ہے؟''

آپؐ نے جواب دیا: ”عورتوں کو جا کر بتا دو کہ ان کے لیے اپنے شوہروں کی اطاعت کرنا اور ان کی مہربانیوں کو قبول کرنا ہی جہاد کے برابر ہے۔“

امارات کے حکام نے عورتوں کو فوج میں بھرتی کرنے کے خلاف بطور دلیل اس حدیث کا حوالہ دیا۔ لیکن حیسا الخالدی نے جوابی تاریخی شہادت پیش کرتے ہوئے ثابت کیا کہ عورتیں بھی آنحضرتؐ کے ساتھ لڑی تھیں اور انہیں عزت دی گئی۔

نصیبہ بنت کعب شاید متعدد جنگجو عورتوں میں سے مشہور ترین ہے، کیونکہ اس نے جنگ عہد میں آپؐ کی جان بچانے میں مدد دی تھی۔ دشمن کے زوردار حملے کے باعث جب مسلمان فوج منتشر ہو گئی تو وہ ان دس جنگجوؤں میں شامل تھی جو اپنے جگہ پر قائم ہو کر لڑتے رہے اور آپؐ کی حفاظت کی خاطر اپنے جسموں کی ڈھال بنا دی۔ اس دوران نصیبہ کو تیرہ زخم آئے۔ گردن کے قریب ایک سنگین زخم کو ٹھیک ہونے میں ایک سال سے زیادہ عرصہ لگا۔ جنگ سے اگلے روز جاں بہ لب حالت میں لیٹے ہوئے اس نے آپؐ کو دشمنوں کے تعاقب کے لیے ہدایات جاری کرتے ہوئے سنا اور اٹھنا چاہا لیکن بہت زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے بیہوش ہو گئی۔ ایک اور جنگ میں اس کا ہاتھ ضائع ہو گیا۔ آنحضرتؐ نے نصیبہ کی خدمات کو سراہا۔ آپؐ اکثر اس سے ملنے جاتے اور اس کے گھر میں کھانا بھی نوش فرماتے۔

مسلمانوں کے شدید مخالفین میں کچھ عورتیں بھی شامل تھیں۔ مکہ کے سردار کی بیوی ہندہ بنت عتبہ نے جنگ احد میں رجز پڑھ کر اپنے سپاہیوں کا حوصلہ بڑھایا۔ اس نے آنحضرتؐ اور اسلام کے خلاف بھی کئی تقریریں کیں۔ حضرت عمرؓ نے اسے منہ توڑ جواب دیا۔

لیکن ہندہ بے باک تھی۔ جب اہل مکہ نے مسلمانوں کو ایک تباہ کن شکست دی تو اس نے مسلمانوں کی لاشوں میں سے حضرت حمزہؓ کو ڈھونڈا اور ان کا کلیجہ نکال کر چبایا (حضرت حمزہؓ نے ایک سابقہ جنگ میں اس کے باپ کو قتل کیا تھا)۔ ہندہ نے ان کی لاش کے مختلف اعضا کاٹ کر دھاگے میں پرو دیا اور بطور ہار گلے میں پہنا۔

میدانِ جنگ میں مسلمان عورتوں کی بہادری کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ آنحضرتؐ کی خالہ صفیہ پہلی ایسی مسلمان عورت تھی جس نے لڑائی میں کسی دشمن کو قتل کیا۔ اسما بنت یزید نے جنگ یرموک میں نو دشمنوں کی جان لی۔ خولہ الازوار نقاب اوڑھ کر گھوڑے پہ سوار ہوئی اور میدان جنگ

میں گئی۔ جب وہ پر جوش انداز میں دشمن کی جانب بڑھ رہی تھی تو دیکھنے والوں نے ایک دوسرے سے پوچھا کہ آپؐ کے پہلو میں یہ بہادر کون تھا۔

آپؐ کے وصال کے بعد بھی عورتیں جنگی مہمات میں شریک ہوتی رہیں۔ جب مسلمانوں نے ایک فارسی بندرگاہ پر حملہ کیا تو ازدہ بنت الحارث کی زیر قیادت ایک ٹولے نے اپنی چادروں سے علم بنائے اور دستے کی صورت میں آگے بڑھیں۔ دشمن غلطی سے انہیں کمک فوج سمجھ بیٹھا۔

حیسا نے ان مثالوں کی مدد سے آہستہ آہستہ عورتوں کو فوج میں بھرتی کرنے والوں کو چپ کروایا۔ ''میں ان سے پوچھتی کہ اگر اُس دور میں یہ ممنوع نہیں تھا، تو آج کیوں ہے؟'' رجعت پسند لوگ بھی سنت کے خلاف بحث نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن ایک سوال بار بار سامنے آتا رہا: عورتوں کو تربیت کون دے گا؟ کوئی مرد افسر بے پردہ عورتوں کو جسمانی ورزش کی تربیت دے سکتا تھا اور نہ ہی نظم وضبط کی پابندی کروانے کے لیے خواتین کی بیرکوں میں جا سکتا تھا۔ وہ کسی عورت کو رائفل پکڑنے کا طریقہ سمجھانے کی خاطر اُسے چھو بھی نہیں سکتا تھا۔

اس کا جواب ہر اُس شخص پر واضح تھا جس نے امریکی فوج کو پڑوسی ملک سعودی عرب میں وارد ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ امریکی فوج کی خواتین ٹروپ ٹرانسپورٹ اڑانے، میزائل بیٹریوں کو ٹھیک رکھنے اور اسلحے محاذ پر پہنچانے کا کام کر رہی تھیں۔ امارات نے امریکی فوج سے درخواست کی کہ وہ اپنی چند سینئر خواتین کو ایک بنیادی تربیتی کورس کروانے کے لیے بھجوادے۔ Fort Bragg نے دس ماہر عورتوں کو منتخب کیا جن کی اوسط مدت ملازمت چودہ برس تھی۔ ان کی کمانڈر میجر جانس کارپنسکی پہلے بھی سعودی عرب میں خدمات انجام دے چکی تھی۔

کام کا آغاز کرنے سے قبل حیسا نے امریکی فوجی عورتوں کو کم از کم دو دن کے لیے امارات کے کسی گھرانے میں ٹھہرانے کا بندوبست کیا تاکہ وہ ان کے ثقافتی پس منظر کا اندازہ کر سکیں۔ Nashville سے تعلق رکھنے والی ملٹری پولیس کیپٹن ٹریسی بوروم جب امارات کے ایک فوجی افسر کے وسیع وعریض مکان پر پہنچی تو بہت گھبرائی: ''میں پریشان تھی کہ وہ مجھے اپنے گھر پر حملہ کرنے اور اپنے طور طریقوں کو چیلنج کرنے والی ایک مغربی عورت خیال کریں گے،'' اس نے کہا۔ لیکن اس نے خود کو ایک معزز مہمان پایا۔ ٹریسی نے اونٹ کا گوشت (''میٹھا اور چکناہٹ سے بھرپور'') کھایا، برقعہ پہن کر دیکھا (''جیسے میں کسی سے چھپ رہی ہوں'')، اور عورتوں کو اپنی لمبی عباؤں

کے نیچے لوبان دان رکھ کر جسم کو معطر کرتے ہوئے دیکھ ("مجھے یقین تھا کہ وہ خود کو جلا لیں گی")۔

دریں اثناء جیسا اشتہارات کے جواب میں موصول ہونے والی 1,200 سے زائد درخواستوں کی جانچ پڑتال کر رہی تھی۔ اس نے سترہ تا اکتیس سال کی 74 لڑکیوں کو منتخب کیا۔ ان کی تعلیم چھٹی جماعت پاس سے لے کر کالج ڈگری تک تھی۔ اس نے بتایا، "شروع میں میں نے چھوٹے بچوں والی عورتوں کی درخواستیں مسترد کرنے کی کوشش کی، لیکن یہ ناممکن تھا۔" امارات میں لڑکیاں اب بھی بہت چھوٹی عمر میں شادی کرتی اور جلد از جلد اپنا خاندان شروع کر لیتی ہیں، چنانچہ موزوں عمر والی تقریباً تمام عورتیں مائیں بن چکی تھیں۔ لیکن ان میں سے زیادہ تر وسیع گھرانوں میں رہتی تھیں، اس لیے بچوں کو سنبھالنے کے لیے بہت سی خالائیں اور چچیاں موجود تھیں۔ جیسا نے دیکھا کہ بہت سی درخواست دہندہ عورتوں کا بھائی یا باپ بھی فوج میں رہ چکا تھا۔ منتخب کیے گئے گروپ میں بہنوں کے تقریباً سات جوڑے تھے۔ شروع میں جب امریکی تربیت دہندگان نے نو بھرتی شدہ عورتوں کو تین پلاٹونوں میں تقسیم کیا۔ انہوں نے قصداً بہنوں کو الگ الگ پلاٹون میں رکھا۔ لیکن بعد ازاں اس کے برعکس فیصلہ کیا، کیونکہ مشاہدے میں آیا تھا کہ بہنیں ایک دوسری کے سہارے سے زیادہ بہتر کارکردگی دکھاتی تھیں۔ کوئی بھی عورت جسمانی طور پر مستعد نہیں تھی؛ بیشتر نے کبھی ایک رات بھی گھر سے باہر نہیں گزاری تھی۔ ٹریسی بوروم کو ان کا انتہائی شرمیلا پن یاد ہے۔ بچپن سے ہی نظریں نیچی کر کے پرورش پانے والی عورتوں کو اب احاطے میں سیدھے شانوں کے ساتھ کھڑا ہو کر اپنے افسروں کی آنکھوں میں دیکھنا پڑ رہا تھا۔ ٹریسی نے بتایا: "شروع میں مجھے خود جا کر ان کی ٹھوڑیوں کو اوپر اٹھانا پڑتا تاکہ وہ میری طرف دیکھیں۔"

امریکیوں کو اپنی تربیت کے کچھ پہلوؤں میں ترامیم اپنانا پڑیں۔ جانس کارپنسکی کے مطابق: "ڈرل سارجنٹ کا چیخ کر انہیں قطار بنانے یا بیرکوں میں جانے کو کہنا بیچاری عورتوں کو خوف سے مار ڈالنے کے لیے کافی تھا۔ امریکی عورتوں کو اس کی پہلے سے ہی توقع ہوتی ہے۔ وہ یہ سب کچھ فلموں میں دیکھ لیتی ہیں۔" ڈرل سارجنٹس کو پتا چلا کہ خراب کارکردگی دکھانے والی عورتوں کو برا بھلا کہنے کی نسبت ٹھیک کارکردگی دکھانے والی عورتوں کی کھل کر تعریف کرنا زیادہ کارگر تھا۔ ٹریسی بوروم نے کہا، "ان عورتوں کی پرورش خوش کرنے کے لیے ہوئی تھی، چنانچہ ہم نے ایسے لوگ بننے کی کوشش کی جنہیں وہ خوش کرنا چاہتی تھیں۔" دیگر ترامیم میں ڈرل کا شیڈول بناتے وقت نماز کے

اوقات کا خیال رکھنا اور رمضان کے دوران سارا شیڈول نئے سرے سے بنانا شامل تھا۔ جانس کارپنسکی اور کچھ دیگر انسٹرکٹرز بھی اپنی زیرِ تربیت عورتوں کے ساتھ کچھ روزے رکھتیں۔ ''میں ان کے ساتھ اظہار یکجہتی چاہتی تھی، لیکن مجھے ان کی جسمانی حالت جاننے کی بھی خواہش تھی۔ اگر ان میں سے کوئی عورت کہتی کہ وہ چار میل دوڑ نہیں سکتی تو میں کہتی، 'اگر ہم دوڑ سکتی ہیں تو تم بھی دوڑ سکتی ہو، ہم نے بھی روزہ رکھا ہے۔' ''

رمضان کے سوا دن کا آغاز صبح تقریباً ساڑھے پانچ بجے اذان کے ساتھ ہوتا۔ نماز کے بعد کالے سوئیٹ سوٹس میں ریکروٹس جسمانی تربیت کے لیے قطاریں بنا لیتیں۔ ''کسی بھی مرد منتظم کے نمودار ہونے سے قبل ہم پی ٹی کرتیں،'' زیسی نے کہا۔ اس طرح ریکروٹس اپنے بالوں کو چھپائے بغیر کام کر سکتی تھیں، البتہ وہ کبھی کبھی اپنے سکارف کمر پر ہی باندھے رکھتیں تا کہ کہیں اچانک ضرورت نہ پڑ جائے۔

کورس میں سے صرف پندرہ عورتیں خارج ہوئیں۔ کچھ ایک عورتیں ملٹری سکول میں چند ایک مرد منتظمین کی موجودگی کو گوارا نہ کر سکیں۔ دیگر کو اپنے گھر والوں اور نوکروں کی یاد نے ستایا۔ لیکن باقی رہ جانے والیوں نے بہت اچھی کارکردگی دکھائی۔ امریکی انسٹرکٹرز نے ابتدا میں اپنے فٹنس کے اہداف میں کمی کی تھی، تا کہ ان عورتوں کو موقع دیا جا سکے جو کبھی سبزی کی دکان تک بھی پیدل نہیں گئی تھیں، ایک جبری مارچ مکمل کرنا تو بہت دور کی بات ہے۔ لیکن چند ہفتوں کے اندر اندر اہداف دوبارہ بڑھ گئے، کیونکہ عورتیں بہ آسانی روزانہ ایک سو ڈنڈ نکال لیتیں۔ ایک ریکروٹ کا وزن ٹریننگ کے دوران 40 پونڈ گھٹ گیا۔

مئی 1991ء کے قریب کورس مکمل ہونے پر بقول جانس کارپنسکی، ''ہم نے یہ عظیم بدلاؤ واقع ہوتے ہوئے دیکھا۔ آخری تیس دن کے دوران میں نے ان سب عورتوں کو ہمیشہ کندھے اور سر اوپر اٹھا کر چلتے دیکھا۔'' جب ہاجرہ داویش رخصت لے کر اپنے گھر والوں سے ملنے گئی تو وہ اس میں آنے والی تبدیلیاں دیکھ کر حیران رہ گئے۔ ''انہوں نے بتایا کہ مجھ میں بہت سی چیزیں بدل گئی ہیں — میرے بولنے کے انداز سے لے کر اٹھنے بیٹھنے کے طریقے تک۔ کچھ تبدیلیاں انہیں پسند آئیں، اور کچھ نہیں۔'' ہاجرہ نے اپنی سہیلیوں کو قائل کرنا سب سے مشکل پایا۔ مرصع سیلونوں میں غیر ملکی نوکرانیوں سے خدمات لیتے ہوئے وہ خندقیں کھودنے اور ساری رات صحرائی کیمپوں میں

بہرہ دینے کے متعلق ہاجرہ کی کہانیاں سن کر ششدر رہ گئیں۔ "وہ مجھ سے کہتی رہیں، 'تمہیں واپس آنا ہوگا، تم نے بہت خوفناک فیصلہ کیا ہے۔' لیکن مجھے معلوم تھا کہ میرا فیصلہ بالکل درست ہے۔"

دریں اثنا امارات کی فوج میں کچھ سینئر افسروں نے خواتین ریکروٹوں کے پیش کردہ عمدہ نتائج کو تسلیم کرنا مشکل پایا۔ اکیڈمی کے کمانڈر لیفٹیننٹ کرنل محمد ناصر نے ابتدا میں ہی تسلیم کیا تھا کہ اسے خواتین جنگجوؤں کے حوالے سے کوئی خاص امید نہیں۔ "اگر ہماری آبادی بہت زیادہ ہوتی تو میں ان عورتوں کو گھر کی چار دیواری کے اندر ہی دیکھتا،" اس نے کہا۔ لیکن آہستہ آہستہ اُسے اپنے نکتہ نظر میں تبدیلی لانا پڑی۔ شروع میں اس نے شوٹنگ میں خواتین کے سکورز پر یقین کرنے سے انکار کر دیا۔ 40 میں سے 38 نمبرز کا سکور دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔" آخر ان عورتوں کی پرورش ایسے ماحول میں ہوئی تھی جہاں انہیں کھلونا ہتھیار سے کھیلنے کا موقع بھی نہیں ملتا۔ لیفٹیننٹ کرنل نے سوچا کہ ہائی سکورز کہیں عورتوں کی اکیڈمی میں بنائی گئی نئی شوٹنگ رینج میں کسی نقص کے عکاس تو نہیں۔ اپنے خیال کی تصدیق کے لیے اس نے مردوں کی شوٹنگ رینج میں ٹیسٹ دوبارہ کروایا۔ ایک کے بعد دوسری گولی عین ہدف پہ لگتے دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔

مشرقِ وسطیٰ جانے سے پہلے میں ہمیشہ ہر دلیل کے امن پسندانہ پہلو کی حمایت کیا کرتی تھی۔ اس کے برعکس واضح شہادت (گولڈا میئر، مارگریٹ تھیچر) موجود ہونے کے باوجود مجھے یقین تھا کہ اگر دنیا میں عورتوں کو زیادہ بارسوخ عہدے حاصل ہو جائیں تو یہ امن کا گہوارہ بن سکتی ہے۔ چنانچہ یہ بات بے تُکی اور کچھ المناک معلوم ہوتی تھی کہ عورتوں کے خواہش کردہ تمام حقوق مارنے اور مرنے کا حق حاصل کرنا تھا۔ مگر امارات کی عورتوں میں دریافت ہونے والی طاقت کو نہ سراہنا ناممکن تھا، ان کی مہارتوں اور چہروں پر دمکنے والی خود اعتمادی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔

ایک مرتبہ پہلے بھی اریٹریا میں مجھے اس پیراڈاکس کا سامنا کرنا پڑا۔ میں ایک افریقہ پہاڑی میں کھودی ہوئی خندق میں بیٹھی ہوئی تھی۔ کچھ میٹر دور ایتھوپیائی سپاہی دوربینوں کی مدد سے دیکھ رہے تھے کہ ہم میں سے کوئی اپنا سر کب اٹھاتا ہے۔ اس محاذ پر اریٹریا والی سائیڈ پر موجودہ سپاہیوں میں سے کوئی ایک سو عورتیں تھیں، بشمول کمانڈنگ افسر کے۔

اُن اریٹریائی گوریلا عورتوں نے جنگ کے بدترین انجام دیکھے تھے۔ ایک عورت نے

کلاشنکوف کا پورا راؤنڈ لگنے سے اپنی دوست کا جبڑا اڑتے دیکھا۔ دوسری نے بارودی سرنگ کے باعث زخمی ہونے والی دوست کا ہاتھ پکڑ کر (انستھیزیا کے بغیر) اس کی ٹانگ کٹتے دیکھی۔ عورتوں نے ایک دلگیر رجائیت کے ساتھ ان چیزوں کے متعلق بات کی۔ بیشتر کی پیدائش 1962ء میں لڑائی کے آغاز کے بعد ہوئی تھی۔ انہیں ایک جنگ زدہ ملک کے سوا کچھ بھی معلوم نہ تھا۔

امارات کی طرح اریٹریا کی عورتیں بھی گوریلوں کے ساتھ مل گئی تھیں کیونکہ انہیں ایسا کرنا درست محسوس ہوا تھا، سیاہ فام افریقہ کی سب سے بڑی فوج کا مقابلہ کرنے کے لیے مرد کم پڑ گئے تھے۔ ان کا معاشرہ امارات کی نسبت عورتوں کے ہتھیار اٹھانے کا زیادہ شدید مخالف تھا۔ 1960ء کی دہائی میں اریٹریا کے دیہات میں عورتوں کی حیثیت اس قدر پست تھی کہ عورت شدید ضرورت پڑنے پر ہی اپنے شوہر سے بات کر سکتی تھی۔ قرآن میں حیض کو ایک ''بیماری'' قرار دیے جانے کی روشنی میں اریٹریا کے دیہاتی حائضہ عورتوں کو ہر ماہ ہفتہ بھر کے لیے گھر سے نکال کر مخصوص کھائی میں چھوڑ آتے۔

ایتھوپیا میں جنگ شروع ہونے پر چند عورتوں نے لڑنے پر اصرار کیا۔ سترہ سال کی عمر میں ہتھیار اٹھانے والی چوچونیسفا ماریم نے کہا، ''ابتدا میں عورتوں کو مسترد نہیں کیا جا سکتا تھا، کیونکہ ان کی ضرورت تھی۔'' جنگجوئی جوش و خروش نے عورتوں کو بہ حیثیت مجموعی ایک نیا احترام دلایا اور بہت سے ٹیبو توڑے۔ شدید غربت سے دوچار اہل اریٹریا کے پاس چند ایک فیکٹریاں تھیں۔ لیکن جنگجو خواتین کی سہولت کی خاطر انہوں نے اپنے نہایت قلیل ذرائع کا ایک حصہ سینیٹری نیپکنز کا ایک پلانٹ نصب کرنے میں لگا دیا۔

محاذ پر حالات زندگی نہایت سخت گیر تھے۔ خوراک کی قلت کے باعث فاقوں کے شکار سپاہی دیے پر گزارا کرتے تھے۔ ان کا پہلی عالمی جنگ جیسا خندقوں کا نظام بلند پہاڑی سلسلے میں میلوں تک پھیلا ہوا تھا۔ رسد ہتھ گاڑیوں کے ذریعے نہایت ڈھلوانی چوٹیوں تک لانا پڑتی۔ عورتیں بھی یہ کام مردوں کے شانہ بشانہ کرتیں۔ ہر کوئی زمین پر سوتا تھا۔

گوریلوں کا تعلق مختلف طبقہ ہائے حیات سے تھا۔ جلا وطنی سے واپس آتے ہوئے نظریہ پرست یونیورسٹی طلبا جیسے کچھ گوریلوں نے عورتوں اور مردوں کا مل کر لڑنا بالکل فطری خیال کیا۔ جبکہ دیہاتی پس منظر رکھنے والوں کو یہ امر قبول کرنا مشکل لگا۔

تئیس سالہ گذر یےاور راسخ العقیدہ مسلمان اسماعیل ادریس نے اپنے خاندان سے باہر کی کسی عورت سے کبھی بات نہیں کی تھی۔ اچانک اسے ایک عورت سے احکامات وصول کرنا پڑے۔
"میں ابتدا سے ہی خواتین جنگجوؤں کے بارے میں جانتا تھا؛ میں نے ادھر اُدھر بکریاں چراتے ہوئے انہیں دیکھا تھا،" لڑائی میں مختصر تعطل آنے پر ایک چٹان پر دھوپ سینکتے ہوئے اسماعیل نے وضاحت کی، "لیکن کبھی یقین نہیں کر سکا کہ عورت بھی کسی مرد کو حکم دے سکتی ہے۔" اسماعیل کی کمپنی کمانڈر ایک مضبوط جسم والی، خاموش طبع، تقریباً اُسی کی عمر کی ایک عورت Hewit Moges تھی۔ وہ محاذ پر لڑنے کا تیرہ سالہ تجربہ اور مسیحی پس منظر رکھتی تھی۔ "یہ سب کچھ عملی طور پر ہوتے دیکھ کر میں اسے قبول کرنے لگا ہوں،" اس نے بدستور متذبذب آواز میں کہا۔ "وہ دوڑتی ہوئی چوٹی تک جاتی ہے، وہ لڑائی میں سپاہیوں کے آگے آگے ہوتی ہے، اور جب کوئی زخمی ہو جائے تو وہی اسے میدان جنگ سے لاتی ہے۔" اس نے ہاتھ پھیلا کر کندھے اچکائے، "یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لینے کے بعد میں اس کی مخالفت کیسے کر سکتا ہوں؟"

چند راتوں کے بعد ایک شادی کی وجہ سے لڑائی کچھ دیر کے لیے رکی۔ جنگجو ہمیشہ گروپس کی صورت میں شادی کرتے تھے۔ واحد جوڑا بکرے کے گوشت کی روایتی ضیافت کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ ایک نوجوان رقاصہ نے اناج کی بوری سے بنا ہوا کاسٹیوم پہن رکھا تھا جس پر "Gift of the Federal Republic of Germany" کے الفاظ لکھے تھے۔ اس کے پیچھے پیچھے 120 دلہنوں اور دلہوں کا جلوس آیا۔ ان سب نے ایک جیسا جنگی خاکی لباس پہن رکھا تھا۔ جوڑوں نے ہاتھ تھامے، ڈویژن کمانڈر نے نام پکار کر ان کے شوہر اور بیوی بننے کا اعلان کیا۔ جنگجوؤں کی خفیہ پرنٹ شاپ میں چھپی ہوئی شادی کی اسناد ہر جوڑے کو دی گئیں۔ سند پر 1977ء کے ازدواجی قانون کا یہ اقتباس درج تھا کہ یہ تعلق "محبت کی بنیاد پر دو افراد کی آزاد مرضی" کے مطابق ہے۔

میں نے ریت پہ بیٹھ کر ناموں کی طویل فہرست سنی۔ نور السینی کی شادی ملیے گابر یماریکلیسے، عبداللہ داؤد کی عابہ مریم سے ہوئی تھی۔ مسلمان اور عیسائی درجنوں کی تعداد میں ایک دوسرے سے شادی کر رہے تھے۔ ریت پر میرے ساتھ بیٹھی چوچو نے بتایا، "عین ممکن ہے کہ ان لوگوں کو ان کے والدین نے بتایا ہو کہ کسی مختلف عقیدے کے شخص کو کھانے میں شریک کر لینے تک فاقہ کرو۔" لیکن اس طویل جنگ کی خندقوں میں ان مردوں اور عورتوں کے پاس شراکت داری کی اور بھی بہت

سی بنیادیں موجود تھیں: خوف، فتوحات اور ایک نصب العین پر یقین۔ اندھیرے میں مجھے چوچو کا بس ہیولہ سا ہی دکھائی پڑ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک مدھم سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''جنگ کی پیدا کردہ ہر چیز ہی بری نہیں،'' اس نے سرگوشی کی۔

اور بدقسمتی سے امن کی پیدا کردہ ہر چیز ہی اچھی نہیں ہوتی۔ میں 1994ء میں واپس ایریٹریا آئی جسے ایک خودمختار ملک بنے ایک سال سے زائد عرصہ گزر چکا تھا۔ دارالحکومت اسمارا کسی جدوجہد کے بغیر گوریلوں کے قبضے میں آ گیا تھا۔ لڑائی کی تباہ کاریوں سے محفوظ اس کی اطالوی انداز کی عمارتیں ایک مدھم دھندلی سی روشنی میں نہائی ہوئی تھیں۔ گلیاں صاف تھیں، اور رات کے وقت بھی وہاں بحفاظت گھوما پھرا جا سکتا تھا۔ جنگ کے دوران سکول کے استادوں نے بھی AK-47 رائفلیں چلائی تھیں۔ اب کوئی بھی مسلح نہیں تھا، حتیٰ کہ ایئرپورٹ یا سرکاری عمارات کے دروازوں پر بھی نہیں۔ دنیا کی ایک نہایت عسکریت پسند آبادی نے ہتھیار پھینک دیے تھے۔

آخرکار ایک گوریلا تحریک نے اقتدار حاصل کر لیا تھا اور فوراً ہی بگاڑ کا شکار نہیں ہوئی تھی۔ تحریک کے قائدین اب بھی پلاسٹک کے سستے سینڈل پہنتے اور صدر سمیت کوئی بھی اہل کار تنخواہ نہیں لیتا تھا۔ وہ دیگر جنگجوؤں کی طرح اپنی محنت تعمیرِ نو کی کوششوں میں بطور چندہ شامل کرتے۔

لیکن امن نے جنگجو عورتوں کو کچھ غیر متوقع مایوسیوں سے دوچار کیا۔ نئی حکومت نے خواتین کو سیاست میں حصہ لینے اور نئے قانونی حقوق کی پیشکش کی، مثلاً زمین کی ملکیت رکھنے اور ورثہ میں منتقل کرنے کا حق۔ حکومت نے ہسپتالوں میں جنسی اعضا کی قطع پر بھی پابندی عائد کر دی۔ حکومت کے تعاون سے ریڈیو پر پروگرام نشر ہوئے جس میں مسلم مفتی اور عیسائی بشپ دونوں نے واضح طور پر قرار دیا کہ اس قسم کے دستور مذہبی لحاظ سے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔

پھر بھی وسیع پیمانے پر معاشرے کے رواج محاذ جنگ پر شکل پذیر ہونے والی ثقافت پر بھاری تھے۔ جنگجو اچانک اپنے خاندانوں میں واپس آئے جنہوں نے جنگ کا عرصہ ایتھوپیائی افواج کے زیر قبضہ بسر کیا تھا۔ اکثر گوریلوں کی ترقی پسندانہ اقدار والدین کی نہایت رجعت پسندانہ اقدار سے ٹکرائیں۔ آٹھ سال تک محاذ پر لڑنے والی تینتیس سالہ روزا Kiflemariam نے کہا، ''ان میں سے زیادہ تر ہماری عزت کرتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ہم نے ایک مختلف انداز میں زندگی گزاری ہے۔ لیکن کچھ دوسرے ہم سے کہتے ہیں، 'وہ تب کی بات تھی اب بات اور ہے، اور

اب تمہیں ہمارے طریقے کے مطابق رہنا ہوگا۔‘‘

1989ء میں روزا نے ایک اجتماعی تقریب میں اپنے ساتھی گوریلے سے شادی کی تھی۔ جوڑے نے قیام امن سے پہلے الگ الگ محاذوں پر لڑنے کے باعث بہ مشکل ایک ماہ ساتھ گزارا۔ اب روزا اور اُس کا شوہر زبردست خاندانی دباؤ میں ایک دوسرے سے شناسائی پیدا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ روزا کی ساس اپنی بہو کا کام پر باہر جانا پسند نہیں کرتی تھی۔ ساس چاہتی تھی کہ وہ اریٹریائی یونین میں فنانشل آفیسر کی نوکری چھوڑ دے۔ ’’وہ مجھے دیکھتے ہی کہتی ہے، ’تم بچے کیوں نہیں پیدا کرتی؟ تم گھر پر کیوں نہیں رہتی؟‘ ‘‘

بالخصوص دیہات میں خاندانوں نے سخت جان جوان عورتوں کو قبول کرنا مشکل پایا جو مطلق برابری کی عادی تھیں۔ گھر والوں نے طلاق پر زور دیا، اپنے بیٹوں کو جوان گھریلو لڑکیاں پیش کیں جو پالتو بن کر ان کا انتظار کرتیں۔ اس قسم کی لڑائیاں اس وقت شدید ہو جاتیں جب شوہر اور بیوی کا تعلق مختلف مذہبوں سے ہوتا۔

نوجوان، غیر شادی شدہ جنگجو عورت کے لیے مستقبل مسائل سے بھرپور تھا۔ ایک طرف وہ ہیروئن تھی، لیکن دیہات میں یہ چیز اسے ایک قابل خواہش دلہن نہیں بناتی تھی۔ دیہات میں اب بھی انکساری اور قطعی بکارت کو بہت زیادہ اہمیت دی جاتی تھی۔

روزا اور بہت سی دیگر عورتوں کے لیے ایک نئی جدوجہد شروع ہوئی۔ ’’اب ہمیں انہیں یہ سمجھانے کے لیے لڑنا ہے کہ ہر کسی کو آزادی سے زندگی گزارنے کا حق حاصل ہے۔ میرے خیال میں یہ ایک اور جنگ ہے۔‘‘

چھٹا باب

ایک ملکہ

عرب کے تجارتی راستے اب شکستہ شاہراہیں ہیں۔ اونٹوں کی لمبی لمبی قطاریں بھی ماضی کا قصہ بن چکی ہیں۔ اس کی بجائے ٹرک عقبہ سے مکہ تک صحرا اور گرد میں سفر کرتے ہیں۔ آج کل نخلستان کی جگہ ٹرک سٹاپ نے لے لی ہے جہاں کھجور تو درکنار گھاس کی ایک پتی تک نہیں ہوتی۔

میں 1989ء کے موسم بہار میں یہیں کے ایک مقام پر فساد کی رپورٹنگ کرنے گئی صحرائے اردن کے وسط میں مان نامی ایک غریبانہ قصبہ۔ اردن کے وزیراعظم نے گیس کے نرخوں میں اضافہ کر دیا تھا، اور مان کے ٹرک ڈرائیور احتجاجاً سڑکوں پہ نکل آئے تھے۔ وہاں سے ملک بھر میں پھیل جانے والے فسادات نے مشرق وسطیٰ کے طویل ترین برسر اقتدار بادشاہ حسین کا استحکام خطرے میں ڈال دیا۔ میں یہ کہانی کوئی نصف درجن مرتبہ لکھ چکی تھی۔ ایک غریب ملک کو امداد کی ضرورت ہے، آئی ایم ایف نے توجہ دی اور اقتصادی اصلاحات کا مطالبہ کیا، اس کی شرائط اس قدر سخت تھیں کہ لوگوں نے بغاوت کر دی۔

لیکن اس مرتبہ کہانی یکدم ایک نیا موڑ مڑ گئی۔ میں مان بینک کے جلے ہوئے سامان میں سے باقی بچی ہوئی واحد کرسی پر ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ میرے عین سامنے ایک الٹی کی ہوئی دراز پر ایک نہایت پریشان حال بدو بیٹھا ہوا تھا؛ اس کی کھردری عبا کے کنارے جل رہے تھے۔ گزشتہ ہفتے وہ قصبے میں لوٹ مچانے والے گروہ میں شریک ہوا تھا۔ ”مظاہرین نرخوں میں کمی چاہتے تھے۔ وہ

پہلے ہی بہت غریب ہیں، اور نرخ بڑھنے سے ان کے بچے روٹی سے بھی محروم ہو جائیں گے۔ لیکن ان کی چیخ و پکار صرف اس لیے ہی نہیں تھی۔'' اس نے یہ جاننے کے لیے ادھر اُدھر نظر دوڑائی کہ کہیں کوئی دیکھ تو نہیں رہا، اور بولا ''وہ بادشاہ سے ملکہ کو طلاق دینے کا مطالبہ بھی کر رہے تھے۔''

مشرق وسطیٰ کے بیشتر صحافیوں کی طرح مجھے بھی علم تھا کہ شاہ حسین نے ایک امریکی عورت سے شادی کی تھی۔ لیکن میں نے اسے سماجی صفحات کا پیٹ بھرنے کے لیے ایک حسین چہرہ ہی خیال کیا تھا، نہ کہ قیمتوں پر فساد میں نعروں کے ہدف کے طور پر۔

یہاں لوگوں کے ذہن میں ملکہ کے متعلق بہت سے سوالات ہیں،'' بدو نے کہا، اور پھر ایک ایک کر کے سوالات پیش کیے: ''کیا بادشاہ سے شادی کرنے کے وقت وہ باکرہ تھی؟ کیا وہ واقعی مسلمان ہے؟ اگر ہے تو پھر اپنا سر کیوں نہیں ڈھانپتی؟ کیا یہ بات درست ہے کہ وہ عیسائیوں کی پشت پناہی کر رہی ہے؟ اس کے خاندان کا تعلق حلب سے ہے؟ جہاں اس کا دادا پیدا ہوا) جہاں بہت سے یہودی رہتے ہیں۔ ہمیں کیسے معلوم ہوگا کہ اس کی رگوں میں یہودی خون نہیں؟ ہم نے سنا ہے کہ وہ سی آئی اے کی رکن ہے اور بادشاہ کو زہر دینے آئی ہے۔''

مشرقی وسطی کے جانے پہچانے سوالات اس بدو کو مشکل میں ڈالے ہوئے تھے: بالعموم امریکہ اور بالخصوص سی آئی اے؛ یہودی، اور اگر یہودی نہیں تو عیسائی؛ عورتوں کی جنسیت ''ماضی'' کا خوف بھی اور پردہ ترک کرنے کی صورت میں موجودہ آزادی کی دہشت بھی۔

اس کی باتوں کو سنجیدگی سے لینا مشکل تھا۔ تاہم، ایران اور مصر میں حکمرانوں کی بیویوں نے جلتی پر تیل کا کام کیا تھا، یا کم از کم ان پر تنقید پیش آمدہ مشکلات کا پیمانہ ضرور تھیں۔ شاہ کی ملکہ فرح اور سادات کی بیوی جہاں دونوں ہی جارحانہ حد تک جدید، اعلیٰ رتبے والی عورتیں تھیں جنہوں نے اصلاح کی خاطر لڑائی لڑی۔ ملکہ نور نے ایسا کیا کیا تھا کہ اتنی حقارت کے قابل بن گئی؟

54 سال کی عمر میں اس کا شوہر شاہ حسین مشرق وسطیٰ کا عظیم خزانہ تھا۔ وہ تیرہ سال کی عمر میں ایک قاتلانہ حملے میں بال بال بچا جس میں اس کا دادا مارا گیا تھا۔ 1951ء میں پندرہ سالہ حسین کو ایک ڈولتا ہوا تخت ورثہ میں ملا۔ اس نے 1967ء میں اپنی آدھی سلطنت، یعنی مغربی کنارہ اسرائیل کے قبضے میں چلے جانے کا خسارہ برداشت کیا؛ اس نے 1970ء میں فلسطینی پناہ گزینوں کی ایک مسلح بغاوت کو دبایا اور 1989ء میں اسے حکومت کرتے ہوئے چالیس سال پورے ہو گئے۔

اردنی معاملات سے ایک اسرائیلی تجزیہ نگار ڈان شیفتن نے لکھا،''وہ اُن سب لوگوں کے جنازوں میں شریک ہوا جنہوں نے پیش گوئی کی تھی کہ اس کی حکومت ایک ہفتہ بھی نہیں چلے گی۔''فسادات شروع ہونے کے بعد کچھ دن کے اندر اندر شاہ نے ضروری اقدامات کا حکم دیا'اس نے وزیراعظم زید رفائی کو معزول کیا اور اپنے بے چین عوام سے بائیس سال میں پہلی مرتبہ عام انتخابات کروانے کا وعدہ کیا۔میں سوچ رہی تھی کہ کیا نور (اس کی چوتھی اور طویل ترین عرصہ تک ساتھ رہنے والی بیوی) کے ساتھ اس کی شادی بھی حکومت کو بچانے کی نذر ہو جائے گی۔

جب فسادات شروع ہوئے تو بادشاہ اور ملکہ وائٹ ہاؤس، واشنگٹن میں کھانا کھا رہے تھے۔ گہرے نیلے شفون کے گاؤن میں نور کی تصاویر اور یہ افواہ کہ اُس کی بہن بھی فلم پروڈیوسر جارج لوکاس کے ہمراہ کھانے میں شریک ہوئی تھی، اس کی امریکی اقدار اور اصراف پسندی کے متعلق شکایات کی چنگاری کو بھڑکانے کا باعث بن گئی۔

میں نے محل میں شاہ کے ساتھ انٹرویو کرنے کی درخواست دے رکھی تھی۔کسی جواب کی توقع کے بغیر میں نے نئی ٹیلکس بھیجی کہ میں ملکہ سے بھی ملنا اور اس بارے میں بات کرنا چاہوں گی کہ وہ فسادیوں کا ہدف کیسے بن گئی تھی۔فوراً ہی جواب وصول کر کے میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی: بادشاہ اور ملکہ دونوں نے مجھ سے ملاقات پر رضامندی دیدی تھی، اور محل سے ایک کار ہوٹل میں مجھے لینے آئی۔

میں نے اپنی چادر سنبھالی، بیگ میں سے باریک لائنوں والا ریشمی اطالوی سوٹ نکالا جسے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتی اور''شاہانہ لباس''کہتی تھی اور اونچی ایڑی والی جوتیوں کا جوڑا بھی پہنا جو اپنی شادی کے بعد کبھی نہیں پہنا تھا۔یوں بن سنور کر میں سلور گرے مرسیڈیز میں سوار ہوئی۔

شاہی محل پرانے عمان کے مرکز میں ایک پہاڑی پر واقع ہے۔شہر کا رومن نام فلاڈلفیا تھا یعنی برادرانہ محبت کا شہر۔شاہی دربار اونچے اونچے آہنی دروازوں کے پیچھے اپنا کام جاری رکھتا جو برادرانہ نفرت سے بچنے کی خاطر ڈیزائن کیے گئے تھے۔میں پہلے بھی محل کے احاطے میں جا چکی تھی، لیکن بادشاہ کے دفتر (دیوان) سے آگے نہیں جہاں سپاہی پہرے پر کھڑے تھے اور سائلین شاہی حکم ملنے کا انتظار کر رہے تھے۔مجھے توقع تھی کہ ہماری ملاقات بادشاہ کے کتابوں سے سجے دفتر

میں ہوگی۔ لیکن کاردیوان کے مرکزی زینے کے پاس سے آگے گزری اور مجھے ایک بلیک ہاک ہیلی کاپٹر کے گھومتے ہوئے پروں تلے اتارا۔ شاہ پہلے ہی پائلٹ کی سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔ ''اوپر آ جاؤ'' اس نے اونچی آواز میں کہا اور اپنے پیچھے والی سیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

شاہ نے کنٹرول سٹک کو آگے کیا۔ ہم آہستہ آہستہ زمین سے اوپر اٹھے اور محل پر منڈلاتے ہوئے آگے بڑھے۔ چند سیکنڈ میں ہی شہر پیچھے رہ گیا۔ ہم زیتون کے قدیم درختوں اور سفیدی کی ہوئی چاردیواریوں کے اوپر سے گزرے۔ عمان میں ''نیویارک نیویارک پیزا'' نامی فاسٹ فوڈ جوائنٹس اور بڑی بڑی سپر مارکیٹس اردن کو ایک جانا پہچانا مغربی روپ دیتی ہیں۔ لیکن جدید تہہ ریت کی پرت جتنی ہی پتلی تھی۔ اس کے نیچے قدیم بائبلی لینڈ سکیپ میں بکریوں اور زیتون پر گزارا کرنے والے قبائلی رہتے تھے۔

ونسٹن چرچل شیخی بگھارا کرتا تھا کہ اس نے اتوار کی ایک دوپہر کو یک جنبش قلم سے اردن کو تخلیق کر دیا تھا۔ 1921ء میں قاہرہ میں ہونے والے ایک اجلاس میں چرچل اور ٹی ای لارنس (لارنس آف عریبیہ) نے اپنے حلیف عبداللہ (جس نے پہلی عالمی جنگ میں ترکوں سے لڑنے میں لارنس کی مدد کی) کو ایک تخت مہیا کرنے کی خاطر ایبا کی شکل جیسی ورائے اردن (Transjordan) ریاست تراشی تھی۔ عبداللہ کے باپ شریف حسین (جو رسول اللہؐ کی 35ویں پیڑھی میں تھا) نے مکہ اور حجاز کے خطے پر اس وقت تک حکومت کی جب السعود نے نجد کے صحرا سے شمال کی جانب قبضہ شروع کیا اور انہیں بے دخل کر دیا۔

فلسطینیوں نے 1951ء میں عبداللہ کو قتل کیا۔ اس کا بیٹا طلال ذہنی مریض تھا اور دو سال بعد ہی دست بردار ہو گیا۔ نوجوان حسین کو ایک ریاست کا تخت ورثے میں ملا جس میں خود اس جیسے صحرائی عربوں کی تعداد فلسطینی تارکین وطن کی نسبت تیزی سے گھٹ رہی تھی۔ اسرائیل کے ساتھ ہر لڑائی کے بعد مزید فلسطینی سرحد پار کر کے آ جاتے۔ عرب ریاستوں میں سے صرف اردن نے ہی مغربی کنارے سے آئے ہوئے فلسطینیوں کو شہریت دی۔ لیکن 1970ء کے ''سیاہ ستمبر'' میں حسین نے محسوس کیا کہ فلسطینی اس کی بادشاہت پر قبضہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس نے انہیں کچل ڈالا اور بہت سوں کی ہلاکت ہوئی۔

میں نے شاہ کے کریش ہیلمٹ کی طرف دیکھا جس کے پیچھے ''حسین اول'' چھپا ہوا تھا۔

مغرب میں شاہ کو محض ایک نرم گفتار، Harrow اور سینڈ ہرسٹ سے تعلیم یافتہ سفارت کار کے طور پر دیکھا جا سکتا تھا۔ لیکن اب وہ کہیں زیادہ قوی دکھائی دے رہا تھا: اپنے جدامجد کا پاسبان، امام، جنگجو اور قبائل کا سردار۔ اس کے عوام اپنے رہنما کو ایسا ہی دیکھنا چاہتے تھے۔ خارجہ پالیسی کی مصروفیات کے باعث حسین کا رابطہ عوام کے ساتھ منقطع ہو گیا تھا۔ اب وہ خلیج کو پاٹنے کی تیاریوں میں تھا۔

امریکہ اپنے کسی بھی غیر ملکی حلیف کا تختہ الٹنے پر حیرت کا اظہار کرنے میں کبھی ناکام نہیں رہا۔ میرے خیال میں اس کی جزوی وجہ یہ ہے کہ ہم نے ان آدمیوں کو صرف مغرب کے ساتھ تعلقات کے حوالے سے دیکھا۔ ہمیں نہیں معلوم کہ اپنے عوام کی نظروں میں ان کی اہمیت کیا تھی۔

جب حسین نے ایک صحرائی قصبے کی بیرونی حدود پر اپنا ہیلی کاپٹر اتارا تو منتظر ہجوم کے نعروں نے روٹرز کی آواز کو بھی مات دیدی ''بالروح، بالدم.....'' گرد کے غبار میں شاہ کی جانب اٹھے ہوئے چہرے مڑ گئے۔ جسم آگے کو امڈے، سپاہیوں نے انہیں یوں پیچھے دھکیلا جیسے ملک کے جانی دشمنوں سے نمٹ رہے ہوں۔ شاہ نے اپنا ہیلمٹ اتار کر گنجے سر پہ سفید اور سرخ کیفیہ پہن لیا۔ وہ ہجوم کے اندر گھس گیا۔

میں ہیلی کاپٹر سے اتری اور باڈی گارڈز کے دستے نے مجھے فوراً اس سے الگ کر دیا۔ ہجوم ایک واحد وجود کی طرح حرکت کرتا ہوا آگے بڑھا۔ میں نے خود کو ایک اور سمت میں گھسیٹا جاتا ہوا محسوس کیا۔ ایک بدو کے خنجر کی نوک میں پھنسنے کی وجہ سے میں نے اپنے شاہانہ سوٹ کی جیکٹ پھٹنے کی آواز سنی۔ میں نے اونچی ایڑی والے جوتوں پر خود کو گرنے سے بچایا۔ شاہی باڈی گارڈ کے ایک سپاہی نے مجھے دیکھ لیا۔ وہ ہجوم کو گالیاں دیتا اور پیچھے دھکیلتا ہوا آیا اور میرا ہاتھ تھام کر مسلسل گالیاں دیتے ہوئے نسبتاً پرسکون حلقے میں لے گیا۔ یہ حلقہ دیگر سپاہیوں نے شاہ کے گرد بنا رکھا تھا۔

ہم خیموں کی ایک قطار کی جانب بڑھے۔ نزدیک پہنچنے پر ایک غرغراتی آواز نے نعروں کو دبا دیا۔ بادشاہ کے عین سامنے ایک اونٹ گھٹنوں کے بل جھکا اور پھر سانس خارج کر کے گر گیا۔ اس کی گردن کے پاس خون کا ایک چھوٹا سے تالاب بنا ہوا تھا۔ روایت کے مطابق بادشاہ قربانی کے مقدس خون کے اوپر سے گزرا اور پھر باڈی گارڈز نے مجھے بھی گزارا۔

جب ہم سیاہ بکری کے بالوں سے بنے خیمے میں پہنچے تو ایک قبائلی نے لرزتے ہاتھوں کے ساتھ لمبوترے برتن میں سے گلاس نما کپ میں کافی انڈیلی۔ اس نے کپکپاتے ہوئے اپنا کپ منہ

تک اٹھایا اور چکھ کر ثابت کیا کہ اس میں زہر نہیں ہے۔ پھر بدستور کپکپاتے ہوئے اس نے شاہ کے لیے ایک اور کپ بھرا۔

وہ سارا طویل، حدت بھرا دن الف لیلہ ولیلہ کے ایک ٹیبو میں صرف ہوا: ایک برہنہ پا شاعر نے شاہ کا قصیدہ پڑھا؛ کالے نقاب میں لپٹی ایک بوڑھی بدو عورت (جس کے چہرے پر نیلے ٹیٹو کے نشان تھے) نے شاہ کی ہتھیلی پر ایک درخواست رکھی: کھانے کے وقت شاہ نے ایک طشت میں ہاتھ ڈالا جس میں چاول کے ڈھیر پر رکھے بکروں کے سروں سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ اس کے باپ کی عمر کے بوڑھے قبائلیوں نے احتراماً جھک کر اس کے کندھوں اور ناک پر بوسہ دیا، لیکن اپنے صحرائی انداز میں اُسے اس کی کنیت یعنی ابوعبداللہ سے مخاطب کیا۔

مجھے یاد نہیں کہ ہم ہیلی کاپٹر کے ذریعہ ان کی کتنی بستیوں میں گئے۔ دن گزرنے کے ساتھ ساتھ شاہ کی درشت خود ضبطی زائل ہوتی گئی۔ سہ پہر کے وقت میں ہیلی کاپٹر کو دوبارہ عمان میں اترتے دیکھ کر بہت حیران ہوئی۔ شاہ نے نرم آواز میں مجھے الندوہ (لال پتھر کے محل) میں چلنے کو کہا، ''نور ہمارا انتظار کر رہی ہے۔''

مرکزی راہداری میں داخل ہونے پر اس نے انکساری کے ساتھ مجھے ایک باتھ روم کی جانب بڑھایا اور خود قدیم بندوقوں اور تلواروں کے کیسز کے درمیان فارسی قالینوں پر چلتا ہوا مرکزی زینے کی طرف بڑھا۔ اس نے کسی نوجوان لڑکے کی طرح ایک قدم میں دو دو سیڑھیاں طے کیں۔

میں نے طلائی نلکوں میں سے نکلتے ہوئے گرم پانی سے منہ پر چھینٹے مارے اور ہوا کے باعث الجھے ہوئے گرد آلود بالوں میں برش کیا جو چمکتے ہوئے ماربل بیورو میں رکھا تھا۔ جب میں باتھ روم سے باہر آئی تو ملکہ زینے سے آہستہ آہستہ نیچے اتر رہی تھی۔ اس نے فلسطینی طرز کی طویل عبا پہن رکھی تھی۔ اس کے سونے سے بھی زیادہ چمک دار لمبے بال پشت پر کھلے ہوئے تھے۔ وہ ایک حسین و جمیل، دبلی پتلی اور بہت لمبی عورت تھی اپنے شوہر سے کم از کم پانچ انچ لمبی۔ سرکاری پورٹریٹس میں اسے ہمیشہ قد میں شوہر سے چھوٹا دکھایا گیا۔ پتا نہیں پورٹریٹ بنواتے وقت شاہ ایک ڈبے کے اوپر کھڑا ہوا تھا یا ملکہ ایک گڑھے کے اندر۔

ملکہ نے مسکرا کر اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور امریکی انداز میں زور سے مصافحہ کیا۔ اس نے کہا، ''میں نے ان سے پوچھا تھا کہ تم کیسی ہو۔ اور انہوں نے کہا، 'اس پر گرد پڑی ہوئی ہے،' لیکن مجھے

تو تم پر کوئی گرد نظر نہیں آ رہی۔ آؤ باغ میں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔ وہ سارے محل کی بہترین جگہ ہے۔ 1970ء میں انہیں بالائی منزل کی تمام کھڑکیوں میں بلٹ پروف شیشے لگانا پڑے۔ میرے خیال میں اندر کا ماحول بہت گھٹا ہوا ہے۔"

وہ فرانسیسی دروازوں میں سے گزر کر ایک ٹیرس پر آئی جس کے آگے لان اور پھولوں کی کیاریاں تھیں۔ دوپہر کی روشنی کی ٹھوس طلائی لکیریں فرش پہ پڑ رہی تھیں۔ ہم خوشبودار یاسمین کے قریب لگی چند کرسیوں کے قریب پہنچیں۔ میں نے اپنی نوٹ بک گھٹنوں پہ رکھ لی۔ نور نے کہا، "تمہیں ایک میز کی ضرورت ہے۔" اس نے لان کے اُس پار پڑی لوہے کی ایک میز دیکھی اور مدد کے لیے آنے والے خادم کو ہاتھ کے اشارے سے روک کر خود گئی اور اسے گھسیٹ لائی۔ وہ 1969ء میں پرنسٹن میں پہلی کوایجوکیشن کلاس کی ہاکی ٹیم میں رہ چکی تھی۔ اب وہ گھڑسواری کرتی، ٹینس کھیلتی اور ہفتے میں دو یا تین مرتبہ جسمانی ورزش کرتی تھی۔

ایک ویٹر طلائی رم والے گلاس میں میرے لیے مالٹے کا تازہ جوس لایا۔ ملکہ نے اپنی جڑی بوٹیوں سے تیار کی گئی چائے کی چسکی لی، نظریں سیدھی میری جانب کیں، اور سیدھے صاف انداز میں فسادات کے متعلق اپنے خیالات بیان کر دیے۔ اس نے کہا، "جب یہ واقعہ ہوا تو ہم واشنگٹن سے سیدھے گھر آئے۔ جونہی ہم واپس پہنچے، میری ایک دوست نے مجھے سب کچھ تفصیل سے بتایا۔ میرے بارے میں قطعی جھوٹی افواہیں۔" وہ دوست لیلیٰ شرف تھی، اردن کی واحد خاتون سینیٹر اور ملکہ کے رازداروں میں سے ایک۔ "کچھ باتیں تو اتنی واہیات تھیں کہ انہیں مذاق سمجھنا چاہیے، ورنہ یہ آپ کو کچل ڈالیں گی۔ میرا مطلب ہے کہ میری حیثیت کے کسی بھی شخص کے متعلق باتیں ہمیشہ ہوتی رہتی ہیں، چاہے میں کچھ بھی کر لوں۔"

دولت مند عمان کی خواہش ہرگز ڈھکی چھپی نہیں تھی کہ شاہ ایک غیر ملکی کی بجائے اپنی ہی کسی ہم وطن کو بیوی بنائے۔ اس کی پہلی بیوی دینا عبدالحمید یونیورسٹی سے تعلیم یافتہ مصری النسل انٹلکچول تھی، عمر میں شاہ حسین سے نو سال بڑی۔ اٹھارہ ماہ اور ایک بیٹی کی پیدائش کے بعد اچانک طلاق ہو گئی۔ دینا مصر میں چھٹیاں منا رہی تھی کہ اسے تعلق ٹوٹنے کی خبر ملی۔ بعد میں دینا نے بتایا کہ اگلے چھ سال کے دوران اُسے صرف ایک مرتبہ اپنی بیٹی سے ملاقات کی اجازت دی گئی۔ شاہ کی اگلی نظر انتخاب انیس سالہ ٹونی گارڈینر پہ پڑی جو ایک برطانوی فوجی افسر کی بیٹی تھی۔ اس کے ساتھ شاہ کی

ملاقات ایک ڈانس کی تقریب میں ہوئی اور اس نے رشتے کے تمام ممکنہ نقصانات کو نظر انداز کر دیا۔ اس نے ٹونی کا نام بدل کر مونا الحسین (حسین کی خواہش) رکھا۔ ان کے ہاں دو بیٹے اور جڑواں بیٹیاں پیدا ہوئیں، لیکن 1972ء میں خواہشات تبدیل ہونے پر شاہ نے اسے طلاق دی اور فلسطینی نسل کی اردنی لڑکی عالیہ ٹوکان سے شادی کر لی۔

عالیہ اس کی پہلی ایسی بیوی تھی جسے اس نے ملکہ کا خطاب دیا۔ سیاہ ستمبر کے زخموں کو بھرتے اور سلطنت کو قدیم قبائلی انداز میں متحد کرنے کے لیے وہ بہترین انتخاب تھی۔ اس کا بیٹا شہزادہ علی 1975ء میں پیدا ہوا اور مونا کے بطن سے شاہ کے بڑے شہزادوں پر فوقیت حاصل کر کے ولی عہد بنا۔ عالیہ نے ایک بیٹی کو بھی جنم دیا اور ایک بچے کو گود لیا جس کی ماں ایک ہوائی حادثے میں ماری گئی تھی۔ عالیہ کو بھی مرنے سے قبل اپنے خلاف افواہیں سننا پڑیں۔ لیکن فروری 1977ء میں ہیلی کاپٹر گرنے سے اس کی اچانک موت نے اسے ہمیشہ کے لیے شاہ کی محبت اور ملک کی ملکہ کا درجہ دلا دیا۔

چنانچہ سولہ ماہ بعد 26 سالہ لیزا حلبی (Lisa Halaby) کو شاہ کے ساتھ شادی کرنے پر ایک سخت اقدام کرنا تھا۔ پس منظر میں کوئی بھی ایسی بات موجود نہ تھی جو اسے تیار کرتی۔ اس کی پرورش واشنگٹن کے ایک امیر کبیر اور بارسوخ گھرانے میں ہوئی تھی۔ اس کی ماں، سویڈن سے آئے ہوئے ایک مہاجر کی بیٹی، نے ایک شامی مہاجر کے بیٹے نجیب حلبی سے شادی کی (اور بعد میں طلاق لے لی تھی)۔ نجیب کامیابی کی ایک داستان تھا جس نے صرف انگلش بولتے ہوئے پرورش پائی اور بزنس و سرکاری ملازمت دونوں میں تیزی سے منازل طے کیں۔ وہ Pan Am ایئر لائن کا چیف ایگزیکٹو بنا اور صدر کینیڈی و صدر جانسن کے ماتحت فیڈرل ایوی ایشن اتھارٹی کا انتظام چلایا۔ اس کی دلچسپی خارجہ پالیسی کی بجائے ملکی سیاست میں تھی، اور اس کی بیٹی کو اپنے گھر میں ہونے والی بحثوں میں مشرق وسطیٰ پر کوئی گفتگو یاد نہیں تھی۔ پھر بھی وہ اپنے عربی ورثے کے ساتھ گہرے لگاؤ کی دعویدار تھی۔ "50ء کا سارا عشرہ حالات سے مطابقت اختیار کرنے سے عبارت تھا، اور میرا خیال ہے کہ میں نے اس کے خلاف بغاوت کی۔ جب ہر کوئی ایک جیسا بننا چاہتا تھا، میں ایسی چیزوں پہ ڈٹی رہی جو مجھے منفرد بناتی تھیں۔" اس نے ایک واشنگٹن کیتھڈرل سکول میں اپنے ہم جماعتوں سے یہ بھی کہا کہ اسے لیزا حلبی کی بجائے لیزا مرد حلب (Lisa Man-of-Halab) پکارا کریں، کیونکہ اس کے نام کا لفظی مطلب یہی تھا۔

پرنسٹن سے اس نے آرکیٹکچر اور اربن پلاننگ میں بی اے کیا اور گریجوایشن کے بعد چار سال کے دوران تہران میں ٹاؤن پلاننگ کی سکیمز اور سڈنی میں آرکیٹیکچرل پراجیکٹس پر بطور ڈرافٹس وویمن کام کیا۔ اردن میں اس نے قومی ایئرلائن کے ساتھ بطور ڈیزائنر ملازمت کی۔ اردن کی ایئر لائن کو پہلا جمبو جیٹ دینے کی تقریب میں ہی نجیب حلبی نے اپنی بیٹی کو شاہ حسین سے متعارف کروایا۔ شاہ نے اسے محل میں لنچ کی دعوت دی اور پانچ گھنٹے تک اس کی مہمان نوازی کے دوران اسے محل دکھایا اور اپنے بچوں سے ملوایا۔ اگلے چھ ہفتوں کے دوران وہ تقریباً ہر رات کو اکٹھے ڈنر کرتے رہے۔ بعد میں انہوں نے شاہ کی موٹر بائیک پر عمان کی پہاڑیوں پر سیر کی، جبکہ باڈی گارڈز ایک محتاط فاصلے پر پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔

ایئرلائن کے لیے کام کرتے ہوئے اور انٹرکانٹی نینٹل میں مقیم لیزا نے معاشقے کو خفیہ رکھا۔ ایک اردنی شخص کی امریکی بیوی ربیکا سالتی اس کی کافی اچھی دوست بن گئی تھی۔ اسے یاد تھا کہ اُس موسم گرما میں وہ ہوٹل سے باہر بھاگتی ہوئی آئی تھی۔ ''باہر بہت گرمی تھی اور ہم دونوں فٹ پاتھ پہ بیٹھ کر ادھر اُدھر کی باتیں کرتی رہیں۔ اب سوچتی ہوں کہ وہ کچھ کھوئی کھوئی سی تھی۔'' اسی روز شاہی محل نے شاہ حسین اور لیزا کی منگنی کا اعلان کر دیا، جو اب نور الحسین (حسین کا نور) کے نام سے جانی جاتی تھی۔ سرکاری اعلان میں یہ بھی کہا گیا کہ نور نے اسلام قبول کر لیا تھا۔

''جب اس نے شادی کی پیشکش کی تو میں نے کافی دیر تک سوچ بچار کی۔ میں اس کے لیے اپنے احساسات کے متعلق ہرگز بے یقین نہیں تھی۔ میرے جذبات تو اس قدر مضبوط تھے کہ میں اپنے سے زیادہ اس کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ میں روایتی بیوی نہیں۔ میں اس کے لیے باعث تنازع نہیں بننا چاہتی تھی،'' نور نے بتایا۔

اور اب وہ باعث تنازع بن گئی تھی۔ یہ نشان دہی کرنا مشکل نہیں تھا کہ گڑبڑ کہاں ہوئی۔ شروع میں اردن کے لوگ گرم جوش تھے۔ وہ شادی کے ابتدائی دنوں کے متعلق سوچتے ہوئے کہنے لگی، ''مجھے اس قدر چھلکتے ہوئے جذبات کی امید نہیں تھی۔'' اردن کے دیگر لوگوں کو بھی وہ سب کچھ یاد تھا۔ عمان کے ایک بزنس مین Metri Twall نے کہا، ''اس نے عربی میں تقریر کرنے کی کوشش کی۔ درمیان میں ہی کہیں وہ ایک دم گھبرا گئی اور یوں لگنے لگا جیسے ابھی رو پڑے گی۔ سارے سامعین اس کے ساتھ تھے۔ لوگ پکارے، 'گھبراؤ مت، ہم تمہیں پسند کرتے ہیں، ہم بہت

اچھی جاری ہو۔" چھ سال میں چار بچوں کی پیدائش نے بھی خاندان بنانے کے خبط میں مبتلا عوام کو خوش کیا۔

وہ تیل کے کاروبار میں تیزی کے سال تھے، جب ذہین اردنی خلیج میں ملازمت کر کے دولت کما سکتے تھے۔ وطن واپس آ کر انہوں نے بوگن ویلیا سے بھرے ہوئے بنگلے بنائے جہاں دبیز قالینوں پر فلپائنی خادم ننگے پاؤں چلتے اور صرف آرائشی فواروں میں پانی گرنے کی آواز ہی سنائی دیتی تھی۔

اصراف پسندی کے اس دور میں نور نے ابتدا میں تو اپنے نئے عوام کے درمیان نسبتاً کم فضول خرچ بنی رہی۔ جون 1978ء میں اس کی شادی شاہی معیار کے حساب سے کم تر تھی۔ تقریب شاہ کی ماں کے محل کے باغات میں منعقد ہوئی۔ منگنی اور شادی کی تصاویر میں وہ ایک غیر شاہانہ دلہن دکھائی دیتی ہے۔ لیکن یہ سادہ انداز جلد ہی غائب ہو گیا۔ نارمن پارکنسن جیسے بین الاقوامی فوٹوگرافر اردن آئے اور ان کے پیچھے پیچھے میک اپ آرٹسٹوں نے بھی وہاں کی راہ لی۔ انطونی کلیویٹ مشہور شخصیات (مثلاً ڈیوڈ بووی اور صوفیا لورین) کو امتیازی "تاثر" دینے میں خصوصی مہارت رکھتا تھا۔ اس نے نور کو ایک چمک دمک اور شاہانہ شان عطا کی جو عمدہ زیور اور فرانسیسی ملبوسات کے ذریعے اور بھی بڑھ گئی۔ شاہ اور اس کی خوب صورت بیوی شاہی اور ریاستی حلقے کا نگینہ بن گئے۔ اب انہیں کینسنگٹن پیلیس کے بالمقابل لندن والے ایڈریس پر یا ویانا کے قریب پہاڑی بنگلے پر دیکھنا بھی ممکن تھا۔

لیکن عمان کے لیے سخت دور آنے لگا تھا۔ تیل کے کاروبار کا سنہری دور ختم ہوا اور ہوشیار نوجوان اہل اردن خلیج میں دولت کمانے کے قابل نہ رہنے کے باعث گھر پر ہی ٹھہر گئے۔ معاشی تنگی نے مایوسی کو جنم دیا اور مایوسی نے بنیاد پرستی کو۔ اسرائیل کے لیے امریکہ کی حمایت نے ہمیشہ سے موجود امریکہ مخالف جذبات کی چنگاری کو بھڑکا دیا۔

عمان میں فسادات کے بعد ہر کوئی ملکہ کو فضول خرچی کی وجہ سے تنقید کا نشانہ بناتا نظر آیا۔ ایک نوجوان بزنس مین نے کہا، "وہ ہماری ایمیلڈا مارکوس بن گئی ہے۔" حتیٰ کہ سرکاری حکام نے بھی آواز میں آواز ملائی۔ ایک ممتاز سیاست دان نے کہا، "لوگوں کو وہ جوان لڑکی یاد ہے جو بلیو جینز میں یہاں آئی تھی۔ وہ کسی سادہ لوح ملکہ کی توقع کر رہے تھے، نہ کہ زیور سے لدی ہوئی اور یورپ

کے چکر لگانے والی ملکہ کی۔"

اس نے کہا کہ شہر غصے کی تازہ ترین لہر سے لرز رہا تھا۔ شاہ اردن کی تباہ حال معیشت کو ٹھیک کرنے کی خاطر مدد مانگنے کویت گیا ہوا تھا، جبکہ ملکہ شاپنگ کرتی پھر رہی تھی۔ اس نے کہا، "ملکہ نے ایک زیور خریدا جس کی قیمت اڑھائی لاکھ ڈالر ہے۔ ایک کویتی اخبار نے چیک کی تصویر اس شہ سرخی کے ساتھ شائع کی: شاہ مانگتا ہے اور ملکہ لٹاتی ہے۔" میں نے کہا کہ کیا مجھے اس آرٹیکل کی ایک کاپی مل سکتی ہے۔ اس نے کہا، "ٹھیک ہے، لیکن میں نے وہ آرٹیکل خود نہیں دیکھا۔ میرے ایک دوست نے مجھے بتایا تھا۔" اگلے چند دن کے دوران میں عمان میں وہ آرٹیکل تلاش کرتی رہی۔ ایک دوست نے مجھے ایک پڑوسی کے پاس بھیجا جس نے ایک دکاندار کا حوالہ دیتے ہوئے بتایا کہ اس کا بیٹا ہر صورت میں مجھے آرٹیکل کی کاپی فراہم کر دے گا۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ میں نے ہر ایک عربی انفارمیشن سروس سے رابطہ کیا اور غیر ملکی سفارت خانوں میں پریس اتاشیوں سے پوچھا۔ مگر بے سود۔ آخر کار میں نے کویتی ٹیلی فون ڈائریکٹری نکالی اور باری باری امارات کے ہر ایک اخبار کو فون کیا۔ ہر اخبار کے دفتر سے یہی جواب ملا: ایسا کوئی آرٹیکل کبھی چھپا ہی نہیں۔ لیکن ہر اردنی شخص کے ذہن پر یہ خبر نقش ہو چکی تھی۔

شاہ بھی باغ میں ہمارے پاس آ گیا۔ اس نے اپنی نرم آواز میں دھیرے سے کہا، "میرے کسی قریبی شخص کا ہدف بن جانا فطری بات ہے۔" بدوؤں اور ان کے راہنما کے درمیان قدیم بندھن نے براہ راست تنقید کی راہ میں کافی رکاوٹیں پیدا کر رکھی تھیں۔ دوسری جانب عورتیں ایک آسان ہدف تھیں۔ جب بھی مشرق وسطیٰ میں حالات خراب ہوئے، سب سے پہلا نشانہ عورتیں ہی بنیں۔ ایک بنیاد پرستانہ انقلاب ملکی معیشت کو تو فوراً ٹھیک نہیں کر سکتا، لیکن عورتوں کو نقاب اوڑھنے کا حکم ضرور دیا جا سکتا تھا۔ اگر اہل اردن ناخوش تھے تو وہ اپنے شاہ کو سزا نہیں دے سکتے تھے۔ لیکن وہ اس کی بیوی کی زندگی ضرور عذاب بنا سکتے تھے۔

شاہ حسین ہمیشہ سے ایک قابل رسائی حکمران تھا جو مغربی پریس کو سمجھتا تھا۔ اس نے شاذ ہی کبھی مشرق وسطیٰ کے امور پر اپنی رائے دینے کا کوئی موقع گنوایا۔ لیکن 80ء کی دہائی کے اواخر میں حالات بدلنے لگے۔ 1987ء میں جب میں مشرق وسطیٰ میں نامہ نگار بنی تو اس تک پہنچنا مشکل ہو چکا تھا۔ وہ اپنے محافظ مشیروں کی ناقابل نفوذ ڈھال کے پیچھے چھپا رہتا۔ وہ سب مشیر درمیانی عمر

کے مرد تھے، سب کے سب ایک جیسے: ذہین اور امرا پسند، مگر بادشاہ کے سامنے سجدہ ریزی کی حد تک فرماں بردار۔ معزول وزیر اعظم زید رفاعی ایک جرأت مند سفیر تھا۔ وہ اردن کے خطرناک پڑوسیوں شام، عراق، اسرائیل اور سعودی عرب کے بدلتے ہوئے رجحانات کا عمیق تجزیہ کرسکتا تھا۔ لیکن اس کی اندرون ملک سیاست زبردست ناکامی سے دوچار ہوئی۔ استبدادیت پسندی نے اسے اردن کے عام لوگوں کی نظر میں ناقابل اعتبار بنادیا۔ اسی کی ہدایت پر پریس اور ٹی وی پر مکمل کنٹرول قائم کیا گیا۔ خفگی پر مبنی کوئی ہلکی سی سرگوشی بھی بالخصوص فلسطینی پس منظر والے شہریوں کو جیل خانے میں پہنچانے کے لیے کافی تھی۔ مجھے یہ بات بہت مضحکہ خیز لگتی تھی کہ 1987ء اور 1988ء میں جب اسرائیل اپنے فلسطینیوں کے ساتھ سول جنگ میں مشغول تھا تو میں مغربی کنارے یا غزہ پر کہیں بھی قائم کسی بھی کیمپ میں جا کر گفتگو کرسکتی تھی۔ لیکن دریائے اُس پار اردن میں فلسطینی کیمپ کا دورہ کرنے کے لیے پرمٹ اور خفیہ پولیس کے حفاظتی دستے کی ضرورت تھی جس کی موجودگی کھل کر بات چیت کرنا ناممکن بنادیتی۔

حسین نے اپنی بیوی کی طرف یوں دیکھا جیسے اپنی وجہ سے اسے پیش آنے والی مشکلات کی معافی مانگ رہا ہو۔ ”یہ سب کچھ نور کے لیے بہت دکھ اور مشکل کا باعث ہے۔ اس نے اردن کی خاطر یہاں اور باہر بہت کچھ کیا ہے۔“

نور نے تسلیم کیا کہ کچھ تنقید کو وقعت دینی ہی چاہیے۔ وہ اپنے طرز عمل پر غور وخوض کررہی تھی: کہ کونسی چیزوں کو تبدیل کرسکتی ہے، اور کونسی چیزوں کو ہرگز نہیں چھوڑے گی۔ اس نے اپنا سٹائل تبدیل کرنے کا فیصلہ کافی حد تک کرلیا تھا، لیکن اپنا جوہر نہیں۔ فسادات کے بعد اس نے تقریباً مکمل طور پر اردن میں بنے ہوئے کپڑے پہننا شروع کردیے بال گاؤنز سے لے کر بلیو جینز تک۔ بھاری زیور کہیں الماری میں رکھ دیے گئے اور ان کی جگہ کم قیمت ملکی زیور نے لے لی، جیسے جڑاؤ کنگن۔ ہماری پہلی ملاقات کے کچھ ہی دن بعد اس نے مجھے اپنے ساتھ Jerash چلنے کی دعوت دی تاکہ وہاں آرٹس کے سالانہ میلے کی تیاریاں دیکھ سکوں۔ اس نے پنڈلیوں تک لمبی ایک خاکی قمیض پہن رکھی تھی، جبکہ میری قمیض صرف گھٹنوں تک تھی۔ اگلے روز میں اخبارات میں چھپنے والی تصویر میں خود کو ملکہ کے پیچھے دیکھ کر خوش ہوئی۔ تصویر کو ری ٹچ کرکے مجھے ٹراؤزرز پہنا دیے گئے تھے۔ یقیناً ملکہ کے ٹولے میں شامل کسی عورت کی برہنگی بھی برداشت نہیں کی جاسکتی تھی۔

لیکن ملکہ اسلامی سکارف پہننے کے مطالبات ماننے کو تیار نہیں تھی۔ ”میں کبھی ایک تو کبھی دوسرے گروپ کے لیے نہیں کھیلتی۔ اور اب بھی ایسا کرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ میرے خیال میں معاشرے میں روایتی کردار اور عملی کردار کے درمیان توازن کرنا ممکن ہے، اور میں ایسا کر بھی رہی ہوں،“ اس نے کہا۔

وہ کردار یعنی اس کے پروجیکٹس جاری رہے گا، مگر اس نے دلگیر انداز میں کہا، ”کچھ لوگوں کو سمجھ آنے میں کئی سال لگ جائیں گے۔“ اس نے شاہ سے شادی کرتے وقت پوچھا تھا کہ اسے کیا کچھ کرنا ہوگا۔ ”اس نے کہا تھا، ’مجھے یقین ہے کہ تم جو بھی فیصلہ کرو گی وہ درست ہوگا۔‘ “ اس وقت شاہ کو اس پر پورا بھروسہ تھا۔ لیکن سرکاری حکام سے اس کی ابتدائی ملاقاتیں زیادہ حوصلہ افزا ثابت نہ ہوئیں۔ ایک وزیر نے اصرار کے ساتھ مشورہ دیا کہ وہ اپنا عوامی کردار کبھی کبھار افتتاحی تقاریب میں شرکت تک ہی محدود رکھے۔

اردن کی ایک ایگزیکٹو رانیہ کھدری نے کہا، ”یہ بات ہر کوئی سمجھ جاتا۔ اگر آپ آرام سے گھر بیٹھیں اور صرف بچے پالتی رہیں تو کسی کو کوئی اعتراض نہیں۔ جونہی آپ اس معاشرے میں بطور عورت کوئی مختلف کام کرنے لگتی ہیں، آپ فوراً افواہوں اور تنقید کا ہدف بن جاتی ہیں۔“

لیکن نور ملازمت سے ملتے جلتے کسی کام کے بغیر زندگی کا تصور نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے کہا، ”میں نے ہمیشہ کام کیا ہے۔“ شروع میں وہ اپنے سابقہ پیشے سے منسلک منصوبوں میں مشغول رہی: اربن پلاننگ، تعمیراتی قوانین اور ماحولیاتی مسائل۔ بچے پیدا ہونے پر وہ ماں اور بچے کی صحت و تعلیم کے معاملات میں زیادہ دلچسپی لینے لگی۔ پھر اس نے عورتوں کی ٹریننگ اور روزگار، کھیلوں اور ثقافت میں بھی دلچسپی لی۔ 1985ء میں وہ ایک بہت بڑی فاؤنڈیشن کی سربراہ تھی جس کا دفتر شاہ عبداللہ کے محل میں بنایا گیا تھا۔ اس کے منصوبے عورتوں، بالخصوص دور دراز دیہی علاقوں کی عورتوں کے لیے تھے۔ بہت سے بدو قبائل نے موسمی ہجرتیں ترک کر کے عارضی بستیوں میں رہنا شروع کر دیا تھا جہاں ٹرانسپورٹ، پینے کے صاف پانی، صحت کی سہولیات وغیرہ موجود نہیں تھیں۔ ٹاؤن پلانر لیزا حلبی نے ان جگہوں کو دیکھا اور مختلف طور پر تصور کیا۔ اردن کی ملکہ نور نے سیاست دانوں کو اس جانب رغبت دلائی۔ اردن کا نظام چلانے والے مرد ایک نوجوان خاتون سے احکامات لینے کے عادی نہیں تھے۔

اور ملکہ سے امداد یافتہ عورتوں کے شوہروں نے اس امداد کے اثر کو ہمیشہ ہی پسند نہ کیا۔ جبل بنی حمیدہ پر چٹائیاں بُننے کے ایک منصوبے کو زبردست کامیابی حاصل ہوئی تھی کیونکہ عورتیں گھر میں ہی سادہ روایتی کھڈیوں پر کام کر سکتی تھیں۔ ملکہ نے ڈیزائن اور تنظیم میں مدد دی، اور پھر وہ چٹائیاں اردن کے سرکاری مہمانوں کو بطور تحفہ دینے کے لیے خرید لیں۔ وہ عورتوں سے ملنے بھی گئی، ان کے پاس زمین پر بیٹھی اور ان کے مسائل سنے۔ چٹائیوں سے ہونے والی آمدنی براہ راست عورتوں پر خرچ ہوتی، جس کے باعث انہیں اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ خود انحصاری کا احساس ہوا۔ ان میں سے ایک عورت چٹائیوں سے کمائی ہوئی پہلی رقم سے طلاق کا مقدمہ دائر کرنے کے لیے بس کا کرایہ دے کر شہر گئی۔

نور کی کچھ اور بھی دلچسپیاں تھیں جو مذہبی انتہا پسندوں کو ایک آنکھ نہ بھائیں۔ Jerash میں آرٹس کے میلے کو برباد کرنے کی دھمکیاں موصول ہوئیں جس کی سرپرستی میں وہ سب سے آگے تھی۔ میلہ ہر سال پھیلتا جا رہا تھا۔ اس میں عرب شاعروں جیسے روایتی آرٹسٹ بھی آنے لگے، بلکہ یورپی اہل فن کی توجہ بھی بڑھتی جا رہی تھی، جیسے غیر ملکی بیلے کمپنیاں۔ بنیاد پرست ان کمپنیوں کی سرگرمیوں کو مخرب الاخلاق خیال کرتے تھے۔ انہوں نے سکالرشپ بورڈنگ سکول کھولنے کی بھی مخالفت کی جس کی مالی معاونت ملکہ نے کی۔ یہ سکول کو ایجوکیشنل ہونا تھا اسلامی بنیاد پرستوں کے لیے ایک قابلِ تنفر بات۔ عمان میں بدوؤں کو اس قدر تشویش میں مبتلا کرنے والے "عیسائی مقاصد" مینونائٹس، اینگلیکنز اور رومن کیتھولکس جیسی ڈینامینیشنز کے ساتھ کام کرنے کا نتیجہ تھے جنہوں نے اردن میں پناہ گزینوں کے لیے رفاہی پروگرام شروع کر رکھے تھے۔

جب بھی کبھی نور نے اسلام قبول کرنے کی بات کی، تو اس نے ہمیشہ یہودوی عیسائی روایت کی اقدار کے ساتھ اسلام کی مطابقت پر زور دیا جس میں وہ پلی بڑھی تھی۔ وہ اسلام کی انسانیت پسندی اور ہمہ گیر کردار کی "بالکل درست" تصویر اجاگر کرنے کی ضرورت پر زور دیتی تھی۔ اس نے "انتہا پسندوں" پر تنقید کی کہ وہ عقیدے کی ایک مسخ شدہ تصویر پیش کر رہے تھے۔

عین فسادات کے دوران واشنگٹن سے اپنی اچانک واپسی کے بعد وہ اپنے روزمرہ مصروفیات کی ڈائری کے خالی صفحات کو گھورتی رہتی۔ اب اسے ان میں اندراجات کا فیصلہ کرنا تھا۔ تنقید سے دامن بچانا یا باہر نکلنا اور اس کا سامنا کرنا۔ وہ باہر نکلی۔ "آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنا یا راستہ بدلنا آسان

ہوتا ہے،'' اس نے ہلکے گلابی رنگ کی کیاری پر پڑتی ہوئی روشنی کی ایک دھار کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''میرے پاس بچوں کے لیے فالتو وقت ہوگا'' اس کے اپنے بچوں کی عمریں اس وقت نو، آٹھ، چھ اور تین سال تھیں ''لیکن میں ان جوان لوگوں کی جانب اپنی ذمہ داری محسوس کرتی ہوں جو میرے جیسے ہی خواب دیکھتے ہیں لیکن انہیں کھل کر بیان کرنے کی قوت نہیں رکھتے۔ میرے پیچھے ہٹ جانے سے وہ مایوس ہو جائیں گے خاص طور پر عورتیں۔'' عوام کے ساتھ ابتدائی روبروئی اچھی رہی تھی۔ ''مجھے یہ جان کر راحت ملی کہ ساری بکواس کا کوئی اثر نہیں پڑا تھا، خدا کا شکر ہے۔ مجھے فکر تھی کہ آیا افواہیں میرے ساتھ لوگوں کے تعلق کو متاثر کریں گی یا نہیں۔ لگتا تھا کہ بس ایک لہر آئی اور گزر گئی..... اگرچہ آپ اس احساس سے کبھی بھی باہر نہیں آتے کہ لوگ اس انداز میں بھی محسوس کر سکتے ہیں۔''

بعد میں جب نور کے ساتھ واقفیت بڑھی تو اس نے رازداری سے بتایا کہ وہ اپنے اوپر تنقید کرنے والوں کو ایک متبادل جواب دینے کا سوچ رہی تھی. ایک اور بچہ پیدا کرنا۔ ''میں نے سوچا کہ اس طرح ہر کوئی خوش ہو جائے گا۔'' لیکن انجام کار اس نے یہ ارادہ ترک کر دیا۔ ''میں ایک اور بچہ بڑے شوق سے پیدا کرتی، لیکن مجھے خاندانی منصوبہ بندی کا مثالی نمونہ بھی بننا تھا،'' اس نے کہا۔ میں ہنس کر بولی کہ شاہ کے گیارہ بچے اس کو جھٹلانے کے لیے کافی ہیں۔ نور نے بچوں کی شرح پیدائش کا ذکر کیا اردن میں یہ شرح دنیا میں بلند ترین شرحوں میں شامل ہے اور کہا کہ شرح پیدائش کا حساب فی عورت بچوں پر مبنی ہوتا ہے، نہ کہ فی مرد بچوں پر۔ ''اردنی معیار کے مطابق چار بچے بھی ایک بڑا گھرانہ ہیں۔ اگر میرے پانچ بچے ہو جاتے تو میرا چھوٹا سا بڑا کنبہ ہوتا۔''

س شام باغ میں نور نے اشارۃً کہا کہ فسادات اس کے لیے توقع کے مطابق آفت نہیں لائے۔ میں نے شاہ سے پوچھا تھا کہ کیا وہ فسادات کو بس ایک جذباتی دھماکہ خیال کرتا تھا، یا کیا بے چینی دوبارہ بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ اس نے کہا، ''میرے خیال میں یہ بس ایک ہی دھماکہ تھا۔'' ملکہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی، ''سیدی، میرا خیال ہے کہ آپ یہ فرض نہیں کر سکتے۔'' (شاہ کے قریب ترین ساتھی اسے سیدی یعنی راہنما کہہ کر پکارا کرتے تھے۔) میں سوچنے لگی کہ کیا صرف ملکہ ہی اس سے اختلاف رائے کرنے کی جرأت کر سکتی ہے۔ اس نے کہا کہ بہت کچھ کا دارومدار اس بات پر تھا کہ عوام وعدہ کی گئی تبدیلیوں کو معتبر مانتے ہیں یا نہیں۔ اس نے شاہ کی جانب سے

انتخابات منعقد کروانے اور پریس کو آزادی دینے کے فیصلے کو سراہا۔ چند روز قبل ایک صاف گو فلسطینی صحافی (جس کا پاسپورٹ زید رفاعی کی حکومت نے منسوخ کر دیا تھا) کو مصافحتی ملاقات پر محل میں آنے کی دعوت دی گئی۔ نور نے کہا، "میں بہت خوش تھی۔ یہ ایسی چیزیں ہیں جن پر میں نے ہمیشہ زور دیا ہے اور شاہ ہمیشہ سے اردن کے لیے ایسا چاہتے تھے۔ لیکن ان کے اردگرد موجود کچھ لوگوں نے ایسا ہونے کی راہ میں ہر طرح کی رکاوٹ ڈالی۔"

بین السطور بات یہ تھی کہ جو ہوا وہ واضح تھا۔ ملکہ کی مغربی اقدار زید رفاعی کی مطلق العنانیت کے ساتھ متصادم ہوئیں۔ فسادات نے ملکہ کو درست اور رفاعی کو غلط ثابت کر دیا۔ رفاعی معزول ہوا، اور ملکہ اپنی جگہ پر موجود تھی۔

اس سال کے آخر میں شاہ کے جمہوری اقدام کے پھل انتخابات کی صورت میں سامنے آئے جس نے کٹر اسلام پسندوں کو پارلیمنٹ میں غلبہ دلا دیا۔ انتخابات سے عین پہلے آزاد خیال اہل اردن کا ایک وفد محل میں آیا اور ایک امیدوار توجان فیصل کے خلاف کارروائیوں کے متعلق بتایا۔ توجان فیصل اپنی انتخابی مہم میں عورتوں کے لیے عظیم تر حقوق کی بات کرنے کی وجہ سے انتہا پسندوں کی دھمکیوں کا نشانہ بن رہی تھی۔ ووٹنگ سے ایک رات قبل شاہ حسین نے ٹیلی ویژن پر تقریر کرتے ہوئے مذہبی انتہا پسندی کے خلاف خبردار کیا۔ اس نے کہا کہ ملک کو مذہبی بنیادوں پر تقسیم کرنے کی کوئی کوشش ہرگز برداشت نہیں کی جائے گی۔ لگتا ہے کہ انتہا پسندوں کو بات سمجھ میں آ گئی اور وہ توجان یا اس کے حامیوں کے خلاف تشدد سے باز رہے۔

اگست 1990ء تک اردن آہستہ آہستہ آگے بڑھتا رہا۔ پارلیمنٹ کے بنیاد پرست اراکین ایک تجویز دیتے، جیسے عورتوں کے لیے مرد ہیئر ڈریسرز پر پابندی لگانا، اور باقی کی ساری برادری ہمیشہ کی طرح اس تجویز کی پرزور حمایت کرتی۔ آزادئ اظہار کی اجازت بنیاد پرستوں کے ایجنڈے کو ننگا کر رہی تھی، اور لگتا تھا کہ زیادہ تر لوگ اس ایجنڈے کے حامی نہیں۔ ایک اقدام نے اسلامی بلاک کی معتبریت کو نقصان پہنچایا (حتیٰ کہ نہایت مذہبی اہل اردن کے درمیان بھی) یہ تجویز کہ باپوں کو اپنی بیٹیوں کے سکول سپورٹس ڈے میں شامل ہونے کی اجازت نہ دی جائے۔ ایک کٹر مذہبی باپ نے، جو قبل ازیں اسلامی بلاک سے ہمدردی رکھتا تھا، غصے میں پھنکارتے

ہوئے کہا، ''کیا ان کا مطلب ہے کہ میں اس قدر گندی ذہنیت کا مالک ہوں کہ اپنی بیٹیوں کو باسکٹ بال کھیلتے ہوئے بھی نہیں دیکھ سکتا؟''

تب صدام حسین نے کویت پر حملہ کر دیا، امریکہ نے اپنی افواج سعودی عرب بھیجیں، اور اردن نے پرجوش انداز میں عراق کی حمایت کی۔ میں عمان کی ایک بہت بڑی مسجد میں خطبہ سننے گئی۔ خطیب امریکہ مخالف جوش سے بھرے مجمعے کو مزید ہوا دیتے ہوئے امریکی حکومت کو خبردار کر رہا تھا کہ ''تمہارے سورما تابوتوں میں ہی واپس تمہارے پاس آئیں گے، انشاء اللہ۔''

یہ ملکہ کا نکتہ عروج تھا۔ وہ اپنے اختیار کردہ ملک کی ایسے انداز میں خدمت کر سکتی تھی کہ کوئی بھی اور عربی النسل شاہی بیوی نہ کر سکتی۔ جب واشنگٹن نے شاہ کی تادیب کی، اور سیکرٹری خارجہ جیمز بیکر اور دیگر حکام کو اردن کے سوا باقی تمام ممالک میں بھیجا تو نور جہاز میں سوار ہوئی اور اپنے پرانے وطن گئی۔ اس نے سینیٹروں اور کانگریسیوں پر زور دے کر انہیں سمجھایا کہ شاہ مذاکرات کے ذریعے تصفیہ چاہتا ہے۔ شادی کے بعد اس کے پہلے دورۂ واشنگٹن اور اس دورے کے دوران ملنے والی پریس کوریج کا موازنہ کرنا دلچسپ تھا۔ 1978ء کے ''پیپلز میگزین'' کے آرٹیکل نے سرخی لگائی تھی: ''I'd Be Delighted to Have His Child۔'' اس مرتبہ وہ بروکنگز انسٹی ٹیوشن میں تقریر کرنے گئی اور ''نائٹ لائن'' میں آئی۔ اسے اردن کی خارجہ پالیسی کے متعلق سخت سوالات کا سامنا کرنا تھا۔ اس نے یہ کام کافی احسن انداز میں انجام دیا۔

عمان واپس آ کر اس نے شاہ پر زور دیا کہ اردن کے راستے بغداد جاتے اور واپس آتے ہوئے صحافیوں کو بریفنگ دے (اقوام متحدہ کی عائد کردہ پابندیوں کے باعث عراق جانے کا بس یہی ایک راستہ تھا)۔ اس نے اپنے دفتر کے ایک سیلون میں دس دس بارہ بارہ صحافیوں کے لیے چھوٹے چھوٹے ڈنرز کا اہتمام کیا۔ ان محفلوں میں صحافیوں نے شاہ سے ملاقات کی اور واقعات پر اس کا تبصرہ سنا۔

سعودی عرب اور بغداد کے درمیان سفر کرتے ہوئے میں اسے بہت بار ملی۔ کبھی کبھی اس نے مجھے رات کے کھانے پر محل میں بلایا۔ یہ نہایت ہلکے پھلکے انداز میں اپنا تاثر بحال کرنے کی کوشش تھی جو بہت کامیاب رہی۔ گھنٹوں ان دونوں کے سامنے بیٹھنے کے بعد عراق اور امریکی سخت گیری کے درمیان شاہ کے نازک توازن کی ایک بہتر تفہیم حاصل کیے بغیر اٹھنا ناممکن تھا۔

فیملی روم میں بید کی گول میز کے گرد بیٹھ کر کیے ہوئے ڈنرز ہمیشہ شمعوں سے روشن ہوتے۔ ڈنر پر ہونے والی گفتگو کسی صحافی کا خواب اور بدترین گھناؤنا سپنا بھی تھی۔ یہاں اندر کے حالات جاننے کا ایک وسیلہ موجود تھا۔ دوسری طرف کہی گئی تمام باتیں آف دی ریکارڈ ہوتیں۔ اس قسم کی گفتگو سننا اُس وقت خطرناک ہوتا ہے جب یہ سچائی جاننے کا احساس پیدا کرے۔

اس کے علاوہ شاہ نور مین سے بعد کے تمام امریکی صدور کو مل چکا تھا اور بیش کا دوست بھی رہا۔ وہ حاضر جواب اور کبھی کبھی عرب راہنماؤں کے متعلق نہایت تضحیک آمیز بھی ہوسکتا تھا۔ لیکن وہ گفتگو پر غلبہ پانے کی کوشش نہ کرتا۔ زیادہ تر شوہروں کے برعکس وہ نور کی بات سننے میں حقیقی دلچسپی لیتا۔ حتیٰ کہ حمزہ (بیٹا) کو بھی شریکِ گفتگو کیا جاتا۔ اگرچہ لڑکے کو انگلش پر عبور حاصل تھا، لیکن وہ عربی بولنے کو ہی ترجیح دیتا اور اپنے باپ کو بطور مترجم عمل کرنے کا کہتا۔

ایک روز میں ملکہ کے ہمراہ سرحدی کیمپوں میں گئی جہاں مصر، سری لنکا، سوڈان اور بنگلہ دیش کے باشندوں کا سیلاب عراق سے باہر اُمڈ رہا تھا۔ وہ سب لوگ اپنی نوکریاں اور ساری محنت کی کمائی پیچھے ہی چھوڑ آئے تھے۔ یہ بڑا دردناک منظر تھا: ناامید لوگوں سے بھرے ہوئے خیموں کی قطاریں۔ نور ہسپتال کے خیمے میں گھومتے پھرتے ہوئے کسی بھی ایسے شخص سے باتیں کرتی رہی جو عربی یا انگلش بول سکتا تھا۔ وہ آنسو بہاتی سری لنکن عورتوں کو تسلی دینے کے لیے اپنی جیب سے ایک ٹشو نکالتی، کسی بچے کی پیشانی چھو کر بخار چیک کرتی۔ کیمپ کی انتظامیہ کے ساتھ بیٹھ کر اس نے خیموں کے لیے پلان پر گفتگو کی، پانی اور کھانے کی تقسیم کے حساب سے منصوبوں کو بہتر بنایا۔ محل کی حدود میں اپنے دفتر واپس پہنچ کر وہ فون پر مصروف ہو جاتی، ورجن ایئرلائنز کے سربراہ رچرڈ برانسن کو کال کر کے کہتی کہ لوگوں کو وطن پہنچانے کے لیے اضافی جہازوں کا بندوبست کیا جائے؛ بے شمار کمبلوں کی قیمت ادا کرنے کی خاطر مزید رابطے تلاش کرتی۔ اچانک اس کی ستارے والی رولوڈیکس ایک قومی اثاثہ بن گئی۔

وہ رات کو دیر سے گھر آتی اور بستر پہ ڈھے جاتی۔ اردن بھر میں اس کی محنت کے کوئی ایک درجن برس پھل لا رہے تھے۔ اردن نے عراق کے ساتھ تجارت کے لیے ایک ٹرانزٹ پوائنٹ کی حیثیت میں کافی دولت کمائی تھی، لیکن اقوام متحدہ کے بائیکاٹ کے باعث بندرگاہیں خالی اور ڈرائیور بے روزگار ہو گئے۔ "ہم سکولوں سے لڑکیوں کے اخراج کی شرح میں اضافہ دیکھ رہے

ہیں۔ گھرانوں کی آمدنی گھٹ رہی ہے، اور وہ لوگ سب سے پہلے لڑکیوں کی فیسوں کی ہی بچت کرتے ہیں،'' نور نے آہ بھری۔ بچوں کے مراکزِ صحت میں خراب غذا کی اولین علامات ظاہر ہونے لگی تھیں۔ ''لوگوں کی غذا میں پروٹین گھٹ رہے ہیں اور بچوں کی نشوونما متاثر ہو رہی ہے۔'' امدادی کارکن، ملکہ کے دوست، اکثر گھر فون کرکے اسے کوئی مشکل حل کرنے کا کہتے۔

کبھی کبھی ہم اپنے سوپ کی چسکیاں لیتے ہوئے سی این این پر جنگ کی خبریں سنتے۔ اگر حمزہ بھی جاگ رہا ہوتا تو صوفے پہ ہمارے ساتھ بیٹھ کر اپنے گیم بوائے پہ جھک کر تخیلاتی دشمنوں سے لڑائی کرتا، جبکہ سی این این سرحد کی دوسری طرف کی جاری جنگی تیاریوں کے متعلق بتاتا۔ کبھی کبھی شاہ بھی اپنا اعصابی تناؤ کچھ کم کرنے کی خاطر گیم بوائے ادھر لے لیتا۔ ٹی وی کے قریب ویڈیوز کے ڈھیر لگے تھے　شاہ کے لیے کلنٹ ایسٹ ووڈ، ملکہ کے لیے رومانوی ڈرامے۔ بحران کے دوران ان کی خود ریکارڈ کی ہوئی ویڈیوز بھی موجود تھیں۔ ان میں لیری کنگ کو راس پیروٹ (Ross Perot) کے دیے ہوئے انٹرویو کی ٹیپ بھی شامل تھی جو اس وقت ٹیکساس کا ایک غیر مشہور بزنس مین تھا۔

شاہ حسین نے میرے لیے پیروٹ کی ٹیپ چلائی اور عرب سفارت کاری پر اس کے اخذ کردہ پراسرار نتائج پر دل کھول کر ہنسے۔ پیروٹ کی کہی ہوئی زیادہ تر باتیں خوشامدانہ نہیں تھیں۔ اس نے لیری کنگ کو بتایا کہ عربوں پر اگر نظر نہ رکھی جائے تو وہ کسی خیمے کے اندر جاتے، ریت کی ڈھیریاں بناتے اور کوئی ایسا معاہدہ کر کے باہر آتے ہیں جو امریکہ کو کبھی سمجھ نہیں آتا۔ یہ ایک بھونڈا منظر تھا: اپنے کیریئر کے ایک بہت بڑے چیلنج سے نبرد آزما شاہ حسین ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گیا۔

چند روز بعد حسین کو صبح سویرے فون کال کے ذریعے بغداد پر بمباری کی خبر ملی۔ بستر میں اس کے ساتھ لیٹی ہوئی نور نے محسوس کیا کہ فون سنتے ہوئے اس کا جسم اکڑ گیا تھا۔ وہ بستر سے باہر آیا، اپنا لباس پہنا اور فوجی رہنماؤں سے ملنے چلا گیا۔

اس صبح کے بعد شاہ بظاہر پرسکون نظر آنے لگا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس نے جنگ کا راستہ روکنے کی ہر ممکن کوشش کی اور اب سب کچھ مقدر کے سپرد کر دینے کو تیار ہو۔ اردن ٹیلی ویژن پر اس کی تقریر (جس نے وائٹ ہاؤس کو بہت ناراض کیا) کے دو دن بعد میں محل میں گئی۔ حسین نے امریکہ اور اتحادیوں پر ''عراق کو تباہ کرنے'' کی کوشش کا الزام لگایا تھا، اور حملے کے سامنے عراقی

عوام کی بہادری کو سراہا تھا۔ اس رات محل میں سی این این دیکھتے ہوئے شاہ کو پتا چلا کہ امریکہ اردن کی 50 ملین ڈالر امداد کا پیکیج منسوخ کرنے پر غور کر رہا تھا۔ اس نے کندھے اچکائے اور ریموٹ کنٹرول ایک طرف جھٹکتے ہوئے بولا! "پھندا تنگ ہو رہا ہے، لیکن اپنے کہے ہوئے کسی بھی لفظ پر کسی بھی جانب سے سنسر شپ یا تنقید برداشت کرنے کو تیار نہیں۔" درحقیقت وہ جانتا تھا کہ اسے ایسا کرنے کی ضرورت نہیں: اردن کو مستحکم رکھنے کی خاطر امریکیوں کو شاہ کی ضرورت تھی، اور کیپٹول ہل پر سخت باتوں کے باوجود انہوں نے امداد بند نہ کی۔

نچلی منزل پر سٹنگ روم میں عالمی رہنماؤں کی سلور فریم والی تصاویر سے بھری ہوئی میز مسلسل میری توجہ کا مرکز تھی۔ خلیج کے بحران کے شروع ہونے سے ہی تصویریں مسلسل حرکت کرتی آ رہی تھیں۔ صدام حسین کویت پر حملے کے بعد اگلی قطار سے نکل گیا تھا۔ مصر کا صدر حسنی مبارک بالکل ہی غائب ہو چکا تھا، جبکہ جارج بش ایک لیمپ کے پیچھے جا چھپا۔ اس رات جارج بش دوبارہ ظاہر ہوا اور صدام حسین کے ساتھ رخسار ملائے ہوئے دکھائی دیا جیسے یہ پیغام دیا جا رہا ہو کہ آخر اردن اس لڑائی میں غیر جانب دار حریف تھا۔ اگلی قطار میں ایک اور تصویر تھی جو پہلے نہیں دیکھی تھی: پوپ جان پال دوم جس نے جنگ سے فوری خاتمے کا مطالبہ کیا تھا۔

بالائی منزل پر بلیو جینز میں ملبوس نور فون پر امریکہ میں اپنے دوستوں کو شاہ حسین کی تقریر کی کاپی فیکس کرنے کی پیشکش کر رہی تھی تاکہ وہ اس سلسلے میں اس کے خیالات پڑھ سکیں۔ اردن کی گلیوں میں اس کی کوششوں کو سراہا جا رہا تھا۔ حتیٰ کہ بنیاد پرستوں نے بھی سوچا کہ وہ بیرونی دشمن دنیا کے سامنے اردن کا مقدمہ پیش کر کے ایک اچھا کام کر رہی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا جب میں نے مسجد کے خطبات میں کسی عورت کے فعال کردار کی تعریف ہوتے سنی۔

خلیج کا بحران پیدا نہ ہوتا تو کبھی یہ معلوم نہ ہو سکتا کہ آیا وہ تنقید اور افواہوں کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو پاتی یا نہیں۔ لیکن جنگ نے اسے ایسی مقبولیت دلا دی جس کا ایک سال پہلے تک تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ایک ٹیکسی ڈرائیور نے اپنے سن وائزر میں ملکہ کی ایک تصویر لگا رکھی تھی۔ اس نے ملٹری لباس پہن رکھا تھا، جیسے امریکہ کے ساتھ جنگ پر جانے کو بالکل تیار ہو۔ میں نے پوچھا کہ کیا اسے معلوم ہے کہ نور امریکی ہے؟ اس نے درشتی سے جواب دیا: "وہ عرب ہے، وہ ہم میں سے ایک ہے۔"

☆　☆
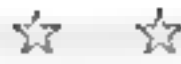
لیکن جنگ کے صرف ایک سال بعد کارگیہ افواہ سازی دوبارہ چالو ہوگئی اور اخبارات میں طلاق کے حوالے سے سرگوشیاں شائع ہونے لگیں۔ اس مرتبہ بیشتر اہل اردن کو امید تھی کہ ایسا نہیں ہوگا۔ افواہوں میں دعویٰ کیا گیا تھا کہ شاہ ایک اکیس سالہ فلسطینی اردنی صحافی خاتون کی محبت میں گرفتار تھا اور اس سے شادی کرنے کا وعدہ کر چکا تھا۔ صحافی خاتون نے جنگ کے دوران سی این این کے لیے خدمات انجام دی تھیں اور حال ہی میں اسے محل میں شاہ کی پریس سیکرٹری بنایا گیا تھا۔ عمان کے ایک صحافی نے کہا، ''اگر آپ جوان لوگوں کو محل میں رکھیں اور ان میں سے کچھ ایک خوب صورت عورتیں ہوں تو اس قسم کی افواہیں پھیلنا لازمی امر ہے۔

ایک عرب بزنس مین کا نکتہ نظر کچھ مختلف تھا۔ ''شاہ کی تمام شادیاں ریاستی شادیاں تھیں۔ جب اس نے ناصر کے ساتھ قربت اختیار کرنا چاہی تو ایک مصری عورت سے شادی کی۔ جب اسے انگلینڈ کی ضرورت تھی تو انگلش روز کو بیوی بنایا۔ جب فلسطینیوں کے ساتھ تعلقات مضبوط بنانا چاہے تو مغربی کنارے کے ایک خاندان کی لڑکی سے شادی کر لی۔ 1980ء کا عشرہ امریکی غلبے کا عشرہ تھا، لہٰذا اس نے ایک امریکی لڑکی کو منتخب کیا۔ 90ء کی دہائی کے لیے شاہ کو کسی اور قسم کے اتحاد کی ضرورت ہوگی۔''

لیکن زیادہ تر اہل اردن کو غالباً اس کہانی پر یقین نہیں تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر شاہ حسین کسی جوان عورت پر فریفتہ تھا، تب بھی اس عمر میں طلاق دینا فضول ہوگا۔ 57 سالہ آدمی سے یہ امید نہیں کی جاسکتی تھی، چاہے وہ بادشاہ ہی کیوں نہ ہو۔ کچھ ایک نے طلاق کی افواہوں کو ان لوگوں کی پیشہ ورانہ رقابت کا نتیجہ قرار دیا جو خود پریس سیکرٹری کی ملازمت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ روایت کے مطابق ایک عورت کو سکینڈل کا شکار بنانا آسان نظر آیا۔

اب نور کی عمر 41 برس تھی اور شاہ کے ساتھ اس کی شادی کو پندرہ برس ہو چکے تھے۔ جنگ کے دوران اس کے کردار کی وجہ سے اب اردن کے لوگ اسے کافی اچھی طرح سمجھنے اور پسند کرنے لگے تھے۔ مذہبی تہواروں پر اس کے بیٹے ٹیلی ویژن پر بالکل درست کلاسیکی عربی میں قرآن پڑھتے دکھائی دیتے۔ کچھ اردنیوں نے جانشینی کے متعلق گفتگو شروع کی اور کہا کہ اگر شاہ ان لڑکوں کے بالغ ہو جانے تک جیتا رہا تو ان میں سے کسی کو تاج کا حق دار نہ خیال کیے جانے کی کوئی وجہ موجود

نہیں۔ مشرق قریب کے ایک طویل المیعاد بادشاہ کے پہلو میں پندرہ برس گزارنے کے بعد نور نے اپنی حیثیت کو مستحکم بنانے کے لیے ایک دو باتیں سیکھ لی تھیں۔

پھر بھی اس مرتبہ افواہیں غیر معمولی طور پر پائیدار ثابت ہوئیں۔ جب امریکہ اور برطانیہ کے اخبارات میں ممکنہ طلاق کی خبریں شائع ہوئیں تو اردنی سفارت خانوں نے تردیدیں جاری کرنے کا غیر متوقع اقدام کیا۔ واشنگٹن میں ایک دوست نے نور سے ملاقات کی اور اسے پریشان پایا۔ اس کا سکون اور حسن غائب ہو چکا تھا۔

چند ہفتے بعد ایک اور اعصابی امتحان آیا۔ شاہ کو کینسر کا آپریشن کروانے کے لیے ہنگامی طور پر امریکہ کے ایک ہسپتال میں لیجایا گیا تھا۔ مرض نے اس کے پیشاب کے نظام پر حملہ کیا تھا، اگرچہ سرجری کو کامیاب بتایا گیا، لیکن متواتر مانیٹرنگ کی ضرورت تھی۔

اردن میں فضا دلگیر اور غیر قطعی تھی۔ جب شاہ سرجری کے بعد واپس وطن پہنچا تو سڑکوں پر آنے والا استقبالی مجمع ملک کی تاریخ میں سب سے بڑا تھا۔ ''عیش حسین'' کے نعروں میں ایک والہانہ شدت پائی جاتی تھی۔ مشرق وسطیٰ کے کسی اور ایسے ملک کا تصور کرنا محال تھا جہاں کسی راہنما کے لیے اس قدر برجستہ یا اس قدر مخلصانہ حمایت پیدا ہو جائے۔

افواہیں دم توڑ گئیں۔ کوئی بھی شخص، حتیٰ کہ بنیاد پرست بھی شاہ پر براہ راست یا ملکہ کے توسط سے تنقید کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ شاہ کی چاہے جتنی بھی زندگی باقی تھی، لیکن ملکہ نور کا تخت یقیناً غیر محفوظ ہو گیا تھا۔

اگر ازدواجی زندگی میں کوئی رخنہ ہوتا تو 1994ء میں شاہ اور ملکہ کے دورۂ امریکہ کے دوران یقیناً واضح ہو کر سامنے آجاتا۔ میو کلینک میں چیک اپ (جس میں شاہ کو صحت مندی کا سرٹیفکیٹ ملا) کے بعد جوڑے کو واشنگٹن میں گھومتے، ہارلے ڈیوڈسن اور بی ایم ڈبلیو موٹر بائیکس کی شاپنگ کرتے ہوئے دیکھا گیا۔ انہوں نے اردن بھجوانے کے لیے نئی بائیکس مل کر منتخب کیں اور میچنگ موٹر سائیکل ملبوسات پر بھی 2,000 ڈالر خرچے۔ اس طرح وہ ایک مرتبہ پھر عمان کی پہاڑیوں پر شاہی انداز میں بائیک چلانے کے قابل ہو گئے۔

لگتا تھا کہ مہلک مرض سے صحت یاب ہونے کے باعث شاہ میں خطرات مول لینے کی ہمت بھی بڑھ گئی۔ شاید اس نے محسوس کر لیا کہ وقت کم رہ گیا تھا۔ 1993ء میں اسرائیل اور پی ایل او

کے درمیان امن معاہدہ طے پانے کے فوراً بعد حسین نے اردن کے انتخابات شیڈول کے مطابق کروانے کی اجازت دی۔ غیر ملکی سفیروں اور اپنی حکومت کے زیادہ تر وزرائے نے بھی اسے خبر دار کیا، کیونکہ انہیں خوف تھا کہ ایک سیاسی مہم اسلامی بنیاد پرستوں اور کٹر فلسطینیوں کو مظاہروں کا ایک موقع فراہم کردے گی جو اسرائیل کے ساتھ امن نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ اردن غیر مستحکم ہوجائے گا۔

مگر انتخابات بڑے احسن انداز میں ہوئے۔ مجھے یقین ہے کہ شاہ کے عزم کے پیچھے ملکہ کا اثر کارفرما تھا۔ اس کا نظریہ دنیا بھی کافی حد تک ملکہ جیسا ہوتا گیا۔ انتخابات کے کچھ ہی عرصہ بعد، 1994ء کے موسم سرما میں عمان سے ایک طنزیہ پروگرام شروع ہوا جس میں عرب راہنماؤں کی خود پسندی کو مزاح کا نشانہ بنایا گیا۔ اردن کے کچھ پڑوسی خوش نہیں تھے اور انہوں نے پروگرام بند کروانے کی کوشش کی۔ شاہ نے دباؤ کا جم کر مقابلہ کیا اور کہا کہ شو جاری رہے گا، بشمول اس مزاحیہ خاکے کے جس میں اس کے اپنے انداز تقریر کا بھی مذاق اڑایا گیا تھا۔

1987ء میں مشرق وسطی منتقل ہونے پر میں سب سے پہلے جن ممالک میں گئی اردن ان میں سے ایک تھا۔ چھ سال کے دوران میں نے اسے ایک پولیس سٹیٹ سے بدل کر خطے میں سیاسی آزادی کا ایک گہوارہ بنتے دیکھا۔ بنیاد پرست بدستور موجود تھے، لیکن نسوانیت پسند بھی موجود رہے۔ کسی ایک گروپ کی خاطر دوسرے گروپ کے حقوق کو غصب نہ کیا گیا۔ کشمکش جاری رہی، لیکن یہ سب کچھ کھلے میدان میں ہورہا تھا۔ اور ہتھیار بموں یا بندوقوں یا گرفتاریوں کی بجائے الفاظ تھے۔

میری نظر میں اس بدلاؤ کا سہرا کافی حد تک ایک عورت کے سر ہے۔

ساتواں باب

دانش کی جانب.....

سعودی عرب میں ریاض سے شمال کو جانے والی سڑک تیز ہوا سے بنے ہوئے ریت کے ٹیلوں کے درمیان میں سے گزرنے والی چھ لین پر مشتمل بے نقص شاہراہ ہے۔ ہر پانچ میل کے بعد زرد مٹی رنگ کی کمیں گاہوں کے آثار دیکھنا ممکن ہے جن میں رائفل چلانے کے لیے سوراخ کیے گئے تھے۔وہ بچوں کے ریت کے قلعوں کی مانند ختم ہورہی ہیں۔

میرے سعودی دوست نے سٹیرنگ وہیل سے ایک ہاتھ اٹھا کر اپنی لگژری فور وہیل ڈرائیو کے ریفریجریٹڈ کمپارٹمنٹ کی جانب بڑھایا اور سوڈا کا ایک ٹھنڈا یخ کین مجھے پکڑایا۔ پھر اس نے پچھلی سیٹ پر بیٹھے امریکی کی جانب دوسرا کین پھینکا۔ وہ اس کا کولیگ تھا اور ایک دن کے لیے میرے شوہر کا کردار ادا کرنے کو تیار ہوا تھا۔

میرا سعودی دوست مغرب سے تعلیم یافتہ پروفیشنل تھا اور مجھے اپنے بوڑھے چچا سے ملوانا چاہتا تھا جو محمد عبدالوہاب (جس نے اسلام کی ایک اس قدر کٹر صورت کی تعلیم دی کہ سیٹی بجانے پر بھی پابندی عائد کردی گئی) کے آبائی قصبے کے نزدیک ریتلے ٹیلوں کے درمیان رہتا تھا۔ اس کا چچا سچا، مخلص اور کٹر وہابی تھا۔ یہ یقینی نہیں تھا کہ میرے ساتھ بات کرنے پر رضامند ہو جائے گا "اس نے آج تک خاندان سے باہر کی کسی عورت سے بات نہیں کی....." میرے دوست نے کہا، لیکن اس کا خیال تھا کہ کوشش کر دیکھنی چاہیے تاکہ میں سعودی عرب میں عورتوں کے لیے تبدیلی کے

خلاف متحد قوتوں کو سمجھ سکوں۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا ''شوہر'' الغازی تھا۔ ''میرا خاندان میری بہت سی انوکھی حرکات کا عادی ہے، لیکن ایک غیر ملکی خاتون کو کار میں اکیلے بٹھا کر ان کے پاس جانا ان کی قوت برداشت کو بیجا آزمانے والی بات ہوگی۔''

چچا محمد الغازی کھجوروں کے ایک جھنڈ کے قریب ہموار چھت والے مکان میں رہتا تھا۔ نارنجی رنگ کے بلند و بالا ٹیلے اس کے چھوٹے سے کھیت کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے تھے۔ ایئر کنڈیشنڈ جیپ کا دروازہ کھولنے پر گرم ہوا کا ایک جھونکا ایشیں جلانے والی بھٹی میں سے آتا ہوا محسوس ہوا۔ میری آنکھوں کی پتلیاں پتھرا گئیں۔ ٹی ای لارنس نے ان عرب صحراؤں کی گرمی کو بیان کیا تھا: ''سورج شمشیر برہنہ کی طرح اوپر آیا اور ہمیں ایک ہی وار سے گنگ کر دیا۔'' اور اُس وقت اس نے کالا عبایہ بھی نہیں پہن رکھا تھا۔ میں نے آنکھوں کو سکیڑ کر بہ نظر رشک اپنے دوست اور اس کے چچا کو گلے ملتے دیکھا۔ انہوں نے سفید عبائیں اور سینڈل پہن رکھے تھے۔ میرے ذہن میں ایک گستاخانہ خیال آیا: اگر خدا کو عورتیں پسند ہوتیں تو وہ اسلام ریگستان کی بجائے کسی ٹھنڈے علاقے میں نازل کرتا۔

محمد الغازی نے اپنی بیوی کو آواز دی اور مجھے اس کے پیچھے زنان خانے میں جانے کا اشارہ کیا۔ میرے دوست نے اپنا ایک ہاتھ چچا کے کندھے پر رکھا اور بتایا کہ وہ مجھے اپنے ساتھ مردوں والے حصے میں بٹھانا چاہتا ہے تاکہ مقامی تاریخ کے متعلق گفتگو کی جا سکے۔ میں کچھ فاصلے پر کھڑی تھی اور میرا عبایہ گرم ہوا میں لہرا رہا تھا۔ دونوں کے درمیان عربی میں تیز گفتگو ہوئی۔ آخر کار چچا نے کندھے اچکائے اور میری جانب دیکھے بغیر اندر آنے کا اشارہ کیا۔

مردوں کی 'مجلس' یا استقبالیہ کمرہ گھر کی ساری طوالت کے ساتھ ساتھ محیط تھا۔ محمد الغازی اپنے چھوٹے سے گاؤں میں ایک اہم آدمی تھا۔ وہ مقامی مسجد کا امام ہونے کے ناتے گاؤں والوں کا روحانی پیشوا بھی تھا۔ اسے حکومت کی طرف سے ایک وظیفہ ملتا۔ تیل کی دولت آنے سے قبل، جب حکومت اس قسم کے وظائف کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی تھی، الغازی کھجوروں سے روزی کماتا۔ وہ ہر صبح کو طلوع آفتاب سے قبل اٹھ کر درختوں کو پانی دیتا۔ ان قیمتی درختوں کی تعداد اس قدر کم تھی کہ اس نے ہر ایک کا نام رکھا ہوا تھا۔ پندرہ سال کی عمر کو پہنچنے تک اسے قرآن پڑھنے کا وقت بھی نہ ملا کیونکہ صحرا میں روزی روٹی کمانے کے لیے کوششوں اور محنت سے ہی فرصت نہیں ملتی تھی۔ اب تیل کی بدولت

بجلی آجانے کے باعث پانی کا پمپ چلایا جا سکتا تھا اور اتنی آمدنی ہو جاتی کہ ایک غیر ملکی مزدور رکھنا ممکن ہو گیا۔ امام ہر نماز جمعہ کے بعد ایک بھیڑ ذبح کرتا اور مجلس کو چاولوں کے ساتھ کھانا کھلاتا۔ گاؤں والے کھانے کے موقع پر اس کے ساتھ تازہ مسائل پر گفتگو کیا کرتے تھے۔

میں نے پوچھا کہ اگر اس نے خاندان سے باہر کی کسی عورت سے کبھی بات نہیں کی تھی، تو پھر وہ گاؤں کی عورتوں کے روحانی مشیر کے طور پر کام کیسے کرتا تھا۔ دوست نے مجھے عجیب نظروں سے دیکھا اور کہنے لگا، ''یقیناً وہ اپنے مسائل شوہروں کے ذریعے پیش کرتی ہیں۔''

''لیکن اُس صورت میں کیا ہوگا اگر ان کا شوہر ہی مسئلے کی وجہ ہو؟''

اس آدمی نے کبھی اس امکان کے بارے میں غور ہی نہیں کیا تھا۔

ہم سے ملاقات ہونے سے پہلے کے جمعہ کو الغازی کی مجلس میں ان عورتوں کے بارے میں افواہیں گردش کرتی رہی تھیں جنہوں نے گاڑی ڈرائیو کرنے کے حق کی خاطر احتجاجی مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے شوفروں کو فارغ کر دیا اور ریاض میں خود گاڑی ڈرائیو کی تھی۔ بوڑھا الغازی عورتوں کی ڈرائیونگ کے امکان سے بدحواس تھا۔ اس نے اپنا بڈیلا ہاتھ دل پہ رکھا اور آسمان کی جانب دیکھا، ''مجھے جیتے جی یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہو،'' اس نے کہا۔

لیکن کئی برس پہلے ایک دفعہ وہ اپنی چھوٹی سی دیہی برادری میں انقلابی بن کر سامنے آیا تھا۔ اس نے حکومت کو اپنے گاؤں میں لڑکوں کا سکول کھولنے کی درخواست دی تھی۔ کچھ پڑوسی سیکولر تعلیم کے تصور سے ڈرے ہوئے تھے۔ قریبی دیہات کے اماموں نے خطبوں میں تعلیم کے خلاف وعظ کرتے ہوئے اسے ''غلاظت'' قرار دیا۔ ان کی نظر میں صرف قرآن قابل مطالعہ تھا اور لڑکے پہلے ہی مقامی مساجد میں اسے پڑھنا سیکھ رہے تھے۔ انہوں نے دلیل دی کہ تاریخ، جغرافیہ اور غیر ملکی زبانوں کا کیا فائدہ، کیونکہ یہ مضامین کافر سرزمینوں اور لوگوں کے متعلق معلومات دیتے تھے؟

لیکن محمد الغازی کو معلوم تھا کہ صحابہ کرامؓ غیر ملکی زبانیں بولا کرتے تھے، اور انہوں نے اس علم کی بدولت اسلام کو دور دراز علاقوں میں بھی پھیلایا۔ اس نے دلیل دی کہ، اسلامی علاقوں کی تاریخ اور جغرافیہ پڑھانے میں کیا خطرہ ہو سکتا ہے؟ شہروں میں علمأ یہ لڑائیاں لڑنے کے ذریعے نصاب میں موسیقی (جو وہابیوں کی نظر میں اشتعال انگیز ہے) جیسے مضامین شامل کیے جانے پر پابندی لگوا چکے تھے۔ انہوں نے آرٹ کو بھی نامنظور کیا جو بت پرستی کی جانب لیجاتا ہے۔ محمد الغازی کی مہم

کے نتیجے میں آخرکار گاؤں میں سکول کھل گیا۔ امام کے دو بیٹے وہاں تعلیم حاصل کر کے یونیورسٹی میں داخل ہوئے؛ تیسرے بیٹے نے فوج میں شمولیت اختیار کی۔

اس کی بیٹیوں کا معاملہ مختلف تھا۔ سن رسیدہ امام کی نظر میں اس کی بیٹیوں کا گھر سے باہر نکلنا . چاہے انہوں نے نقاب ہی کیوں نہ کیا ہو اجنبیوں کے درمیان بیٹھنا چاہے وہ لڑکیاں ہی کیوں نہ ہوں . برا تھا۔ بیٹیوں نے وہی کچھ سیکھا جو امام کی نظر میں ضروری اور موزوں تھا. قرآن پڑھنا اور اپنے گھر کے زنان خانے میں بند رہنا۔

سعودی عرب میں محمد الغازی جیسے باپ آج بھی اپنی بیٹیوں کے لیے مرضی کی راہ منتخب کر سکتے ہیں۔ اگر باپوں کو ناپسند ہو تو لڑکیوں کو سکول میں داخل کروانا لازمی نہیں۔ بہت سے مرد اس مقولے پر یقین رکھتے ہیں کہ لڑکی کو پڑھانا لکھانا اونٹ کو سر خیمے کے اندر لانے والی بات ہے: انجام کار اونٹ آہستہ آہستہ اندر کھسکتا اور ساری جگہ گھیر لیتا ہے۔

1956ء سے پہلے تک سعودی عرب میں لڑکیوں کا کوئی سکول موجود نہیں تھا۔ یہ کارنامہ شاہ فیصل کی بیوی عفت نے انجام دیا۔ وہ کسی بھی سعودی حکمران کی واحد ایک بیوی تھی جو ملکہ قرار پائی۔ عفت کی پرورش ترکی میں ہوئی۔ وہ مزید سائنس اور مزید مغربی موضوعات کو تعلیم کا حصہ بنانا چاہتی تھی، لیکن اپنے بیٹوں کے سکول جیسا کوئی سکول کھولنے کے لیے اسے پھونک پھونک کر قدم رکھنا تھا۔ لڑکیوں کے سکول کا معاملہ کہیں زیادہ نازک تھا۔ 1956ء میں جدہ میں دارالحنان (محبت کا گھر) کا آغاز یتیم خانے کی صورت میں کیا گیا۔ چونکہ قرآن میں یتیم لڑکیوں کی دست گیری کا حکم بار بار آیا ہے، لہٰذا اس قسم کے ادارے پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا تھا۔ ایک سال بعد ہی کہیں جا کر عفت نے ادارے کے اصل مقصد کو واضح کرنے کا خطرہ مول لینا بہتر خیال کیا۔

ایک مقامی اخبار میں ایک مضمون بعنوان ''اگر آپ ماں کی اچھی تربیت کریں تو وہ اپنی ذات میں سکول بن سکتی ہے'' میں دارالحنان کے مقاصد اسلامی ہدایات کے مطابق بہتر مائیں اور گھریلو عورتیں پیدا کرنا بتائے گئے۔

عفت نے شاہ فیصل کے توسط سے عورتوں کی تعلیم کے لیے قرآن کی چند مشہور آیات کو بنیاد بنایا۔ انہیں ام سلمہؓ کی آیت کہا جاتا ہے۔ روایت ہے کہ ام المومنین ام سلمہؓ نے ایک روز آنحضرتؐ سے پوچھا کہ اللہ اپنی آیات میں ہمیشہ مردوں کو ہی کیوں مخاطب کرتا ہے۔

حدیث کے مطابق ام سلمہؓ حجرے میں بیٹھی اپنے بالوں میں کنگھا کر رہی تھیں کہ آنحضرت کو منبر پہ بیٹھ کر ارشاد فرماتے سنا: (مفہوم) اے ایمان والو، تم میں سے جو مرد اور عورتیں اللہ کے آگے سر جھکاتے ہیں، جو اطاعت گزار ہیں، جو سچ بولتے ہیں، جو ایمان پر قائم رہتے ہیں، جو خیرات دیتے ہیں، جو روزے رکھتے ہیں، جو سادگی اختیار کرتے ہیں، جو خدا کو یاد کرتے ہیں..... اللہ نے ایسے مردوں اور عورتوں کے لیے معافی اور وسیع انعام تیار کر رکھا ہے۔

ان الفاظ میں صاف ظاہر تھا کہ عقیدے کے فرائض مردوں اور عورتوں کے لیے یکساں تھے۔ عفت نے کہا کہ ان فرائض کو پورا کرنے کی خاطر عورتوں کو تعلیم یافتہ اور مطلع ہونا چاہیے۔ 1960ء میں علماء کو یہ اصول ماننے پر مجبور ہونا پڑا۔ وہ ملک بھر میں لڑکیوں کی تعلیم کو فروغ دینے پر محتاط انداز میں مان گئے۔ شرط یہ رکھی گئی کہ سکول علما کے کنٹرول میں رہیں گے اور کسی بھی معترض باپ کو اپنی بیٹیاں سکول میں داخل کروانے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔

لیکن کچھ سعودیوں کے لیے اتنا کافی نہیں تھا۔ Minsaf سے کچھ ہی دور Burayda قصبے میں مردوں نے 1963ء میں لڑکیوں کا پہلا سکول کھولے جانے کے خلاف احتجاج اور فساد برپا کیا۔ تقریباً اسی دور میں جب امریکہ جنوب کے سکولوں میں نسلی امتیاز ختم کرنے کے لیے نیشنل گارڈ کو طلب کر رہا تھا، شاہ فیصل کو Burayda سکول زبردستی شروع کرنے کی خاطر نیشنل گارڈ طلب کرنا پڑی۔ ایک سال تک سکول کی واحد طالبہ اس کی ہیڈ مسٹریس کی بیٹی تھی۔

بہت سے باپوں نے اپنی بیٹیوں کو لاعلم رکھنے کے حق کا استعمال جاری رکھا۔ 1980ء میں صرف 55 فیصد سعودی لڑکیاں سکول میں داخل ہوئیں اور صرف 23 فیصد سیکنڈری تعلیم تک پہنچ پائیں۔ صرف 38 فیصد عورتیں خواندہ تھیں، جبکہ مردوں میں یہ شرح 62 فیصد تھی۔

پھر بھی کچھ لڑکیاں روپے کے ذریعے دستیاب بہترین تعلیم حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئیں۔ جدہ میں لڑکیوں کے ایک نجی سکول دار الفکر میں جرمنوں کا تعمیر کردہ کیمپس قابل تصور حد تک عالی شان ہے۔ ایک اونچی سفید دیوار کے پیچھے شیشے کے دروازے صیقل شدہ پتھر والے ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں کھلتے ہیں۔ بلند چھتیں اور شیشے کی بڑی بڑی کھڑکیاں آرٹ سٹوڈیوز، جمنازیم، سائنس لیبارٹری اور ایک کمپیوٹر سنٹر کو کھلا، ہوادار احساس دیتی ہیں۔

کسی بھی کلاس میں بیس سے زیادہ طالبات نہیں۔ اساتذہ کے شیر خوار بچوں کے لیے ایک

ڈے کیئر سنٹر بنایا گیا ہے جس میں طالبات کے بچے بھی داخل ہو سکتے ہیں کیونکہ چھوٹی عمر میں شادیوں اور حمل کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ زبانوں پر مرکوز نصاب کے علاوہ لڑکیاں کھانا پکانے یا ملبوسات سازی، کراٹے یا بیلے، ڈیسک ٹاپ پبلشنگ یا موٹر مکینکس کے کورسز بھی منتخب کر سکتی ہیں۔ موٹر مکینکس کے کورس پر مجھے حیرت ہوئی، کیونکہ سعودی عورتوں کو گاڑی چلانے کی اجازت نہیں تھی۔ ہیڈ مسٹریس باسلہ الحمود نے وضاحت کی: ''میں چاہتی ہوں کہ اگر ڈرائیور کار میں کسی خرابی کے متعلق بتائے تو عورت اس کی تصدیق کرنے کے قابل ہو۔''

طالبات کے چہرے مہرے سے مالی فارغ البالی صاف ظاہر تھی۔ وہ دراز قد، چمک دار بالوں والی تھیں جو موٹی چٹیاؤں کی صورت میں کمر پر جھول رہے تھے۔ خوب صورت، دبلی پتلی، 38 سالہ، ریشمی لباس میں ملبوس ہیڈ مسٹریس کی جلد لڑکیوں کی طرح جھریوں سے عاری اور جسم کسرتی تھا۔ اس نے کہا، ''میرے گھر میں جم اہم ترین جگہ ہے۔'' بیس سال قبل اس کی بڑی بہن نے دندان سازی کا مطالعہ کرنا چاہا تھا جو اس وقت سعودی عرب میں عورتوں کے لیے ممکن نہیں تھا۔ باسلہ کا باپ سارے کنبے کو لے کر شام منتقل ہو گیا اور بیٹی کو دمشق یونیورسٹی میں داخل کروایا۔ وہ سعودیہ کی پہلی دندان ساز خاتون بن کر وطن واپس آئی اور مردوں و عورتوں دونوں کا علاج کرنے کے لیے کلینک کھولا۔ لیکن اسے جلد ہی معلوم ہوا کہ عورتوں کی گوشہ نشینی کے عادی سعودی مرد ایک اجنبی عورت کا چھونا برداشت نہیں کر سکتے تھے، چاہے وہ ڈرل سے ہی کیوں نہ چھوئے۔ مفروضات اور غلط فہمیوں سے تنگ آ کر اس نے کلینک میں عورتوں اور مردوں کے سیکشن الگ الگ کر دیے اور مردوں کا علاج کرنے کے لیے مرد دندان ساز ملازم رکھے۔

باسلہ بھی پیشہ ورانہ علیحدگی کو ترجیح دیتی تھی۔ دار الفکر میں لڑکوں کے لیے ایک علیحدہ سکول اور مردانہ بورڈ آف ڈائریکٹرز قائم کیا گیا۔ باسلہ بورڈ کے ساتھ میٹنگ کرتے وقت کلوزڈ سرکٹ ٹیلی ویژن استعمال کیا کرتی تھی۔ اس نے کہا، ''مجھے ایک کولیگ کی مدد کی ضرورت تو پڑ سکتی ہے، لیکن اس کے ساتھ ایک ہی کمرے میں بیٹھنا ضروری نہیں۔ اگر مرد بھی یہاں آ کر ہمارے ساتھ شامل ہو گئے تو انجام کار چیزوں کو اپنی مرضی کے مطابق چلانے لگیں گے۔ میں اپنا شو خود منظم کرنے کو ترجیح دیتی ہوں۔''

باسلہ بھی یونیورسٹی میں کلوزڈ سرکٹ ٹیلی ویژن پر ایم بی اے کی کلاسز پڑھتی رہی۔ عورتوں کو

سعودی عرب میں پہلی بار 1962ء میں یونیورسٹیوں میں داخلہ دیا گیا، اور خواتین کے تمام کالج مختی سے علیحدہ رہے۔ لیکچر رومز میں کلوزڈ سرکٹ ٹیلی ویژن اور ٹیلی فونز لگے تھے، تاکہ طالبات مرد پروفیسر کا لیکچر سنیں اور فون پر سوالات پوچھیں۔ اس طرح وہ خود کو پروفیسر کے سامنے لا کر آلودہ کرنے سے بچ سکتی تھیں۔ 1973ء میں جب درجن بھر لڑکیوں کی پہلی کھیپ نے گریجوایشن کی تو تقریب کے پروگرام میں اپنے نام نہ پا کر بہت مایوس ہوئیں۔ پرانی روایت کے مطابق عورتوں کا نام لیا جانا باعث بے عزتی تھا۔ لڑکیوں اور ان کے گھر والوں نے احتجاج کیا، چنانچہ ایک علیحدہ پروگرام پرنٹ کر کے لڑکیوں کی علیحدہ تقریب منعقد کی گئی جس میں صرف ان کی رشتہ دار خواتین شریک ہوئیں۔ دو ہزار عورتوں نے شرکت کی۔ ان کی فاتحانہ چیخ وپکار نے چھت کو ہلا کر رکھ دیا۔

خواتین کی یونیورسٹیوں نے خواتین کے لیے اعلیٰ تعلیم تک رسائی ممکن بنائی، لیکن اس نے تعلیمی تجربے کو بہت کھوکھلا بھی بنا دیا۔ 1962ء سے قبل بہت سے آزاد خیال سعودی گھرانوں نے اپنی بیٹیوں کو تعلیم کے لیے بیرون ملک بھجوایا تھا۔ وہ ایک ڈگری کے علاوہ بیرونی دنیا کا تجربہ بھی ساتھ لے کر واپس آئی تھیں۔ وہ چاہے مغرب میں گئیں، یا نسبتاً آزاد خیال عرب ممالک، مثلاً مصر، لبنان یا شام میں، لیکن انہیں سیکولر کلچر میں زندگی گزارنے کا موقع ملا۔ اب سعودی عورتوں کی پوری ایک نسل اپنے ہی ملک میں تعلیم مکمل کر چکی تھی۔ ہزاروں سعودی مردوں نے سرکاری خرچ پر بیرون ملک اعلیٰ تعلیم کا فائدہ اٹھایا، لیکن عورتوں کو 1980ء سے قبل اس قسم کے وظائف جاری نہیں کیے گئے تھے۔ حکومت کا موقف یہ ہے کہ ملک کے اندر خواتین کی تعلیم کے مواقع اتنے بہتر ہو گئے ہیں کہ وہ بہ آسانی اپنی تعلیمی ضروریات پوری کر سکتی ہیں۔ وزارت اعلیٰ تعلیم کے پالیسی پیپرز کے مطابق تعلیمی ضروریات کی تعریف یہ ہے ''ایک محفوظ اسلامی انداز میں عورت کی تربیت کرنا، تاکہ وہ بطور کامیاب بیوی اور بطور اچھی ماں زندگی میں اپنا کردار ادا کر سکے؛ نیز اسے اس کی فطرت کے مطابق دیگر سرگرمیوں کے لیے تیار کرنا، جیسے تدریس، نرسنگ اور طبی امداد۔''

نتیجتاً سعودی خواتین پروفیسروں کی ایک پوری کھیپ تیار ہوئی جو اپنے پاس زیر تعلیم نوجوان طالبات کی نسبت کہیں زیادہ آزاد خیال ہیں۔ جب کچھ خواتین پروفیسروں نے ڈرائیونگ کا حق مانگنے کے مظاہرے میں شرکت کی تو سب سے پہلے ان کی شاگرد طالبات نے ہی مخالفت کا بیڑا اٹھایا۔ ایک طالبہ پروفیسر کے دفتر میں آئی اور اس کے بال نوچنے اور گالیاں دینے لگی۔ ڈرائیوروں

پر اعتراض کرنے والی لڑکیوں کی وجہ سے کیمپس کی مسجد سے غصے بھرا احتجاج ہوا۔ مظاہرے کے بعد مذہبی جوشیلوں نے خواتین یونیورسٹی مستقل طور پر بند کرنے کا مطالبہ کیا۔

بیرون ملک تعلیم کے مواقع نہ ملنے کا مطلب ہے کہ سعودی لڑکیاں ایک ایسے تعلیمی نظام میں بند ہو کر رہ جائیں گی جو اب بھی مردوں سے پیچھے ہے۔ جیالوجی اور پٹرولیم انجینئرنگ جیسے مضامین سعودی عرب کی تیل پر مبنی معیشت میں بارسوخ ملازمتیں ملنے کی ضمانت عورتوں کے لیے ممنوعہ ہیں۔ سعودی عرب کی سات یونیورسٹیوں میں سے تین ـــ امام محمد بن سعود اسلامی یونیورسٹی، ریاض، یونیورسٹی آف پٹرولیم اینڈ منرلز اور اسلامی یونیورسٹی، مدینہ ـــ لڑکیوں کو داخلہ نہیں دیتیں۔ خواتین کے چند ایک کالجوں میں ہی لائبریریاں موجود ہیں۔ اور لڑکوں لڑکیوں کی مشترکہ لائبریریاں لڑکیوں کی پہنچ سے بالکل باہر ہیں یا ان کے لیے ہفتے میں صرف ایک دن کھلتی ہیں۔ اکثر اوقات لڑکیاں کتابیں خود نہیں دیکھ سکتیں، بلکہ انہیں کتاب کا نام ہی بتانا پڑتا ہے۔ لائبریرین انہیں مطلوبہ کتاب خود لا کر دیتا ہے۔

لیکن لڑکیاں اور لڑکے ڈگری کے ایک ہی امتحان میں بیٹھتے ہیں۔ پروفیسر خاموشی سے لڑکیوں کی تعلیمی کارکردگی لڑکوں کی نسبت بہتر ہونے کا امر تسلیم کرتی ہیں۔ ایک خاتون پروفیسر نے کہا، ''اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ ذرا ان کی زندگیوں کا جائزہ لیں۔ لڑکے شام کو گلیوں میں دوستوں کے ساتھ اپنی کاریں دوڑاتے پھرتے ہیں، وہ کیفے میں وقت گزارتے، بلیک مارکیٹ سے شراب خریدتے اور ساری ساری رات نشہ کرتے ہیں۔ لڑکیوں کے پاس کیا ہے؟ چار دیواریں اور کتابیں۔ ان کے لیے تعلیم ہی سب کچھ ہے۔''

1950ء اور 1960ء کی دہائی میں جب سعودی لڑکیاں تعلیم حاصل کرنے کے لیے بیرونِ ملک جاتیں تو اکثر بیروت کی امریکی یونیورسٹی (اے یو بی) کو منتخب کیا کرتی تھیں۔ 1866ء میں ورمونٹ کے ایک مبلغ ڈینئل بلس نے لڑکوں کے لیے ایک کالج کا سنگ بنیاد رکھا (جو بعد ازاں اے یو بی بنا) اور اعلان کیا: ''یہ ادارہ ہر طبقے اور شعبۂ زندگی سے تعلق رکھنے والے تمام مردوں کے لیے ہے، چاہے ان کا رنگ، قومیت، نسل یا مذہب کچھ بھی ہو۔ کوئی کالا، سفید یا زرد، عیسائی، یہودی، مسلمان یا بت پرست آدمی اس ادارے میں داخلہ لے کر تمام سہولیات سے فائدہ اٹھا سکتا

ہے.....اور وہ ایک خدا یا متعدد خداؤں پر ایمان، یا کسی بھی خدا پر ایمان رکھے بغیر یہاں سے تعلیم مکمل کر سکتا ہے۔"

اے یو بی نے 1905ء میں ہی یونیورسٹی میں وومینز سکول آف نرسنگ کھول لیا اور 1921ء میں طالبات کو مجموعی کیمپس میں داخلے کی اجازت دی۔ طالبہ مکمل پردے میں اور اپنے شوہر کے ہمراہ یونیورسٹی میں آتی تھی۔ 60ء کی دہائی کے وسط میں صرف مردوں کے لیے مخصوص آخری شعبہ یعنی انجینئرنگ بھی کوایجوکیشن ہو گیا۔

امریکی آزاد خیالی کا ٹرانس پلانٹ کچھ عرصہ تک تو کارگر نظر آیا۔ ایک لبنانی Druse لیلیٰ شرف نے 50ء کی دہائی کے دوران کیمپس میں درجنوں سیاسی اور فلسفیانہ تحریکوں کو جنم لیتے اور عرب قوم پرستی کو فروغ دیتے ہوئے دیکھا۔ اس نے کہا "بہت سے کلب موجود تھے۔ عرب کلچرل کلب، بعث پسند، فلسطین کے نقصان کا کلب۔" "لڑکیاں کافی شاپس میں لڑکوں کے ساتھ بیٹھ کر رات گئے تک بحث مباحثہ کیا کرتی تھیں۔ لیلیٰ شرف اپنے مستقبل کے شوہر، ایک اردنی مسلمان، سے اسی طرح کے ایک کلب میں ملی اور اس کے ہمراہ اردن واپس جا کر اردنی حکومت میں اطلاعات کی وزیر بنی، وہ ملکہ نور کی قریبی مشیر بھی تھی۔

60ء کی دہائی کے وسط میں اسلامی بنیاد پرستی کی جانب رجعت عرب قوم پرستی کی مقابل آئیڈیالوجی کے طور پر ابھرنا شروع ہوئی۔ یونیورسٹی کی آزادروی اور اس کا امریکی نام انتہا پسندوں کا نشانہ بننے لگا۔

اے یو بی میں لبرل پروگرام کا مرکز ہمیشہ سے ثقافتی مطالعات کا کورس رہا ہے جو طلبا کو گل گامش کی داستان سے ہومر، اوروِرجل، لاک، ڈیکارٹ اور ہوبز تک لاتا ہے۔ 1966ء میں بیروت کی کچھ مساجد کے اماموں نے نصاب کی ایک کتاب میں عیسائی ماہر الٰہیات ٹامس آکوینس کا ایک اقتباس دیکھ لیا جس میں کہا گیا تھا کہ اسلامی عقیدے کا تیزی سے پھیلاؤ مذہب کی خلقی صداقت پر دلیل نہیں۔ پولیس نے کافر مصنف کو گرفتار کرنے کے لیے کیمپس پر چھاپہ مارا۔ ثقافتی پروگرام کی تشکیل میں مدد دینے والے مؤرخ طریف خالدی نے اُن دنوں کو یاد کرتے ہوئے کہا "میں نے انہیں بتایا کہ مسٹر آکوینس اس وقت دستیاب نہیں۔" اس کی بجائے خالدی سے ہی پوچھ گچھ شروع کر دی گئی۔ اس کے ایک شاگرد حنان اشراوی نے شور مچایا اور یونیورسٹی کے صدر اور لبنانی وزیر

داخلہ کو بلوا کر پروفیسر کو رہائی دلوائی۔

1980ء کی دہائی میں حملے کوئی مذاق کی بات نہ رہے۔ 1984ء میں ایک روز حزب اللہ کے کارکنوں کا ایک مجمع کیمپس میں داخل ہوا اور اس کی عمارت پر سبز اسلامی جھنڈا نصب کر دیا۔ حزب اللہ کے روحانی رہنما شیخ فضل اللہ نے حضرت فاطمہؓ کے متعلق تقریر کی اور مسلمان عورتوں کے لیے ان کے مثالی کردار کی اہمیت پر زور دیا۔ اُس روز اتفاقاً یونیورسٹی میں آئے ہوئے جرمن دانشور وولف گینگ کوہلر نے کہا، ''بات یہ نہیں کہ اس نے کوئی مخصوص متنازع بات کہی تھی، لیکن آپ موسم کے متعلق بات کر سکتے ہیں اور ہر کسی کو مطلب سمجھ میں آ جاتا ہے۔'' کوہلر کے خیال میں اصل پیغام یہ تھا کہ حزب اللہ کو لبنان میں اہم ترین امریکی ادارے کے پھاٹکوں کے اندر آنے کا اختیار حاصل ہو گیا ہے۔

یہ پیغام جنوری 1984ء میں ظالمانہ طریقے سے دیا گیا جب یونیورسٹی کا صدر میلکم کیر اپنے دفتر کے نزدیک سائلنسر والے پستولوں کی گولیوں سے قتل ہوا۔ اے یو بی کے اساتذہ اور عملے کو بھی یرغمال بنایا گیا۔ 1985ء میں کیر کے قتل کے حوالے سے ثقافتی مطالعات کا پروگرام ایک مرتبہ پھر زیر عتاب آیا۔ اس مرتبہ مسئلہ مقدس صحائف کی تعلیم دینے کا تھا ایک انجیل، سینٹ پال کا ایک مراسلہ اور قرآن کی کچھ سورتیں جس کی قیادت ایک عیسائی استاد کر رہا تھا۔ تعریف خالدی بتاتا ہے: ''آرٹس کے شعبے میں تعداد بڑھنے کے ساتھ ساتھ زیادہ سے زیادہ طلبا نے ایک عیسائی سے قرآن پڑھنا معیوب پایا۔ چنانچہ ہم نے مقدس صحائف کو نصاب سے نکالنے کا فیصلہ کیا جس کا مجھے بہت افسوس ہوا۔ مثلاً آپ عہد نامہ عتیق یا عہد نامہ جدید کا مطالعہ کیے بغیر سینٹ آگسٹائن کو کیسے سمجھ سکتے ہیں؟''

زیادہ تر مواقع پر یونیورسٹی نے فرقہ ورانہ دباؤ کا مقابلہ کیا۔ لڑکے اور لڑکیاں درختوں تلے، ساحل سمندر والے کیمپس میں بدستور ملتے جلتے رہے اور بلیو جینز پہننے والی لڑکیوں کی تعداد نقاب پوش لڑکیوں سے بڑھتی رہی۔ اور یہ بات انتہا پسندوں کے پہلو کا کانٹا ہے۔ 1991ء میں ایک طاقتور بم نے کیمپس کا دل اڑا دیا اور پیچھے مرکزی پھاٹک تلے ملبے کا ایک ڈھیر چھوڑ گیا۔ پھاٹک پر یونیورسٹی کا نصب العین کندہ تھا: ''کہ وہ زندہ رہے اور پھلے پھولے۔''

تعریف خالدی کو اس حوالے سے کوئی شکوک نہ تھے کہ وہ اور اس کے کولیگ عیسائی اور مسلم

بنیاد پرستوں کے مقابلے میں کہاں کھڑے ہیں۔" میں بجا طور پر یہ یقین رکھ سکتا ہوں کہ وہ ہمارے کردار کی مضبوطی سے نفرت کرتے ہیں۔ مجھے خود معلوم ہے کہ میں نے دانستہ ان کے ذہنوں میں شک کے بیج بوئے تھے۔" عورتوں کے کردار کے شعبے میں اُسے شک کے بیج بونا پسند ہے۔ اس کی ماں نقاب کے بغیر بازار میں سرِعام گھومنے والی اولین عرب عورتوں میں سے ایک تھی۔ "وہ ہمیشہ قرآن پڑھتے ہوئے اپنا سر ہلایا کرتی تھی۔ اسے 'مرد عورتوں کے نگہبان ہیں' کی سطر سے کافی اختلاف تھا۔"

اے یو بی کے آزاد خیال اور متحمل مزاج کیمپس سے نکل کر غزہ کی اسلامی یونیورسٹی میں داخل ہونا جیسے وقت میں الٹ سفر کرنے کے مترادف تھا۔ درحقیقت اسلامی گروپس کا اثر و رسوخ بڑھنے کے ساتھ مستقبل کی بالکل درست تصویر غزہ کیمپس ہی پیش کرتا ہے۔

غزہ یونیورسٹی کا کیمپس درمیان میں سے تقسیم شدہ ہے۔ ایک حصہ لڑکوں اور دوسرا لڑکیوں کے لیے۔ 1993ء کے موسم بہار میں جب میں لڑکیوں کے کیمپس میں گئی تو سکارف اوڑھا اور ڈھیلا ڈھالا، ٹخنوں تک لمبا لباس پہنا، کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ ادارے میں حجاب کی سخت پابندی ہے۔ لیکن لڑکیوں والے حصے کے دروازے پر میری آمد نے پھر بھی ہلچل مچا دی۔ حال ہی میں گریجوایشن کرنے والی آسیہ عبدالہادی نے اپنے گردن سے پیروں تک بٹن لگے کوٹ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے وضاحت کی: "تمہارے لیے ایک جلبابہ ڈھونڈنا پڑے گا۔ حتیٰ کہ خواتین والے کیمپس میں بھی مرد پروفیسر پڑھاتے ہیں۔"

نجام کار کوئی لڑکی جا کر تھیلا نما نیا لباس لائی جو مجھ سے قد میں پانچ انچ لمبی کسی لڑکی کا ہوگا۔ میں نے ایک مٹھی میں کپڑا پکڑ لیا تاکہ چل سکوں اور آسیہ کے پیچھے چلتی ہوئی اونچی دیواروں والے کیمپس میں گئی۔

60ء کی دہائی کی جنگ مخالف تحریک میں جو حیثیت برکلے کی تھی وہی اب 90ء کی دہائی میں جہادیوں کے لیے اسلامی یونیورسٹی غزہ کی بن گئی۔ کیمپس میں اکثریت حماس نامی اسلامی گروپ کی حامی تھی جو اسرائیل کے خلاف تادمِ مرگ جنگ کا مطالبہ کرتا تھا۔ یونیورسٹی کی عسکریت اسرائیلیوں کے لیے اس قدر باعث پریشانی تھی کہ فوج نے کیمپس کو 1987ء سے 1991ء تک بند

فوجی زون قرار دیے رکھا، اور بیش تر اساتذہ کے علاوہ بہت سے طلبا کو بھی جیل میں ڈالا۔
ہم طلبہ کے کامن روم میں گئیں جہاں بیٹھی چند لڑکیاں کوک پیتی ہوئی گپ شپ کر رہی تھیں۔ ان سبھی نے ہلکے نسواری زیتونی یا گہرے نیلے رنگ کے جلبیے پہن رکھے تھے۔ آسیہ نے اپنی کچھ سہیلیوں سے متعارف کروایا جو یونیورسٹی انتظامیہ میں کام کرتی تھیں۔ میں نے پوچھا کہ کیا میں کچھ خواتین پروفیسروں سے بھی مل سکتی ہوں۔ ماجدہ عنان نامی تیس سالہ ایڈمنسٹریٹر نے کہا، ''دراصل یہاں کوئی خاتون پروفیسر نہیں۔ مرد استادوں کو ہی ترجیح دی جاتی ہے کیونکہ اصل میں مرد کو ہی ایک کیریئر کی ضرورت ہوتی ہے۔ عورت کی تو شادی ہو جائے گی اور شوہر اس کا خیال رکھے گا۔ اس کے علاوہ اگر یونیورسٹی کسی عورت کو ملازم رکھ بھی لے تو وہ صرف خواتین کے کیمپس میں ہی پڑھا سکتی ہے، جبکہ مرد پروفیسر دونوں حصوں میں پڑھانے کے قابل ہوگا۔ جب ہم اپنی اسلامی ریاست حاصل کرلیں گے تو مردوں اور عورتوں کا میل جول بالکل ختم ہو جائے گا۔''
خمینی کی بیٹی زہرہ تہران یونیورسٹی میں لڑکوں اور لڑکیوں کی مخلوط کلاسوں کو فلسفہ پڑھاتی تھی۔ میں نے ماجدہ سے اس بارے میں رائے مانگی۔ اس نے فوراً جواب دیا: ''اسلام میں کوئی آرا نہیں ہوتیں۔ اسلام کہتا ہے کہ اگر شدید ضرورت ہو تو مردوں اور عورتوں کا ملنا جائز ہے۔ اگر ضرورت نہ ہو تو انہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔''
مجھے غزہ یونیورسٹی میں کوئی مختلف بات ملنے کی امید تھی شاید ایک اسلامی نسوانیت پسندی کا بڑھتا ہوا رجحان۔ فلسطینی لوگ عورتوں کے مسائل کے معاملے پر ہمیشہ نہایت ترقی پسند لوگوں میں شمار ہوتے آئے ہیں۔ مَیں نے سوچا کہ اس جذبے نے عسکریت پسند اسلام کے ساتھ مل کر کوئی دلچسپ صورت حال پیدا کی ہوگی۔
لیکن عسکریت پسندوں نے غزہ میں اسلامی انقلاب پسندی کی ایک ایسی قسم متعارف کروائی جس نے فلسطینی عورتوں کے لیے وقت کو الٹا چلانے سے بھی بدتر خطرہ پیدا کر دیا۔ ماجدہ کی کہی ہوئی بات کبھی بھی فلسطینی ثقافت کا حصہ نہیں رہی تھی۔ اس کی بجائے اس کے نظریات درآمد شدہ تھے: ان پر ہر جگہ ''میڈ ان سعودی عربیہ'' کی مہر لگی تھی۔
حماس نے اپنے 36 نکاتی چارٹر کے دو نکات مسلم خواتین کے کردار کے لیے مخصوص کیے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ عورتیں ''مردوں کو جنم دیتی اور نئی نسل کی تعلیم و تربیت میں اہم کردار ادا کرتی

ہیں۔دشمنوں نے اس کردار کو سمجھ لیا ہے،اور اسی لیے وہ جانتے ہیں کہ اگر عورتوں کو اسلام سے دور کرنے کی خاطر تعلیم اور تربیت دیدی تو وہ جنگ بھی جیت جائیں گے۔ چنانچہ آپ انہیں اشتہارات اور فلموں، نصاب تعلیم اور ثقافت کے ذریعے کوشش کرتے ہوئے دیکھ سکتے ہیں۔ ان کے گماشتہ نمائندے مختلف صیہونی تنظیموں کے رکن ہیں جن کی مختلف شکلیں اور نام ہیں، جیسے فری میسن، روٹری کلب، جاسوسوں کے ٹولے وغیرہ۔لہٰذا ہمیں مسلمان لڑکیوں کے سکولوں اور نصاب تعلیم پر توجہ دینا ہوگی تاکہ وہ راست باز مائیں بنیں جنہیں جدوجہد آزادی میں اپنے فرائض کا شعور ہو۔انہیں اپنے گھربار چلانے کے متعلق پوری طرح آگاہ اور سمجھ دار ہونا چاہیے۔ کفایت اور گھریلو اخراجات میں بچت ہمارے نصب العین کی تکمیل کے لیے لازمی ہیں......''

1987ء میں پہلی مرتبہ غزہ کا دورہ کرنے پر بے نقاب اور بلیو جینز میں ملبوس لڑکیاں لڑکوں کے ہمراہ گلیوں میں نکل کر اسرائیلی سپاہیوں پر سنگ باری کررہی تھیں۔عین پیچھے کھڑی مائیں گیلے کپڑے یا کٹے ہوئے پیاز لیے تیار کھڑی تھیں تاکہ آنسو گیس کے اثرات رفع کیے جاسکیں۔عورتوں نے اس قسم کے احتجاجی مظاہروں میں اپنے کردار کی وجہ سے رتبہ حاصل کرلیا تھا۔اب، حماس کی مہربانی سے عورتوں کو واپس گھر بھیج دیا گیا تاکہ وہ بچے پیدا کریں اور گھریلو اخراجات بچائیں۔

بڑی بڑی کالی آنکھوں اور موٹی بھنوؤں والی دراز قد، پرفکر خاتون آسیہ نے کہا،''جدوجہد میں تبدیلی آگئی ہے۔پتھر پھینکنا اب بچوں کا کام ہے۔اصل ہتھیاروں سے لیس کارکن اب اپنے گھروں میں نہیں رہتے؛وہ ہمیشہ ایک سے دوسرے مقام پر جاتے رہتے ہیں،وہ کبھی یہاں تو کبھی وہاں رات گزارتے ہیں۔عورت ایسا نہیں کرسکتی۔''

جدوجہد میں تبدیلی آگئی تھی،اور غزہ میں بھی۔غزہ کی پٹی کو اسرائیل سے الگ کرنے والے فوجی روڈ بلاک سے گاڑی پر گزرتے ہوئے مجھے ایک بھی عورت بے پردہ نظر نہ آئی۔ ماجدہ نے بتایا،''اس میں کوئی جبر نہیں۔یقیناً ہم یہاں یونیورسٹی میں اسے اپنے اوپر لاگو کرسکتی ہیں، لیکن باہر کوئی زبردستی نہیں۔تعلق خدا کے ساتھ ہے اور ہر عورت اپنے لیے خود فیصلہ کرسکتی ہے۔''

میں نے کوک کا گھونٹ بھرا اور کچھ نہ کہا۔میں غزہ ہسپتال کے ایمرجنسی روم میں بیٹھی ہوئی تھی کہ ایک نوجوان فلسطینی نرس کپکپاتی ہوئی اندر آئی،اس کا یونیفارم نسواری دھبوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے کہا،''گلی میں لڑکے کھڑے تھے۔انہوں نے مجھے سر پہ چادر لینے کو کہا۔میں نے انہیں بتایا

کہ مَیں عیسائی ہوں، لیکن وہ کہنے لگے کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ انہوں نے کہا، کنواری مریم اپنا سر ڈھکتی تھیں تو تم کیوں ایسا نہیں کرتی؟' انہوں نے مجھے گلے سڑے پھل مارے اور بتایا کہ اگلی مرتبہ وہ تیزاب پھینکیں گے۔"

دن کی زیادہ تر کلاسیں ہو چکی تھیں۔ آسیہ نے بتایا کہ اگر میں لڑکیوں کی کسی مذہبی کلاس میں شرکت کرنا چاہتی تو اگلے روز صبح کے وقت آنا پڑے گا۔ "تم رات میرے پاس کیوں نہیں گزار لیتی؟" آسیہ نے پوچھا۔

میں ہچکچائی اور کہا، "مجھے رکھنے سے تمہیں بہت زحمت اٹھانا پڑے گی۔"

وہ ہنسی، "اوہو، کیا ہوا؟ کیا تم کیمپوں میں رہنے سے ڈرتی ہو؟ ہم بڑے مہمان نواز لوگ ہیں۔"

میں کچھ بوکھلائی ہوئی تھی۔ اس ہفتے غزہ میں ترقیاتی منصوبوں پر کام کرنے والے ایک اسرائیلی وکیل کو اس کے کچھ کلائنٹس نے کلہاڑوں سے مار ڈالا تھا۔ یروشلم میں میرے صحافی ساتھیوں نے مجھے غزہ کے کسی ہوٹل میں بھی قیام کرنے سے خبردار کیا تھا۔ "تمہارے وہاں موجود ہونے کی خبر پھیلنے کی دیر ہے — ایک رات سے زیادہ ٹھہرنا یقیناً غیر محفوظ ہوگا،" ایک صحافی نے تنبیہ کی۔

مَیں نے آسیہ سے کہا کہ مجھے اس کے ساتھ ٹھہر کر خوشی ہوگی۔ وہ میرے آگے آگے چلتی ہوئی گیسٹ ہاؤس تک گئی جہاں مجھے اپنی لمبی عبا واپس کرنا تھی۔ آسیہ نے چہرہ گھما کر کندھے کے اوپر سے پوچھا "ویسے تمہارا مذہب کیا ہے؟"

"میں یہودی ہوں۔"

آسیہ تیزی سے گھومی اس کا منہ بھنچ گیا، آنکھیں میرے چہرے پر گڑ گئیں۔ پھر اس نے پیچھے ادھر اُدھر نظر دوڑائی۔ میں اس کے تاثرات پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ غصہ؟ ناراضگی؟ مجھے کچھ سمجھ نہ آیا۔

مَیں نے اپنے مذہب کے متعلق اس سے پہلے صرف ایک مرتبہ جھوٹ بولا تھا، مشرق وسطیٰ میں آمد کے فوراً بعد۔ اس پر مجھے اتنی ندامت اور بزدلی محسوس ہوئی کہ دوبارہ کبھی ایسا نہ کرنے کا تہیہ کر لیا۔ تب سے ہی میں ہر سوال کرنے والے کو صاف صاف بتا دیتی ہوں۔ جواب سننے والے

لوگ عموماً مخاصمت کی بجائے پریشانی کا اظہار کرتے ہیں۔ اس کے بعد اکثر کچھ سوالات ہوتے ہیں: میں صیہونیت کے بارے میں کیا رائے رکھتی ہوں؟ کیا میرے خاندان میں کوئی شخص اسرائیل کو رقم دیتا ہے؟ لیکن آسیہ نے کچھ بھی نہ کہا۔

مَیں نے اس کی بازو پہ ہاتھ رکھا اور بولی، ''اگر تمہارا مطلب ہے کہ مَیں ہوٹل میں ٹھہروں تو کوئی بات نہیں۔''

وہ ایک دم اپنے ہوش میں آئی اور کہنے لگی، ''نہیں، تم میرے گھر رہو گی۔'' وہ لمبے لمبے قدم بھرتی ہوئی آگے بڑھی اور ایک ٹیکسی کو روکا۔ ہم Dier el Balah کے پناہ گزین کیمپ کی جانب روانہ ہوئیں۔ جب ٹیکسی غزہ شہر سے باہر نکلی اور مالٹوں کے باغات کے درمیان سے گزری تو آسیہ نے موضوع مذہب سے بدل کر کتابوں کی جانب کر دیا۔ اس کی ڈگری انگلش ادب میں تھی۔ وہ اپنے پسندیدہ ناولوں کے متعلق بات کرنے لگی. تامس ہارڈی کا ''ٹیس'' اور جین آسٹن کا ''تکبر اور تعصب۔'' مَیں مسکرا دی۔ ان دو مغربی کتب کا اسلامی نظریۂ دنیا کے ساتھ کوئی بھی تعلق تلاش کرنا ناممکن تھا۔ تامس ہارڈی نے جنسی بے توقیری کی شکار ایک عورت کی کہانی لکھی اور جین آسٹن کی تحریر میں جینٹ ہمشیران موزوں شوہروں کی تلاش میں جستجو کرتی ہیں۔

آسیہ کا گھر کیمپوں کی بدحال کوٹھڑیوں جیسا ہرگز نہیں تھا۔ یہ Dier el Balah کے عین کنارے پر واقع تھا جہاں کی خراب نالیوں سے بھرپور گلیاں کھیتوں کی جانب جاتی تھیں اور ان سے آگے سمندر کی میٹھی مہک آتی تھی۔ مکان ٹھوس، فراخ دلی سے تعمیر کردہ اور اونچی دیواروں والا تھا۔ آسیہ اپنی بیوہ ماں کے ساتھ مقیم تھی — خمیدہ کمر، آلو جیسی شکل والی ان پڑھ عورت جو اپنی دراز قد، پڑھی لکھی بیٹی سے کئی پشت پہلے کی معلوم ہوئی۔ دو چھوٹی بہنیں، ایک بھائی اور بھابی بھی گھر میں ان کے ساتھ رہتے تھے۔ آسیہ کا چھوٹا بھائی جیل میں تھا، کیونکہ اس پر حماس کا کارکن ہونے کا الزام تھا۔ دیگر بھائی بھی ادھر اُدھر جہاد میں مصروف تھے۔ ایک پی ایل او کی طرف سے عراق میں لڑ رہا تھا، ایک اور سعودی عرب میں استاد تھا، ایک یونان میں مزدوری کرتا تھا۔ سب کی آمدنیوں سے یہ مکان تعمیر ہوا۔

ساتھ مقیم بھائی عموماً اسرائیل میں مزدوری کرنے جایا کرتا تھا، لیکن فلسطینیوں کی جانب سے قتل کی کئی وارداتوں کے بعد کئی ہفتوں سے اسرائیل نے غزہ اور مغربی کنارے سے فلسطینیوں

کے اسرائیل میں نوکریوں پر آنے پر پابندی لگا رکھی تھی۔ یوں آسیہ کو اپنے گھر والوں کی روزی روٹی کے انتظام کی ذمہ داری اٹھانا پڑی۔ وہ ایک فلسطینی صحافی کے لیے بطور اسسٹنٹ کام کرتی تھی۔ جب وہ گھر میں داخل ہوئی تو ماں اور چھوٹی بہنوں نے اسے گھیرے میں لے لیا۔ وہ چائے لے کر آئیں، بدلنے کو کپڑے دیے، بال سنوارنے کے لیے ہیئر برش فراہم کیا۔ ایسی بااحترام توجہ میں نے عموماً صرف مردوں کو ہی ملتے دیکھی تھی۔

آسیہ نے اپنا حجاب اتارا اور اپنے کندھوں تک لمبے بال جھٹکے۔ جب اس کی بہن ہاتھ سے بنی ہوئی جرسی لائی تو اس نے ایک طرف رکھ دی اور عربی زبان میں بہتر والی مانگی۔ بہن کالی جرسی لے کر آئی جس کے بارڈر پر میرون پھول کاڑھے ہوئے تھے۔ اس نے کہا، ''دیکھا آپ نے۔ اب میں کافی مختلف لگتی ہوں۔'' واقعی وہ مختلف لگ رہی تھی۔ اس کے رخساروں کی اونچی ہڈیاں سکارف کے پیچھے چھپی ہوئی تھیں، بدن کسرتی تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اسے مایوس نہیں کرنا چاہیے۔ وہ بلیک اینڈ وائٹ موویز والے انداز میں تعریف کی امیدوار تھی جس میں سیکرٹری اپنے بال کھولتی اور چشمے اتار دیتی ہے۔ ''کیوں، مس آسیہ، تم حسین ہو!'' لیکن اب میں ان کی ظاہری صورت میں اچانک اس قسم کی تبدیلیوں کی عادی ہو چکی تھی۔

جب اس کی بھابی کھانا لائی تو وہ مصری اجناس کا ایک مجموعہ تھا۔ پسے ہوئے چنے، تلے ہوئے مٹر اور کوئی سبزی چیز۔ مصر نے 1949ء سے 1967ء تک غزہ پر حکومت کی اور مصری اثرات مستحکم رہے۔ ہم نے گدیوں پہ بیٹھ کر مختلف سبزیاں روٹی پر ڈالیں جو آسیہ نے صبح کام پر جانے سے پہلے بنائی تھیں۔

آسیہ عموماً خواتین کے مہمان خانے میں سوتی تھی اور چھوٹی بہن بھی اس کے ساتھ ہوتی۔ لیکن آج اس نے فیصلہ کیا کہ ہم دونوں اس کمرے میں ہوں گی۔ اس نے کشادہ کمرے میں دو باریک گدے بچھائے، ایک کونے میں بالکل ساتھ ساتھ۔

آسیہ اپنا ریڈیو لے کر آئی اور ڈائل گھمایا۔ میں مسکرا دی۔ کیونکہ رات کو سونے سے پہلے اور صبح جاگنے پر میں ہمیشہ ریڈیو پر خبریں سننے کی عادی تھی۔ اس نے بی بی سی عربی سروس، قاہرہ وائس آف دی عربز، ریڈیو مونٹ کارلو کے اسٹیشن باری باری لگائے۔ ایک جانی پہچانی آواز سن کر اس نے منہ بھینچا: حماس کارکنوں کے ترجمان کو اسرائیلیوں نے لبنان سے نکال دیا تھا۔ وہ پرجوش آواز میں

اسرائیل اور فلسطین کے درمیان امن مذاکرات دوبارہ شروع ہونے کو مسترد کر رہا تھا۔ اس نے کہا کہ امن معاہدہ باب الفتنہ کھول دے گا۔ آسیہ نے سر ہلایا۔ ''وہ ٹھیک کہتا ہے۔ حماس اس قسم کے معاہدے کو ہرگز قبول نہیں کرے گی'' لیکن جب یاسر عرفات نے معاہدے پر دستخط کر دیے حماس اور پی ایل او کے درمیان کوئی فتنہ کھڑا نہ ہوا۔ معاہدے کی مخالفت کرتے ہوئے حماس نے عہد کیا کہ وہ فلسطینی خون نہیں بہائے گی۔ اس کی بجائے اسلام پسندوں نے اسرائیلیوں پر حملے شروع کیے اور معاہدہ منسوخ ہونے کا انتظار کرتے رہے۔

خبریں ختم ہونے پر آسیہ اٹھی اور سر کے اوپر لگی ہوئی لائٹ آف کر دی۔ اس نے ایک کونے میں ہلکی سی روشنی جلتی رہنے دی۔ نیم تاریکی میں ہم نے سرگوشیوں میں باتیں کیں جیسے پاجامہ پارٹی میں لڑکیاں کرتی ہیں۔

آسیہ اپنے چھوٹے بھائی (جیل میں قید حماس کارکن) کی پیروی میں مذہبی بنی تھی۔ اس نے دس سال قبل حجاب لینا شروع کیا، جب اس کی عمر انیس برس تھی۔ اس نے کہا، ''ہر کوئی بہت حیران تھا۔ وہ کہتے، آسیہ نے حجاب کیوں لیا ہے؟ یہ اسلامی تحریکوں کے مضبوط ہونے سے کافی پہلے کی بات ہے۔ حجاب لینے سے قبل مَیں ہر چیز سے ڈرتی تھی: مجھے بھوتوں سے خوف آتا تھا، کمرے میں اکیلے جاتے ہوئے وحشت ہوتی۔ اسے پہنتے ساتھ ہی تمام خوف کافور ہو گئے۔ اب مَیں جانتی ہوں کہ یہ زندگی محض ایک کھیل ہے، دارالآزمائش۔ ایک بار آپ یہ بات تسلیم کریں تو اس زندگی میں کوئی بھی چیز آپ کو خوفزدہ نہیں کر سکتی۔''

آسیہ نے کچھ ہی عرصہ قبل لندن میں صحافت کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے وظیفہ جیتا تھا۔ ''کیا آپ کسی ایسی صحافی کو جانتی ہیں جو حجاب لیتی ہو؟'' اس نے پوچھا۔ مَیں نے کہا کہ ماسوائے ایران کے کہیں بھی عالمی میڈیا میں ایسی کوئی صحافی نہیں دیکھی۔

''شاید لندن میں ایسا کرنے والی میں پہلی لڑکی ہوں گی،'' اس نے کہا۔

29 سال کی عمر میں بھی غیر شادی شدہ ہونے کے باعث آسیہ غزہ میں ایک غیر معمولی شخصیت تھی۔ وہ متعدد رشتوں کے ابتدائی مراحل سے گزر چکی تھی۔ ''پہلے اس کی ماں اور بہن آتیں تاکہ مجھے حجاب کے بغیر دیکھ سکیں۔ اگر مَیں انہیں پسند آ جاتی تو وہ اپنے بیٹے کو مجھ سے ملوانے کا کہتیں۔ لیکن میں کہتی، 'نہیں، اتنی جلدی نہیں۔' پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ وہ مذہبی ہے؟ وہ کیا کام کرتا

ہے؟ کیا وہ نماز پڑھتا اور کوئی اچھی ملازمت کرتا ہے۔ مَیں کسی کو اس کے اڑوس پڑوس میں جانچ پڑتال کرنے بھیجتی؛ سہیلیاں مجھے تفصیلی رپورٹ دیتیں۔ بیشتر صورتوں میں یہ کافی ہوتا: مَیں اس کی ماں سے کہتی، 'اسے لانے کی زحمت نہ کریں، میں دلچسپی نہیں رکھتی۔' "

ملازمت کرنے کی وجہ سے بھی اُسے مردوں سے میل ملاقات کا موقع ملتا رہتا۔ لیکن وہ مغربی انداز محبت کی سخت مخالف تھی۔ "جب کوئی مرد مجھ سے پہلی بار اظہار محبت کرتا ہے تو وہ آخری بار بھی ہوتی ہے۔ مَیں اسے کہہ دیتی ہوں، 'مجھ سے ایسی بات نہ کرو۔ یہ رہا میرے بھائی کا نام۔ جاؤ اور اس سے مل کر جو کہنا ہے کہہ ڈالو۔' " جب آسیہ نے فلسطینی صحافی کو ملازمت کے لیے انٹرویو دے دیا تو اس کے بھائی نے ممکنہ آجر کا انٹرویو خود لیا تاکہ اپنی بہن کے لیے ہر چیز کا اطمینان کر سکیں۔ وہ مطمئن ہو گئے۔ باس ایک سچا مسلمان تھا، وہ گھر سے باہر جاتے وقت بھی ہمیشہ بیوی اور بچوں کو ساتھ رکھتا تھا۔

آسیہ اپنے ہاتھ سر کے پیچھے رکھ کر پشت کے بل لیٹ گئی اور خود کلامی جاری رکھی۔ "دراصل مجھے مردوں میں زیادہ دلچسپی نہیں۔ بس بچے پیدا کرنے میں ہے۔"

تو کیا جنسی علیحدگی کے عالیشان اصولوں کا منطقی انجام یہ تھا؟ جنس مخالف کا نہایت گہرائی میں استرداد؟ وہاں لیٹ کر آسیہ کی باتیں سنتے ہوئے مجھے تمام خوب صورت نوجوان مسلمان عورتوں کا خیال آیا جنہیں مَیں جانتی تھی. ایران میں میری مترجم حمیدہ جو سابقہ میڈیکل سٹوڈنٹ اور مجھے آج تک ملنے والی پانچ حسین ترین عورتوں میں سے ایک تھی؛ امارات کی سپاہی ہاجرہ؛ ایک کویتی سیاسی کارکن؛ ایک اردنی صحافی؛ ایک کرد استانی ــــ وہ اپنے اپنے معاشروں میں شادی کی نارمل عمر گزر جانے کے کافی عرصہ بعد بھی کنواری تھیں۔ اب مَیں نے سوچا کہ اُن سبھی نے ایسے مردوں سے ملاقات میں درپیش مسائل کا ذکر کیا جن سے وہ بات کر سکیں، انہیں سمجھ سکیں، اور جن پر اعتبار کر سکیں۔

آسیہ نے جیسے میرا ذہن پڑھ لیا، اور بولی، "ہاں، ہاں! شوہر بننے والے مرد کے ساتھ ایک گہرا تعلق قائم ہونا واقعی بہت اچھا ہوگا، لیکن مشرقی مردوں کے ساتھ یہ کام اتنا آسان نہیں۔" اُس نے زور دیا کہ اسلامی ورثے میں کسی چیز کی وجہ سے یہ کام مشکل نہیں۔ "مَیں کسی اسلامی مبلغ سے شادی کرنا چاہوں گی ــــ مغربی اسلامی مبلغ۔"

"گڈ لک،" مَیں نے کہا اور ہم دونوں ہنس دیں۔

آسیہ نے کروٹ لے کر اپنا منہ دیوار کی جانب کر لیا۔ میں سمجھی کہ وہ سو گئی ہے۔ مَیں نے آنکھیں بند کر لیں اور سونے ہی والی تھی کہ وہ دوبارہ بولنے لگی، اس کا چہرہ اب بھی دوسری طرف تھا: ''جب بھی اسلام کے بارے میں کوئی تحقیق کرنے آتا ہے تو وہ یہودی ہی نکلتا ہے۔ تمہارے خیال میں ایسا کیوں ہے؟''

''پتا نہیں،'' مَیں نے کہا، اور مجھے واقعی معلوم نہیں تھا۔ اسلام میں میری دلچسپی کا تعلق صرف ایک عورت ہونے کے ناتے تھا، یہودی ہونے کے ناتے ذرہ بھی نہیں۔ لیکن مَیں اس کا مطلب سمجھ گئی۔ مشرق وسطیٰ میں زیادہ تر مغربی رپورٹر یہودی تھے۔ مَیں نے کہا، ''شاید اس لیے کہ یہودیوں کو مشرق وسطیٰ کے مسائل میں زیادہ دلچسپی ہے۔ یا شاید اس لیے کہ یہاں مسلمان اور یہودی آپس میں لڑ رہے ہیں، اور یہودیوں کا خیال ہے کہ اسلام کو سمجھنے سے انہیں مسئلے کا حل تلاش کرنے میں مدد ملے گی؟'' آسیہ چپ تھی۔ مَیں نے خیال پیش کیا: ''شاید اُن میں سے کچھ سمجھتے ہوں کہ اسلام خطرناک ہے، اور وہ اس نکتہ نظر کی حمایت میں شہادت تلاش کرنے یہاں آتے ہوں۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔ گڈ نائٹ،'' وہ بولی۔

اگلی صبح کو یونیورسٹی میں ہم شعبہ مذہب کی ایک کلاس لینے گئیں جہاں خابت کو اسلامی ادوار حکومت پر ایک لیکچر سننا تھا۔ آسیہ نے کہا، ''تمہیں یہ سب بہت جان دار لگے گا۔ بہت سے سوالات اور بحث ہوتی ہے۔''

لیکن جب ہم پہنچیں تو لیکچر روم خالی تھا۔ ایک با نقاب طالبہ نے آسیہ کو بتایا کہ گزشتہ روز اسرائیل کے ساتھ امن مذاکرات دوبارہ شروع ہونے کے اعلان پر طالبات نے احتجاج کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ فلسطینی مندوبین کے سربراہ ڈاکٹر حیدر عبدالشفیع کے گھر کے باہر دھرنا دیئے گئی تھیں۔ اُس وقت صرف میتھ کی ایک کلاس ہو رہی تھی۔

آسیہ اور مَیں ہمت کر کے مردوں سے کیمپس میں گئیں تاکہ یونیورسٹی کے ترجمان کو تلاش کر سکیں۔ کوریڈورز باریش طلبا سے بھرے ہوئے تھے۔ جب ہم قریب سے گزریں تو سب نے اپنے نظریں دوسری جانب پھیر لیں۔ ترجمان احمد ساعتی چھوٹے قد کا فربہ آدمی تھا جس نے نیکٹی کے

زیادہ تر ارکان کی طرح حماس کا کارکن ہونے کے شبہ میں کافی عرصہ اسرائیلی جیل میں گزارا۔ اُس نے ہاتھ نہ ملا سکنے پر معذرت کی۔ ''ہمارے ہاں ایک کہاوت ہے: کسی عورت کے ہاتھ کو چھونے سے بہتر ہے کہ اپنے ہاتھ میں خنجر مارلو۔''

آسیہ نے پوچھا، ''لیکن نیت زیادہ اہم نہیں؟ میرے خیال میں اگر آپ اچھی نیت سے ہاتھ ملائیں تو کوئی حرج نہیں۔'' احمد خود بھی مصر میں اسلام انسٹی ٹیوٹ آف ہائر سٹڈیز سے گریجوایٹ تھا۔ اس نے دھیمے انداز میں تصحیح کی۔ ''آپ کی نیت تو ٹھیک ہو سکتی ہے، لیکن میری نیت کا کیا ہوگا؟ آپ دوسرے شخص کی نیت کیسے جان سکتے ہیں؟''

جب میں نے کوایجوکیشن کے متعلق پوچھا تو احمد جیسے پھٹ پڑا: ''اسلام میں مخلوط طرز تعلیم کی ممانعت ہے! ہم اس کے تباہ کن نتائج سے آگاہ ہیں۔ ہمارے پاس نام اور اعداد وشمار موجود ہیں۔'' اُس نے بتایا کہ مغربی کنارے کی ایک مخلوط یونیورسٹی Birzeit میں زنا کا واقعہ پیش آیا تھا۔ ''یہ چیز تباہ کن ہے، بالخصوص نوجوان لڑکیوں کے لیے۔''

میں نے اتفاق کیا، کیونکہ آج بھی باپ اور بھائی زنا کا شبہ ہونے پر اپنی نوجوان لڑکیوں کو مار ڈالتے ہیں۔ احمد نے کہا، ''ہمارا ان ورائے عدالت قتل وغارت سے کوئی واسطہ نہیں۔ اسلام ایسا کرنے کا نہیں کہتا۔ اسلام ثبوت مانگتا ہے۔ صرف ایک شہادت نہیں: چار شہادتیں۔ صرف ایک اعتراف نہیں، بلکہ ایک معتبر اعتراف۔''

تو پھر یونیورسٹی کی فیکلٹی جیسے پڑھے لکھے اسلامی علما قتل گری کے ان واقعات کے خلاف آواز بلند کرنے کی بجائے محض آنکھیں بند کیے کیوں بیٹھے ہیں؟ علما کلائٹورس کاٹنے کے خلاف کیوں نہیں بولتے جس کا رواج مصری حکومت کے دوران غزہ کی پٹی میں بھی پڑ گیا تھا؟

''یہ ایک حساس موضوع ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس طرح عورتوں کی شہوت کم ہو جاتی ہے۔ لیکن اسلام یقیناً اس کے خلاف ہے۔ تخلیق کیے گئے جسم کے ہر عضو کا ایک مخصوص کام اور مقصد ہے۔ یہ ٹانسلز جیسا معاملہ ہے: جب ان کی وجہ سے صحت کو خطرہ ہو تو اسے نکال دینا چاہیے؛ اگر کوئی خطرہ نہ ہو تو وہیں رہنے دیں۔ شاید مبلغ خواتین اس کے خلاف تبلیغ کر رہی ہیں۔ یقیناً ہمارے ہاں تو اس قسم کے آپریشن نہیں ہوتے۔ مصر میں ہوتے ہیں، لیکن یہاں نہیں۔''

''بڑی عمر کی عورتوں میں.....'' آسیہ نے کہنا شروع کیا لیکن احمد نے قطع کلامی کی: ''یہاں

نہیں۔ فلسطینیوں کے ہاں ہرگز نہیں۔" آسیہ خاموش ہوگئی۔ گزشتہ روز اُس نے مجھے بتایا تھا کہ اُس کی ماں کا کلائٹورس کاٹ دیا گیا تھا۔

احمد نے بات جاری رکھی، "یہ ایک مشرقی معاشرہ ہے۔ مشرقی معاشروں میں عورتوں سے متعلق بہت سی چیزوں کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن انہیں تبدیل کرنے میں وقت لگے گا۔ سب سے پہلے ہمیں ایک اسلامی ریاست حاصل کرنا ہوگی۔ دنیا میں تمام آفات کی وجہ اسلام کو اختیار نہ کرنا ہے۔ اسلام کو اپنانے پر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

جب احمد ایک کولیگ سے بات کرنے کے لیے معذرت کر کے اٹھا تو آسیہ نے بتایا کہ وہ خواتین کیمپس کے واش روم میں جانا چاہتی تھی۔ "میں یہاں اس کیمپس کے واش روم میں بھی جا سکتی ہوں، لیکن اچھا نہیں لگتا۔"

جب احمد واپس آیا اور مجھے اکیلے پایا تو دروازے پر ہی ٹھہر گیا۔ "آسیہ کہاں ہے؟ آپ کے ساتھ اکیلے بیٹھنا میرے لیے ممنوع ہے۔" ہم بہ مشکل ہی اکیلے تھے۔ دفتر کا دروازہ پورا کھلا ہوا تھا اور سامنے سے طلبا مسلسل آ جا رہے تھے۔

"کھلے ہوئے دروازے کے ساتھ بھی؟" مَیں نے پوچھا۔

"ہاں، ہاں، مَیں معذرت چاہتا ہوں۔ آسیہ کو بھی لانا ضروری ہے۔" اس نے کہا اور کوریڈور میں یوں واپس چلا گیا جیسے اُسے کوئی بیماری لگ گئی ہو۔ آسیہ کے واپس آنے پر ہم نے گفتگو جاری رکھی اور سیاست میں عورتوں کے کردار پر بات کی۔ احمد نے وضاحت کی کہ عورتیں مسلم برادری کی قیادت تو نہیں سنبھال سکتیں، لیکن اگر وہ راہنما کو بے عمل پائیں تو اس پر رائے دینا اور احتجاج کرنا اُن کا فرض ہے۔

اُس نے کہا، "خاندان میں عبادت کے دوران عورتوں کا کردار اس کی بہترین مثال ہے۔ عورت اپنے شوہر یا کسی بھی مرد کی امام نہیں بن سکتی، لیکن اگر امام کوئی غلطی کرے　　مثلاً کوئی دعا بھول جائے　　تو وہ ہاتھوں سے تالی بجا کر غلطی کا احساس دلانے کی پابند ہے۔"

"کیا وہ درست الفاظ خود نہیں بول سکتی؟"

نہیں، کیونکہ اُس کی آواز شہوت انگیز ہوتی ہے۔ وہ بول نہیں سکتی۔"

آسیہ نے مداخلت کی، "اگر وہ صرف گھر والوں کے ساتھ ہو تو یقیناً سبحان اللہ کہہ سکتی ہے۔"

احمد نے تردید کرتے ہوئے کہا، ''نہیں نہیں۔ وہ بالکل نہیں بول سکتی۔ وہ صرف تالی بجائے گی۔ عورتوں کو اپنی آواز کے معاملے میں بہت محتاط رہنا چاہیے۔ اگر کوئی مجھ سے ملنے گھر آئے اور مَیں گھر پر موجود نہ ہوں تو میری بیوی کہتی ہے، 'ہاں، ٹھہریں'، یا 'وہ گھر نہیں۔' بہت مختصر، نہایت نپے تلے انداز میں۔ عورت کو نفیس انداز میں ہرگز نہیں بولنا چاہیے۔ یہ بات قرآن میں ہے۔ چند الفاظ سے شروع ہونے والا سلسلہ دیگر چیزوں تک لیجاتا ہے۔''

مَیں اُس رات غزہ سے نکلی اور گاڑی ڈرائیو کر کے اگلے روز مغربی کنارے کی پتھریلی پہاڑیوں اور زیتون کے باغات میں سے گزری تاکہ ایک بہت مختلف قسم کی فلسطینی یونیورسٹی Birzeit میں کچھ پروفیسر خواتین سے ملاقات کر سکوں۔

ان خواتین اور آسیہ میں ایک پشت سے کم کا فرق تھا 37-43 سال عمر کی عورتیں جو اس کی بہنیں بھی ہو سکتی تھیں۔ لیکن دونوں کی تعلیم مکمل ہونے کے درمیانی برسوں میں کچھ واقع ہوتا تھا اور ان کے درمیان حائل خلیج ناقابلِ عبور لگنے لگی تھی۔ تاہم، میرے خیال میں Birzeit کی پروفیسر خواتین نے مسئلے کو تسلیم تو کر لیا مگر وہ اس کی وسعت کو مسترد کرتی ہوئی لگیں۔

اصلاح جد (Islah Gad) نے کلاسوں کا ٹائم ختم ہونے کے بعد مالٹے کے تازہ رس کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا، ''مسئلہ یہ ہے کہ ان لوگوں کو اپنی ثقافت کی ہی تفہیم نہیں۔'' ہم اس کے گھر کے سن روم میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ گھر عثمانی طرز کی ایک وسیع و عریض عمارت تھی پیش دالان اور گنبد دار چھتوں والی۔ اصلاح کی نظریں باغ کی جانب گئیں جہاں سرخ مٹی میں پھل دار درخت لگائے گئے تھے۔ وہ ایک چھوٹے سے کچھوے کو کیاریوں میں چلتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اس نے یونیورسٹی سے کار پر واپس آتے وقت کچھوے کو گلی میں دیکھا تھا اور اسے کسی کار کے ٹائر تلے کچلے جانے سے بچانے کی خاطر اٹھا لائی تھی۔

اصلاح کی پرورش مصر میں ہوئی اور وہ اپنے شوہر (ایک ممتاز فلسطینی کارکن) سے وہیں پر یونیورسٹی میں ملی۔ وہ اُسے ساتھ لے کر مغربی کنارے کے گاؤں البرہ (Al Bireh) گئی جہاں اس کا باپ میئر تھا (اسرائیلیوں نے اسے پی ایل او کا کارکن قرار دے کر نکال دیا)۔ ''اسرائیلیوں نے فلسطینی ثقافت کی جڑیں کھوکھلی کرنے کے لیے بہت کچھ کیا ہے، لیکن اسلامی تحریکوں کے مقابلے

میں ان کی کوششیں کچھ بھی نہیں،'' اس نے اپنی لمبی، خوب صورت انگلیوں پر مسائل گنوائے۔ سب سے پہلے تو حماس نے روایتی فلسطینی لباس کو مسئلہ بنایا میرون یا کالے رنگ کا خوب صورت اور لمبا کفتان جو فلسطینی عورتیں ہمیشہ سے پہنتی آئی تھیں، سامنے اور نیچے کی طرف کشیدہ کاری سے سجا ہوا، اور بال باندھنے کے لیے ایک نفیس سفید سکارف۔ ''یہ اسلامی لباس ہے۔۔۔۔ لیکن ان کی نظر میں نہیں۔ ان کے خیال میں رنگین دھاگوں سے کشیدہ کاری حرام ہے۔ قرآن میں کہاں یہ بات کہی گئی ہے؟ ہزاروں فلسطینی عورتیں ان ملبوسات کی تیاری کے ذریعے روزی کما رہی ہیں۔ لیکن انہیں اس بات کی کوئی فکر نہیں۔ وہ بائیں بازو والوں کو نظریات مستعار لینے کا الزام دیتے ہیں، لیکن ان کے اپنے تمام نظریات اور خیالات درآمد شدہ ہیں۔ اس سال Birzeit کتاب میلے میں میں نے عورتوں اور اسلام پر ایک سو کتابیں شمار کیں۔۔۔۔ سب مصر اور سعودی عرب کی تھیں۔''

فلسطینیوں کے سب سے لبرل اور سیکولر کالج Birzeit میں حماس اور جہاد جیسی اسلامی تحریکوں نے کسی بھی دوسرے سکول کے مقابلے میں کم ترقی حاصل کی تھی، لیکن پھر بھی ان کا اثر محسوس کیا جا رہا تھا۔ اصلاح کی ایک کولیگ للی فیدی نے کہا،''وہ برساتی کھمبیوں کی طرح ہیں، وہ مخصوص حالات میں نشوونما پاتے ہیں اور جب حالات سازگار نہ رہیں تو غائب ہو جاتے ہیں۔ اس وقت ان کا دوبارہ ظہور ناامیدی کی علامت ہے۔ چونکہ لوگ مایوس ہیں، اس لیے مافوق الفطرت وسائل سے رجوع کر رہے ہیں۔''

للی فیدی Birzeit میں لسانیات پڑھاتی تھی۔ اس نے کبھی غزہ اسلامی یونیورسٹی کے کیمپس میں قدم نہیں رکھا تھا۔ 'مَیں حجاب نہیں کرتی، اس لیے وہاں نہیں جا سکتی۔ اور مجھے وہاں بیٹھنے اور ان کے ساتھ بحث کرنے کا کوئی شوق بھی نہیں۔ جو بات چودہ سو سال پہلے درست تھی، آج نہیں ہے۔ معذرت چاہتی ہوں، لیکن اب ہم صحرانشین نہیں رہے؛ ہم بادیہ نشین بھی نہیں۔''

اصلاح نے بھی موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنی رائے دی۔''ان کی منطق کو جھٹلانا بہت آسان ہے۔ کوایجوکیشن کے موضوع پر ایک مباحثے میں حماس کے لڑکے اسے حرام قرار دے رہے تھے۔۔۔۔ کہ ہمیں مخلوط طرز تعلیم والے سکول بند کر دینے چاہئیں۔ مَیں نے اُن سے کہا: 'ٹھہرو۔ ہمارے تمام دیہات میں سکول مخلوط ہیں۔ دیہاتی لوگ دو دو سکول بنانے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ اگر تمہاری رائے پر عمل کیا جائے تو کیا ہوگا؟ کیا تمام لڑکیوں کو سکول سے فارغ ہونا پڑے گا؟ کیا تم

بھی چاہتے ہو؟' انہوں نے کہا، 'نہیں، نہیں ـــــ ہم نے سکولوں کے اخراجات کے بارے میں نہیں سوچتے۔' چنانچہ مَیں نے اُن سے کہا، تو جاؤ اور جا کر حقیقت کا جائزہ لو۔ سعودی عرب سے آئے ہوئے ان مصنوعی نظریات کو بھول جاؤ۔''

اصلاح اور تلی دونوں ہی یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں نظر آتی تھیں کہ اُبھرتا ہوا اسلامی سیلاب اُن کے اپنے عزیز برل خیالات کے لیے خطرہ بن سکتا ہے۔ میری نظر میں ان کے تجزیات خواہش پر مبنی تھے۔ مَیں نے اُن کی نسل کی پڑھی لکھی خواتین سے اس قسم کی بہت سی باتیں سنی ہیں ـــــ جیسے اردن کی لیلیٰ شرف جو عرب قوم پرست تحریک کے پرخروش زمانے میں پلی بڑھی تھی جب تمام کرشماتی شخصیت بائیں بازو کے سیکولر افراد تھے، جنہوں نے عورتوں کی آزادی پر زور دیا۔ ان خواتین کے لیے حماس کا نکتہ نظر مضحکہ خیز تھا۔ اور چونکہ وہ ان نظریات کے لیے اپنے اندر کوئی جھکاؤ نہیں رکھتی تھیں، اس لیے اپنی طالبات کی ان کی جانب رغبت سے آگاہ نہ ہو سکیں۔

اسلامی تحریکیں مشرق وسطیٰ کی تقریباً ہر ایک یونیورسٹی میں عروج حاصل کر رہی تھیں۔ اور جن شعبوں فیکلٹیز میں انہیں سب سے زیادہ پذیرائی ملی وہ ذہین ترین لوگوں کے گڑھ تھے ـــــ میڈیکل سکولز، انجینئرنگ ڈیپارٹمنٹس۔ اسلام کے لیے پکار پر کان دھرنے والے طلبا میں صرف مفلوک الحال ہی نہیں بلکہ بارسوخ طلب بھی شامل تھے۔ سحر اور آسیہ جیسی لڑکیاں جنہیں ہارورڈ اور لندن سے سکالرشپس ملے۔ انہیں آئندہ عشرے میں بارسوخ بننا تھا: ایسے لوگ جو اپنی اپنی اقوام کے مستقبل متشکل کریں گی۔

ایک یا دو عشرے قبل یہی باصلاحیت دانشور عرب قوم پرست رہے ہوں گے، لیکن یہ نظریہ عسکری شکستوں اور بدحال معیشتوں کے سوا کچھ بھی دینے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ باہر سے آئے ہوئے کسی شخص کے لیے یہ تصور کرنا مشکل تھا کہ یہ ''عظیم نظریہ'' بھی کچھ بہتری کر رہا ہے۔ لیکن جڑوں کی جانب واپسی اور بیرونی اثر کی تردید ہمیشہ سے ایک پرکشش نظریہ رہا ہے؛ مَیں نے آسٹریلیا میں نوجوانی کے دنوں میں خود بھی یہ کشش محسوس کی جب میں امریکہ کے زیر سایہ سانس لیتی اور اپنے ملک کو مجبوراً ویتنام کی دلدل میں دھکیلا جاتا ہوا دیکھتی تھی۔ ذہین نوجوان مسلمانوں کے سامنے موجود مستقبل متعدد درآمد شدہ نظریات کی ناکامیوں نے محدود کر دیا تھا۔ سحر نے بہت شروع میں ہی کہہ دیا تھا۔ ''ہم کچھ اپنا کرنے کی کوشش کیوں نہ کریں؟''

مجھے تشویش اس بات پر تھی کہ اسلام جن یونیورسٹیوں پر تسلط حاصل کر رہا تھا وہ اُن کی اپنی نہیں تھیں؛ نہ مصر کی بردبار روایت اور نہ ہی فلسطینیوں کے ترقی پسندانہ رجحانات، بلکہ سعودیوں کی دولت سے فروغ یافتہ مسخ شدہ تفسیر۔

جب میرا سعودی دوست مجھے ریاض کے شمال میں اپنے چچا سے ملوانے کے لیے لے کر گیا تو میں نے سوچا کہ وہ بوڑھا آدمی گزرتے ہوئے عہد کی ایک یادگار ہے، جس کی اقدار بھی ہمیں راستے میں نظر آنے والے پرانے قلعوں کی طرح یقیناً منہدم ہو جائیں گی۔

لگتا تھا کہ میرے دوست نے اپنی زندگی کے نصف سفر تک ہی بہت کچھ دیکھ لیا تھا۔ وہ اپنے چچا کے ڈیرے پر ایک کھجور کے درخت تلے پیدا ہوا، اُسے اونٹ پہ باپ کے گھر تک لایا گیا۔ پچیس سال بعد اس نے کونکورڈ پر اٹلانٹک پار کیا۔ امریکہ کے بہترین کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد اس نے اپنی پروفیشنل زندگی کو لندن، واشنگٹن اور ریاض میں تقسیم کیا۔ وہ روایت کو دعوت مبارزت دینے والی سمجھ بوجھ کا حامل تھا کلیشے بن چکی راسخ العقیدگی کو منکشف کر سکتی تھی۔

میں نے سمجھا کہ وہ مستقبل تھا: اس کا چچا اپنی گھر میں بند اور سکول سے محروم کردہ بیٹیوں کے ساتھ ماضی بن چکا تھا۔ مجھے یہ محسوس کرنے میں کچھ دیر لگی کہ یہ سب کچھ اتنا واضح نہیں تھا جتنا میں سمجھ بیٹھی تھی۔

میرا دوست اپنی نجی زندگی پر بات کرنے کی نسبت اوپیک کی خرابیوں پر تنقید یا عربی ادب میں یونانی آواز کے غلبے پر گریہ کرنے میں زیادہ راحت محسوس کرتا تھا۔ ایک مرتبہ میرے بار بار تنگ کرنے پر اس نے کچھ خود تنقیدی کے انداز میں بتایا کہ کیسے وہ مغرب کی آزاد زندگی کو چھوڑ کر ایک سعودی دلہن سے شادی کرنے واپس چلا آیا جسے شادی سے قبل صرف ایک بار ہی دیکھ پایا تھا۔ وہ اُسے کاروباری دوروں پر کبھی ساتھ نہ لے کر جاتا اور نہ ہی مجھ سے ملوایا (جب میں سعودی عرب میں تھی)۔ وہ بیٹیوں کا باپ تھا اور ان سے بہت خوش نظر آتا۔ لیکن ہمیشہ میرے دریافت کرنے پر ہی اس نے ان کے متعلق بات کی۔

ایک مرتبہ لندن میں ڈنر پر میں نے اُس سے پوچھا کہ وہ انہیں تعلیم دینے کے بارے میں کیا پروگرام رکھتا ہے؟ اس نے نظریں نیچے پلیٹ کی طرف جھکا لیں اور اپنے کانٹے سے کھیلنے لگا۔

''میں ان کی تربیت سعودی عورتوں کے طور پر ہی کروں گا۔ میں کچھ لوگوں کی طرح انہیں آدھا یہاں اور آدھا وہاں کے مطابق بنانے کی غلطی نہیں کرنا چاہتا۔ انہیں اپنی شناخت معلوم ہونی چاہیے،'' اس نے کہا۔

''لیکن اگر ان میں سے ایک خداداد صلاحیت کی مالک طبیعیات دان یا ریاضی دان نکلی تو؟ اگر اُس نے تعلیم حاصل کرنے کے لیے بیرون ملک جانا چاہا تو؟ میں نے پوچھا۔ میں سوچ رہی تھی کہ وہ کہے گا، ''ہاں، ایسی صورت میں وہ یقیناً ہارورڈ یا پرنسٹن یا کیمبرج میں تعلیم حاصل کرے گی۔'' لیکن وہ کچھ بھی نہ بولا۔

اس کی بجائے اس نے ایک آہ بھری۔ ایک طویل اور گہری سانس جس نے مجھے اس کے چچا کی یاد دلا دی جب میں نے اس سے عورتوں کی ڈرائیونگ کے متعلق پوچھا تھا۔

میرے دوست نے کہا، ''ہاں، یہ ایک مسئلہ ہوگا۔ اور جب یہ مسئلہ پیش آئے گا تو مجھے اس کا حل تلاش کرنا ہوگا۔'' تبھی مجھے احساس ہوا کہ میرے دوست اور اس کے چچا کے درمیان فاصلہ میری سوچ کے برعکس زیادہ نہیں۔

زیادہ تر اہل مغرب کی طرح میں نے بھی ہمیشہ مستقبل کا تصور ایک زیادہ روشن جگہ کے طور پر کیا ہے جہاں ایک قسم کی اخلاقی ارضیات ماضی اور حال کی غلطیوں کی ظالمانہ دھاروں کو کند کر چکی ہوگی۔ لیکن غزہ اور سعودی عرب میں مجھے کچھ مختلف دیکھنے کو ملا۔

وہاں کھڑے ہوکر مستقبل حال سے بھی زیادہ تاریک دکھائی دیتا ہے۔

آٹھواں باب

خطرناک کام

''عرب نیوز'' کے جدہ آفس میں فائزہ امبہ نامی رپورٹر نے اپنی ڈیسک کے اوپر بلیٹن بورڈ پر ایک کارٹون لگا رکھا تھا۔ ایک مضحکہ خیز خاکے کے نیچے کیپشن میں لکھا تھا: ''کچھوے کو دیکھیں۔ یہ صرف تبھی آگے بڑھتا ہے جب اپنی گردن باہر نکال لے۔'' فائزہ گاہے بگاہے کی بورڈ پر اٹکی ہوئی پوزیشن سے پیچھے ہٹتی اور سیدھی ہو کر اپنا کالے شفون کا سکارف چہرے کے گرد کستی۔

فائزہ نے اپنی گردن باہر نکال رکھی تھی۔ سعودی معیار کے مطابق اس کے آرٹیکلز بے باک تھے۔ کویت کی جنگ کے بعد اس نے سعودی عورتوں کے نئے موڈ پر سوچ بچار کی اور پریس سنسر شپ کا نازک سوال اٹھایا۔ لیکن اس کی سب سے بے باک حرکت کام کرنے کے لیے گھر سے باہر آنا تھا۔ جبے اور نقاب میں ملبوس ہونے کے باوجود اسے ہر روز اخبار کے مخلوط دفتر میں آتے وقت خطرہ مول لینا پڑتا جہاں مرد اس کے آس پاس کام کرتے تھے۔ اس نے کہا، ''جب ایڈیٹر نے مجھے ملازمت دی تو اس کا خیال تھا کہ میں شاید گھر بیٹھ کر ہی کام کروں گی: فون پر رپورٹنگ اور الیکٹرانک طریقے سے خبر فائل کرنا۔ لیکن رپورٹر اس طریقے سے کام نہیں کر سکتا۔ آپ کو اردگرد کی دنیا پر نظر رکھنا پڑتی ہے۔''

دن کے اختتام پر جب وہ اپنا آرٹیکل فائل کر دیتی تو سکارف اور حجابیہ کو ٹھیک کر کے کار پارک کی جانب بڑھتی۔ سعودی قانون میں اسے ڈرائیونگ کی اجازت نہ ہونے کے باعث وہاں اس کا

یعنی شوفر اُسے گھر لیجانے کے لیے تیار کھڑا ہوتا۔ جب پہلی مرتبہ فائزہ سے ملاقات ہوئی تو اس نے سعودی خواتین کو درپیش مشکلات کے متعلق میرے تحریر کردہ ایک آرٹیکل کو فضول قرار دیا۔ وہ اپنی اور اپنی ڈاکٹر یا بزنس میں سہیلیوں کی کامیابیوں پر فخر مند تھی۔ اس کا خیال تھا کہ میں نے سعودی عورتوں پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی جو کام کر رہی تھیں اور معاشرے میں تبدیلی لا رہی تھیں۔

فائزہ اور اس کی سہیلیاں اصل میں رسولؐ اللہ کی وفات کے بعد کی صدیوں میں کھویا ہوا میدان واپس لینے کی ہی کوشش میں تھیں۔ ہر سعودی عورت جانتی ہے کہ رسولؐ اللہ کی پہلی زوجہ حضرت خدیجہؓ تجارت کرتی تھیں، دوسری بیوی حضرت سودہؓ چمڑے کا کام کر کے اپنے گھریلو اخراجات پورے کرتی تھیں؛ حضرت فاطمہؓ چرخے پر اتنا کام کرتیں کہ ان کے ہاتھوں سے خون بہنے لگتا۔ بنت رسولؐ اللہ ایک روز کام اور ایک روز پڑھائی کیا کرتی تھیں۔ جب وہ کام کر رہی ہوتیں تو اپنی کنیز کو پڑھنے بھیج دیتیں۔

فائزہ کام کرنے والی مٹھی بھر سعودی عورتوں میں سب سے زیادہ نمایاں تھی کیونکہ اس کا نام اکثر اخبار میں چھپتا تھا۔ کچھ دیگر سعودی صحافی خواتین بھی تھیں، لیکن میری معلومات کے مطابق ان میں ایک فائزہ ہی ایسی تھی جس نے اپنے اخبار کے دفتر میں بیٹھ کر کام کرنے کا خطرہ مول لیا۔ خطرہ یہ تھا کہ ''نیکی کے فروغ اور برائی کے تدارک'' کی کمیٹی کی مذہبی پولیس (mutawain) کسی روز دفتر میں گھس کر اُسے قواعد کی خلاف ورزی کرتے ہوئے پکڑ نہ لے۔ مذہبی پولیس کے اہل کار سعودی نظام انصاف کے شتر بے مہار ہیں، متعصب رضا کار جو گلیوں اور شاپنگ پلازوں میں لوگوں پر دھاڑتے پھرتے۔ پہلا ہدف بے حجاب چہرے اور دوسرا نشانہ نماز کے وقت بھی دکانیں کھلی رکھنے والے دکان دار بنتے۔ کچھ اہل کار سرکشوں کو مارنے کے لیے بید کی چھڑیاں بھی ساتھ رکھتے۔ حکومت کی طرف سے ان دست درازیوں کی اجازت نہیں تھی، لیکن وہ اُنہیں لگام بھی نہیں ڈال سکتی تھی۔ سعودی حکمران خاندان بنیاد پرستوں کی ایک لہر سے خوفزدہ تھا جو انہیں بھی اُسی طرح بہالے جائے گی جیسے ایرانیوں نے شاہ کو معزول کیا تھا۔ سو حکومت نے مذہبی اہل کاروں کو گشت کے لیے فینسی کاریں خرید کر دیں اور ان کی سرگرمیوں سے نظر پوشی اختیار کی۔ نتیجتاً اہل کار بے خوف ہو گئے۔ حتیٰ کہ انہوں نے ایک السعود شہزادی کو بھی گالیاں دیں جو بے حجاب نوکرانی کے ساتھ کام کر رہی تھی۔

ان اہل کاروں کے متعلق شاید سب سے زیادہ تحقیر آمیز بات یہ تھی کہ وہ گلیوں میں عورتوں کو گالیاں دینے کے سوا ''جرائم'' کے حوالے سے اور کوئی اقدام نہیں کرتے تھے۔ اگر کوئی عورت لباس یا محرمات کی خلاف ورزی کرتی تو اہل کار اس کے شوہر، باپ یا بھائی کو مطلع کرتا جو اس کے ''ذمہ دار'' سمجھے جاتے تھے جیسے سکول میں پرنسپل نالائق بچے کے ساتھ سلوک کرتا ہے۔ سعودی نظام میں تمام عمر کی عورتیں ناسمجھ بچوں جیسی ہیں۔ کسی بھی عمر کی ہر عورت کو ملک کے اندر سفر کرنے سے پہلے بھی اپنے شوہر، بیٹے یا پوتے کی جانب سے تحریری اجازت نامہ دکھانا ہوتا ہے۔

ایک مرتبہ فائزہ اپنا اجازت نامہ قاہرہ میں ہی بھول گئی۔ اس کا شوہر ملک سے باہر گیا ہوا تھا اور رسائی سے باہر تھا۔ اُسے اکیلے سفر کرنا تھا، لیکن اجازت نامے کے بغیر جدہ میں ہی پھنس کر رہ گئی۔ ''میں اپنے بال نوچ رہی تھی،'' اس نے کہا۔ باپ مدد نہیں کر سکتا تھا، کیونکہ شادی کے بعد عورت کا شوہر ہی سعودی حکام کی نظر میں معتبر ہوتا ہے۔ انجام کار اسے اپنے ایک کزن کا انتظار کرنا پڑا جس کے ہمراہ وہ قاہرہ گئی اور اجازت نامہ لیا۔ بڑی عمر کی عورتوں کے لیے اس قسم کے قوانین اور بھی زیادہ باعث تحقیر ہو سکتے ہیں۔ مثلاً کوئی بیوہ دادی اگر اپنے کسی قریب ترین مرد رشتہ دار سے ملنے جانا چاہتی ہو تو تب بھی اسے پوتے سے اجازت نامہ لینا پڑتا ہے۔

جزواً اس قسم کی ذلت کے خدشے کی وجہ سے چند ایک سعودی عورتیں ہی گھر سے باہر کام کرتی ہیں۔ 1986ء میں ایک سعودی تنخواہ دار ملازم عورتوں کی شرح صرف 4 فیصد تھی۔ زیادہ تر صورتوں میں اس قلیل تعداد کی وجہ عورتوں کے لیے دستیاب ملازمتوں کا فقدان ہے۔ سعودی حکومتوں میں براہ راست زنانہ امور سے متعلقہ ملازمتیں بھی مردوں کے پاس ہیں۔ 1975ء میں میکسیکو سٹی میں اقوام متحدہ کی بین الاقوامی کانفرنس برائے خواتین میں سعودی عرب کا ''خواتین وفد'' صرف مردوں پر مشتمل تھا۔

لیکن جن شعبوں میں عورتیں کام کر سکتی تھیں، وہاں بھی شوہر انہیں کام کی اجازت دینے پر متذبذب تھے۔ فائزہ کا ابتدائی شوہر اپنی بیوی کی کامیابیوں پر فخر مند تھا۔ کچھ اور سعودی شوہر بھی یہی جذبہ رکھتے تھے۔ لیکن اکثر کسی عورت کی کامیابی پر فخر اور مستقبل کے امکانات کے درمیان کھنچاؤ موجود رہتا۔ ایک بزنس مین نے میڈیکل سکول سے اپنی بیوی کی گریجوایشن پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے امید ظاہر کی کہ وہ سرجری میں سپیشلائزیشن کرے گی، ''تاکہ جب وہ اپنے مریضوں کو

چھوئے تو وہ ہوش میں نہ ہوں۔"

سعودی اخبارات میں کام کرنے والی بیویوں کا مسئلہ اکثر اٹھتا رہتا، بالخصوص مذہبی صفحات پر۔"بیوی کن صورتوں میں کام کرنے باہر جا سکتی ہے؟ کیا اسلام اسے اجازت دیتا ہے؟ اور اگر دیتا ہے تو کن حالات میں؟" سعودی گزٹ کے مذہبی ایڈیٹر کے نام خط میں ایک "جدہ سے، ملازم بیوی" نے پوچھا۔ ایڈیٹر نے جواب میں لکھا: "شادی ہونے پر کچھ قانونی اور اخلاقی حقوق حاصل ہو جاتے ہیں۔ مردوں اور عورتوں کو ان کی مخصوص جسمانی ساخت اور حیاتیاتی وظائف کے مطابق خاندان میں ایک مخصوص کردار تفویض کیا گیا ہے۔ ...۔شوہر کا کام کنبے کو روٹی فراہم کرنا ہے۔ اگر اس کی آمدنی کنبے کی کفالت کے لیے کافی نہیں، یا وہ نسبتاً موزوں معیار حیات اپنانے کے قابل کمائی نہیں کر سکتا، اور اس کی بیوی راضی ہو تو دونوں مل کر کام کر سکتے ہیں۔ تاہم، اس کے لیے تین شرائط ہیں '1- شوہر جب بھی مناسب سمجھے اپنی بیوی کی ملازمت چھڑوا سکتا ہے؛ 2- وہ کسی بھی ایسی ملازمت پر اعتراض کا حق رکھتا ہے جس میں بیوی کو کوئی نقصان، تحقیر یا شہوت انگیزی کا خطرہ سمجھے؛ اور 3- بیوی جب چاہے اپنی ملازمت چھوڑ سکتی ہے۔"

ایک مرتبہ سعودی عرب کی فلائٹ میں مَیں ایک سعودی کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی جو ایک سال سے اس مسئلہ میں الجھا ہوا تھا کہ اُس کی بیوی کے لیے کس قسم کی ملازمت موزوں رہے گی۔ وہ خود تجارت کرتا تھا، اور جدہ کا ہوائی اڈہ قریب آنے پر بہت بے چین ہو گیا۔ جب جہاز لینڈنگ کے لیے چکر کاٹ رہا تھا تو اس نے سفید رومال سے اپنے ابروؤں کو پونچھا۔ وہ اپنے سامان میں شامل انڈرویئر ملبوسات کے متعلق پریشان تھا۔ اُس نے سرگوشی کی: "دو سو سے زیادہ بریزیئرز۔ میں نے لندن میں مارکس اینڈ سپنسر سے خریدے تھے۔ سب اسرائیل کے بنے ہوئے۔" سعودی نے تمام "صیہونی" مصنوعات کا بائیکاٹ کر رکھا تھا۔ چنانچہ ایک رات پہلے اپنے لندن کے ہوٹل میں وہ کافی دیر تک موٹا مارکر پین لیے بیٹھا رہا۔ اس نے سب پر سعودی ریال میں قیمتیں لکھیں تاکہ اسرائیل کا نام نہ پڑھا جائے۔ "لیکن میں بہت تھک گیا تھا۔ اگر ایک بھی بریزیئر پر نام لکھا رہ گیا ہوا اور کسٹمز نے دیکھ لیا تو میرے لیے مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔" اس نے دوبارہ اپنی پیشانی پونچھی۔ "مَیں کیا کر سکتا ہوں؟ میں ایک تاجر ہوں اور سعودی عورتیں یہ بریزیئرز خریدنا پسند کرتی ہیں۔"

سعودی کسٹمز کی تلاشی بدنام زمانہ تھی۔ وہاں کام کے لیے جانے والے ایک امریکی کو پونچ

پشتوں سے چلی آ رہی خاندانی بائبل کو اپنی نظروں کے سامنے ریزہ ریزہ ہوتے دیکھنا پڑا کیونکہ سعودی عرب میں غیر مسلم مذہبی چیزیں لانے پر پابندی تھی۔ سعودیوں نے دوسرے مذاہب کی علامت پر بھی اس حد تک پابندی لگائی کہ جس جہاز میں ہم سفر کر رہے تھے، اسے حال ہی میں دوبارہ پینٹ کیا گیا تھا۔ بنیاد پرستوں کو شکایت تھی کہ سعودیہ کے سابقہ لوگو میں s اور a کی درمیانی خالی جگہ عیسائیوں کی صلیب جیسی لگتی تھی۔

میرا خیال تھا کہ میں نے اپنے سامان کو ایسی تمام چیزوں سے پاک کر لیا ہے جسے مذہبی قرار دیا جا سکتا ہو۔ لیکن جدہ میں کسٹمز ڈیسک پر بیٹھے درشت نوجوان انسپکٹر نے میرے بیگ میں سے دو کتابیں نکالتے ہوئے مجھے گھورا۔ ایک کتاب ''Political Dictionary of the Arab Word'' تھی اور دوسری عرب کے قدیم سیاحوں کے متعلق ''Passionate Pilgrims۔'' پہلی کتاب کے نام میں لفظ ''political'' باغیانہ تاثر رکھتا تھا۔ دوسری کتاب کے نام میں لفظ ''passionate'' اسے پورنوگرافی کے لیے مشکوک بناتا تھا، اور لفظ ''pilgrims'' مذہبی نوعیت کا حامل تھا۔

تاجر محمد نسبتاً خوش قسمت ثابت ہوا۔ میں نے اسے بیرونی ہال میں مسکراتے ہوئے دیکھا۔ مشتبہ بریزیئرز انسپکشن سے بچ گئے تھے۔ اس نے کہا کہ کامیابی کی خوشی میں میں اگلے روز اسے اور اس کی بیوی عدیلہ سے ملنے اس کے گھر آؤں۔

محمد اپنے وسیع خاندان کے ساتھ چھوٹے سے اپارٹمنٹ میں رہتا تھا: باپ اور ماں گراؤنڈ فلور پر؛ بھائی، بھابیاں اور بچے بالائی فلیٹس پر۔ سعودی عرب کے جدید شہروں میں بھی خاندان بدستور صحرائی قبائلی خطوط پر چل رہے تھے۔ سعودی مرد شادی کرنے پر اپنی بیویوں کو والدین کے گھر لاتے۔ امیر گھرانے تو نئے کنبے کے لیے بہ آسانی جگہ بنا سکتے تھے۔ نسبتاً غریب گھرانوں میں ہر بیٹے کی شادی ہونے پر ایک منزل کا اضافہ ہوتا جاتا۔ نتیجتاً سعودی شہر نامکمل عمارات سے بھری ہوئی لگتی تھیں۔ فلیٹ کی چھتوں میں سے لوہے کے سریے باہر نکلے ہوئے نظر آتے۔

میرا خاندان تین براعظموں میں بکھرا ہوا تھا۔ لہٰذا ہر کسی کو ایک ہی عمارت میں دیکھ کر رشک آیا۔ لیکن محمد اس نظام کو باعث فضیحت محسوس کرنے لگا تھا۔ جب ہم زینہ چڑھ رہے تھے تو ہر فلور پر دروازے کھلے، کیونکہ بھائی اور چھوٹے بھتیجے بھتیجیاں محمد کے ساتھ آنے والی مخلوق کو دیکھنا

چاہتے تھے۔صرف اپنے کنبے کے لیے کچھ نجی رازداری حاصل کرنے کی خاطر اس نے ایک نیا گھر بنوانا شروع تو کیا تھا، لیکن وہاں منتقل ہونے کے حوالے سے پر یقین نہیں تھا۔''باپ کو یہ بات سمجھ نا مشکل ہے کہ دور چلے جانے کا خیال بہتر ہے،'' اس نے آہ بھری۔ محمد 35 سال کا ہو چکا تھا، لیکن باپ کی بات اب بھی حرف آخر تھی۔

بیشتر سعودیوں کی طرح محمد بھی صبح سات بجے سے دوپہر ایک بجے تک کام کرتا، چند گھنٹے کے لیے کاروبار سے واپس گھر آتا۔ دن کی گرمی کے دوران سکول اور دفاتر بند رہتے اور سب گھر والے مل بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ محمد اور عدیلہ مغربی انداز میں ایک میز پر بیٹھتے۔ لنچ کے بعد گھر والے ٹی وی کے سامنے پھیل جاتے اور مذہبی چینلز کو نظر انداز کر کے کسی مصری چینل کا سگنل پکڑتے جہاں فلمیں اور ورائٹی شوز دکھائے جاتے تھے۔

جب عدیلہ کی شادی محمد سے ہوئی تو وہ سکول کی سولہ سالہ طالبہ تھی۔ اس نے اپنے بچے پیدا کرنے اور پالنے کے دوران سوشیالوجی کی ڈگری مکمل کی۔''کورس میں شامل زیادہ تر لڑکیاں یہی کر رہی تھیں،'' اس نے بتایا۔ متعدد سعودی سکولوں میں طالبات کے بچوں کے لیے ڈے کیئر سنٹر اور نرسریز مہیا کی گئی تھیں۔ بچے کی پیدائش کے حساب سے امتحانات کے شیڈول میں ردوبدل کیا جا سکتا تھا۔ یونیورسٹی کے بعد جب اس کے دو بیٹے اور بیٹی بھی سکول میں داخل ہوئے تو عدیلہ کی حالت نہایت دردناک ہو گئی۔''بچوں کے چلے جانے کے بعد ہر صبح نہایت بے کیف ہوتی۔'' ماضی میں وہ محض مزید بچے ہی جنتی جاتی۔ دیہی علاقوں میں بہت سی سعودی عورتیں اب بھی ہر ممکن حد تک زیادہ سے زیادہ بچے پیدا کرتی تھیں۔ جدہ کے ایک ہسپتال میں اٹھارہ ماہ سے تعینات ایک برطانوی ڈاکٹر ایک اٹھائیس سالہ بدو عورت کا چیک اپ کر رہا تھا۔''میں نے اُس سے پوچھا کہ اُسے آخری مرتبہ حیض کب آئے تھے؟ اس نے پوچھا، 'حیض کیا ہوتے ہیں؟' پتا چلا کہ اسے کبھی حیض آئے ہی نہیں تھے۔ عنفوان شباب سے پہلے ہی بارہ برس کی عمر میں اس کی شادی ہو گئی۔ تب سے وہ مسلسل حاملہ رہی یا پھر بچوں کو دودھ پلاتی رہی۔''

لیکن عدیلہ اور محمد جیسے شہری سعودیوں کی اکثریت کے لیے بڑے کنبے کی قبائلی روایت اب قابل عمل نہیں رہی تھی۔ چنانچہ میڈیسن، تعلیم یا ویمنز بینکوں میں اسلامی لحاظ سے جائز نوکریوں کے لیے اب زیادہ سے زیادہ پڑھی لکھی عورتیں درخواستیں دے رہی تھیں۔ سعودی منیجروں اور عملے

والے بینک 1980ء میں کھلے تھے کیونکہ سعودی قوانین کے تحت انہیں مردوں کے زیر استعمال بینکوں میں داخل ہونے کی اجازت نہیں (حالانکہ قرآن نے عورتوں کو اپنی دولت کا مختار بنایا ہے)۔ چاہے ورثے میں بیٹیوں کا حصہ بیٹوں سے نصف ہے، لیکن سعودی عرب کی تیل سے دولت مند معیشت میں اس کے باوجود کافی دولت مل سکتی ہے۔ نئے بینک ہر لحاظ سے عورتوں کے لیے تھے۔ خواتین آڈیٹرز ہی اکاؤنٹس چیک کرتیں اور دروازے کے قریب گارڈز تعینات تھے تا کہ کہیں کوئی مرد اندر نہ آ جائے۔ عموماً گارڈ بینک میں ملازم کسی عورت کا شوہر ہی ہوتا، تا کہ اگر دستاویزات ڈیلیور کرنے ہوں تو وہ صرف اپنی بیوی سے بات کرے نہ کہ کسی اور غیر شادی شدہ ملازم عورت سے۔

صرف میڈیسن ایک ایسا شعبہ ہے جس میں جنسوں کی علیحدگی پوری طرح لاگو نہیں۔ اور یہ متواتر بنیاد پرستوں کے حملوں کا نشانہ بنا رہتا ہے۔ انہیں مرد مریضوں کا علاج کرنے والی لیڈی ڈاکٹرز پر اعتراض ہے۔ ان کی مہم کامیاب نہیں ہو سکی، کیونکہ حکومت نے ثابت کر دیا تھا کہ میڈیسن میں سعودی مردوں کی تعداد اتنی نہیں کہ وہ طلب پوری کر سکیں۔

وزارت صحت میں ایک ملازمت کے لیے عدیلہ نے کوالیفائی کر لیا تھا، لیکن محمد راضی نہ ہوا کیونکہ اس میں مردوں کے ساتھ لین دین کا احتمال تھا۔ محمد نے وضاحت کی، ''اسے اپنے سر کا سکارف ہر وقت ٹھیک رکھنا پڑتا، ہنسنا یا مسکرانا بھی ممنوع ہے، کیونکہ اگر وہ ہنس کر کسی مرد کی طرف دیکھ لے تو وہ سمجھے گا کہ وہ اس سے محبت کرتی ہے۔'' وہ صوفے پر بیٹھ کر ٹی وی چینل سلیکٹر گھما رہا تھا کہ ایک سعودی چینل پر تھوڑی دیر کے لیے رکا جہاں ایک خاتون اناؤنسر اپنے بالوں کو بالکل چھپائے ہوئے خبریں پڑھ رہی تھی۔ اس نے کہا، 'یہ نئی ہے۔ ٹیلی ویژن میں خواتین اناؤنسرز موجود تھیں، لیکن ان میں سے شاید ہی کوئی سعودی ہو گی۔ میں نے پوچھا کہ اگر عدیلہ بھی ٹی وی پر خبریں پڑھنا چاہے تو وہ کیا کہے گا؟'' وہ اس طرح لوگوں کے سامنے آنے پر کبھی تیار نہیں ہو گی، اور میں بھی اس کے حق میں نہیں،'' محمد نے مضبوط لہجے میں کہا۔ جلد ہی عدیلہ ایک نوکری شروع کرنے والی تھی جو اس کی اور محمد دونوں کی نظر میں موزوں تھی: لڑکیوں کے سکول میں ایک کلرک کی نوکری۔ یہ اس کی کوالیفکیشن کے مطابق نہیں تھی، ''لیکن اوقات اچھے ہیں، اور سارا دن سوتے رہنے سے یہ نوکری کر لینا بہتر ہے،'' عدیلہ نے کہا۔ ٹی وی، ویڈیوز اور عورتوں کی چائے پارٹیوں کے علاوہ نوکری کے

بغیر عدیلہ کے لیے اپنا فارغ وقت گزارنا مشکل تھا۔ سعودی عرب میں سینما یا تھیٹر نہیں ہیں، اور وہ اکیلے شاپنگ پر جانے کا خطرہ بھی مول نہیں لے سکتی تھی۔

سہ پہر کے وقت محمد نے جدہ کے ساحل پر ڈرائیو کے لیے جانے کی تجویز دی۔ عدیلہ نے قدم باہر رکھنے سے قبل اپنے بالوں کو ایک بڑے سے کالے سکارف میں لپیٹ لیا، چہرے کے گرد کالے کپڑے کا ایک چھوٹا ٹکڑا باندھا اور صرف آنکھوں کو کھلا چھوڑا، پھر ان سب کے اوپر اپنا عبایہ پہن لیا۔ ہم دونوں کار کی پچھلی سیٹ پر بچوں کے ساتھ بیٹھ گئیں۔ بحیرۂ احمر کے ساحل پر سفید عباؤں والے مردوں کی ٹولیاں عورتوں کے جھرمٹوں سے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر موجود تھیں۔ وہ سب شام کی پکنک منا رہے تھے۔

ہم نے گاڑی پارک کی اور چہل قدمی کرتے ہوئے پانی تک گئے۔ سفید راہگزر دن کی گرمی سے تپ رہی تھی۔ جب سورج سمندر میں جا چھپا تو ہمارے پیچھے شہر سے شام کی اذان سنائی دینے لگی۔ محمد جائے نماز لینے کار کی طرف گیا اور اپنے چچا کے ساتھ کھڑے ہو کر نماز پڑھنے لگا۔ عدیلہ ان کے ساتھ شامل نہ ہوئی، کیونکہ سعودی عورتیں سر عام نماز ادا نہیں کیا کرتی تھیں۔ انتظار کے دوران اس نے ایک ٹشو پکڑا، اپنا کالا نقاب اٹھایا اور چہرے سے پسینہ پونچھا۔ بہر حال عدیلہ اپنی شام کی سیر پر خوش دکھائی دیتی تھی۔ محمد اور وہ اس طرح کے چند ایک کام ہی اکٹھے کر سکتے تھے۔ چند ماہ قبل وہ بچوں کو ایک تفریحی پارک میں لے جانے کے قابل تھے، یا پھر ایک رِنک میں سکیٹنگ کے لیے بھی لیجا سکتے تھے جہاں برف کی جگہ ایک دبیز سفید پلاسٹک بچھایا گیا تھا۔ لیکن ان دونوں چیزوں پر مذہبی حکام نے اعتراض کیا اور اب مردوں اور عورتوں کے لیے الگ الگ اوقات مقرر ہونے کی وجہ سے فیملی کا ایک ساتھ جانا ممکن نہیں تھا۔

کچھ سعودی بزنس مین اپنی کمپنیوں میں عورتوں اور مردوں کی الگ الگ زندگی کے اثرات سے تنگ آ چکے تھے۔ سعودی عرب میں کلوروکس بلیچ تیار کرنے والی فیکٹریوں کے مالک حسین ابوداؤد کی خواہش تھی کہ مغربی انداز میں ایک مارکیٹ ریسرچ کروائے تاکہ سعودی گھرانوں میں کپڑے دھونے کے طریقوں کے متعلق معلوم کیا جا سکے۔ ''ظاہر ہے کہ میں مرد ریسرچرز کو عورتوں سے بات چیت کرنے نہیں بھیج سکتا تھا۔ لیکن سعودی عورتوں کو بھی بھیجنا ممکن نہیں تھا، کیونکہ ان کا مردوں

سے بھرے کسی گھر میں جا گھسنا ممکن تھا۔ اور مجھے یہاں عربی بولنے والی اتنی عورتیں کیسے مل سکتی ہیں جو سعودی نہ ہوں؟'' آخر کار اس نے چند مصری اور لبنانی عورتوں کو یہ کام سونپا جنہیں خوفناک حالات کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ ملک میں اجنبی لوگ دروازے پر نہیں آتے۔ ''بیش تر جگہوں پر ایک گارڈ تعینات ہے جسے سختی سے ہدایات دی گئی ہیں کہ اپائنٹمنٹ کے بغیر کسی کو اندر نہ آنے دیں،'' اس نے کہا۔

حسین نے سارے نظام کو تضادات سے لبریز پایا۔ ''اگر کوئی سعودی عورت برا اور پینٹیز خریدنا چاہتی ہو تو اسے دکان کے کاؤنٹر پر کھڑے ہندوستانی لڑکوں سے بحث کرنا پڑتی ہے۔ تاہم، اگر وہ ایک کاروباری خاتون ہے اور سرکاری وزارت کے کسی دفتر میں کوئی دستاویز جمع کروانا چاہتی ہے تو وہاں قدم بھی نہیں رکھ سکتی -- اسے کسی مرد کی خدمات لینا پڑیں گی۔'' حسین کاروباری افراد کے اس گروپ میں شامل رہ چکا تھا جسے وزارت ترقیات کے معاشی منصوبے کے مسودے پر رائے دینے کو کہا گیا۔ اس نے مسودے میں موجود ایک ائٹم پر نکتہ اٹھایا جس میں کہا گیا تھا کہ حکومت اسلامی اصولوں کے مطابق عورتوں کے کام کو فروغ دے گی۔ ''میں نے کھڑے ہو کر کہا، '36 صفحات کے اس منصوبے میں عورتوں کے متعلق یہ صرف آدھی سطر ہے، اور وہ بھی اسلامی اصولوں کی شرط کے ساتھ۔ باقی کے 36 صفحات کے بارے میں کیا خیال ہے؟ آپ کا مطلب ہے کہ وہ اسلامی اصولوں کے مطابق نہیں؟ کیا آپ محض انتہا پسندوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کر رہے ہیں؟''

انتہا پسندوں کو مطمئن کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ عورتوں کے لیے کام کرنے کی بالکل الگ جگہیں بھی خطرے سے خالی نہیں تھیں۔ ملک کے سب سے بڑے صنعتی ادارے سعودی کیبلز کمپنی نے ایک ایسی فیکٹری لگانے کی تجویز دی جہاں پروڈکشن کا سارا عمل عورتیں ہی انجام دیں گی اور انتظام بھی عورتیں چلائیں گی۔ میں نے سوچا کہ مزدوروں کی شدید قلت کے شکار ملک میں اس قسم کے منصوبے کو بہت سراہا گیا ہو گا۔ لیکن جب میں منصوبے کے انچارج افسر سے ملنے گئی تو اس نے درخواست کی کہ میں اس بارے میں کچھ نہ لکھوں۔ ''ہم پہلے ہی بہت زیادہ توجہ کا ہدف بنے ہوئے ہیں،'' اس نے کہا۔ اسے خدشہ تھا کہ اگر بنیاد پرستوں نے عورتوں کو گھروں سے باہر آنے کی ترغیب دلانے کے خلاف مہم شروع کر دی تو منصوبہ منسوخ ہو جائے گا۔ تاہم، اس نے مجھے اپنی بیوی باسلہ سے ملوایا جو لڑکیوں کا عالیشان دار الفکر سکول چلاتی تھی۔

باسلہ نے مجھے سکول دکھانے کے بعد دوپہر کی چائے پر گھر بلایا۔ اس کے زرد پتھر سے بنے بنگلے میں فلڈ لائٹ والے سوئمنگ پول، فارسی قالین اور خوب صورت سامان نے واضح کر دیا کہ وہ کسی ''مالی ضرورت'' کے تحت ملازمت نہیں کر رہی تھی، جیسا کہ سعودی گزیٹیر کے مذہبی ایڈیٹر نے منظوری دی تھی۔ باسلہ نے بتایا، ''میں شادی کے بعد ابتدائی برسوں میں کام نہیں کرتی تھی۔ میں زیادہ تر وقت بستر پر گزارتی، اور جب فواز سارے دن کا تھکا ہارا گھر واپس آتا تو میں اسے شاپنگ مال تک چلنے کو کہتی۔ کچھ عرصہ بعد ہم دونوں نے فیصلہ کیا کہ یہ صورت حال بہت خراب ہے، اور مجھے اپنی زندگی کو کسی مقصد میں لگانا چاہیے۔''

باسلہ نے اپنی ایک سہیلی کو بھی چائے پر بلایا تھا جو اپنی ماں کو ایک کامیاب تعمیراتی کمپنی چلانے میں مدد دیتی تھی۔ باپ کے فوت ہونے پر ان کا خیال تھا کہ مرد رشتہ دار کاروبار سنبھالیں گے اور انہیں گھریلو اخراجات کی فکر نہیں کرنا پڑے گی۔ لیکن وہ کاہل اور نا اہل ثابت ہوئے۔ باپ کی بنائی ہوئی ساری جائیداد اور کاروبار تباہی کے دہانے پر آن کھڑا ہوا۔ اس نے وضاحت کی: ''آخر کار میری ماں نے کاروبار اپنے ہاتھ میں لیا۔ وہ سرکاری منظوری کے لیے کاغذات ساتھ لے کر وزارت تعمیرات میں گئی۔ اس سے قبل وہاں کبھی کوئی عورت نہیں گئی تھی۔ حکام نے اسے باہر نکل جانے کا حکم دیا، مگر وہ ڈٹی رہی۔ وہ وہیں بیٹھی رہی، بیٹھی رہی، اور حتیٰ کہ افسر اس کی بات سننے پر مجبور ہو گئے۔ ماں بہت اچھی مینیجر ثابت ہوئی اور اس نے کاروبار کو تباہی سے بچا لیا۔''

نوکرانیاں چائے اور کیک و پیسٹریاں لے کر اندر باہر آ جا رہی تھیں۔ آخر بات اس بارے میں ہونے لگی کہ میرا شوہر نوکری کے سلسلے میں میرے سفر کرنے پر کیسا محسوس کرتا تھا۔ میں نے باسلہ کو بتایا کہ ہم دونوں میں سے کسی نے بھی کبھی دور نہیں رہنا چاہا، لیکن شوہر خود بھی صحافی ہونے کے ناتے میری ملازمت کے تقاضوں سے بخوبی آگاہ تھا۔ پھر میں نے کچھ شیخی بگھارتے ہوئے اسے بتایا کہ شوہر نے میری ملازمت کی خاطر اپنے کیریئر میں کچھ ترامیم پیدا کر لی تھیں۔ ''جب میرے اخبار نے مجھے مشرق وسطیٰ میں عہدے کی پیش کش کی تو اس نے اپنی نوکری چھوڑ دی تاکہ میں یہ نوکری قبول کر سکوں۔'' مجھے توقع تھی کہ باسلہ حیران ہو گی: ٹونی اور میں مشرق وسطیٰ میں اس آٹومیٹک مفروضے کے عادی تھے کہ دراصل اس کی نوکری کی وجہ سے ہمیں یہاں آنا پڑا ہے۔ لیکن باسلہ کے چہرے کے تاثرات میں حیرت والی ہرگز کوئی بات نہ تھی۔ وہ بالکل مایوس لگی، کہ جیسے میں

نے ابھی ابھی اعتراف کیا ہو کہ میرے شوہر نے وسیع پیمانے پر قتل غارت کی تھی۔ باسلہ نے چائے ختم کی، گلا صاف کیا اور موضوع بدل دیا۔

لڑکیوں کی تعلیم، خواتین کے بینکوں اور میڈیسن کے نسبتاً محفوظ حلقوں سے باہر ملازمتیں کرنے والی عورتوں سے متعلق معلومات حاصل کرنا بہت مشکل تھا۔ جب میں نے وزارت اطلاعات سے مدد مانگی تو کورا جواب ملا۔ چنانچہ میں نے مختلف دیگر رابطے استعمال کیے۔ جدہ میں ایک لبنانی بزنس مین نے تنبیہ کی: ''اس موضوع کو تبھی ہاتھ لگانا جب تم سو فی صد مثبت چیز ہی لکھنا چاہتی ہو۔'' جب میں نے ایسا قرین قیاس نہ ہونے کا ذکر کیا تو اُس نے مجھے کسی سے بھی متعارف کروانے سے انکار کر دیا۔ میں نے جدہ اور ریاض میں ایسی خواتین کے متعلق سن رکھا تھا جو فوٹوگرافی سٹوڈیو، اور ملبوسات سازی سے لے کر کمپیوٹر ٹریننگ سکولز جیسے کاروباروں کی مالک تھیں۔ میں نے سوچا کہ شاید چیمبر آف کامرس کوئی مدد کر سکے۔ ایک مددگار افسر نے کہا: ''نو پرابلم، میں آپ کو کچھ اپائنٹمنٹس لے دیتا ہوں۔''

اگلے روز اس نے مجھے دوپہر دو بجے جدہ ایئر پورٹ پر انتظامی دفاتر میں پہنچنے کو کہا۔ میرا خیال تھا کہ اُس نے کسی خاتون ایگزیکٹو کو مجھ سے ملوانے کا بندوبست کیا ہو گا۔ لیکن پتا چلا کہ محض مجھے ایک بیکار ''آفیشل ٹور'' کروانے کا ہی سوچ گیا تھا جس کا عورتوں سے کوئی تعلق واسطہ نہیں تھا۔ میں گھنٹوں وہاں رہی: مجھے ویڈیوز دکھائے گئے، کمپیوٹر رومز میں لیجایا گیا اور سرکاری اعداد و شمار بتائے گئے 1975ء اور 1988ء کے درمیانی برسوں میں مسافروں کی ٹریفک میں 625% اضافہ، کارگو ٹریفک میں 870% اضافہ، صرف زائرین حج کے لیے بنایا گیا ایک ٹرمینل جو 80 فٹ بال فیلڈز کے برابر تھا اور جس کی چھت پر ٹفلان کی کوٹنگ والی ٹائلز لگائی گئی تھیں (تاکہ حرارت سے بچا جا سکے)۔ دورے کو مختصر کرنے کا کوئی خوشگوار طریقہ نہیں تھا۔ ترقی پذیر ممالک ہمیشہ شکایت کرتے ہیں کہ رپورٹر ان کی کامیابیوں کے متعلق نہیں لکھتے؛ کہ ہم رنگارنگ قبائلی روایات پر ہی توجہ دیتے اور ٹیکنالوجیکل ترقی کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ پھر بھی میں اپنا وقت ضائع ہونے کی وجہ سے چیمبر آف کامرس پر خفا تھی۔

دورے کے دوران چمکتے ہوئے جدید ایئر پورٹ کا ایک حصہ میری توجہ اور دلچسپی حاصل

کرنے میں کامیاب رہا۔ یہ چیز سعودی عرب میں عورتوں کی حیثیت پر میری کہانی سے تعلق رکھتی تھی، لیکن یہ ہمارے دورے کا حصہ نہ تھی۔ ملک چھوڑنے سے صرف دو ہفتے قبل مجھے یہ بات محسوس ہوئی۔ ڈیپارچر لاؤنج میں انتظار کرنے کے دوران مجھے ٹوائلٹ کی حاجت پیش آئی۔ میں پالش کیے ہوئے فرش پر چلتی ہوئی ٹوائلٹ میں گئی اور چمکتا ہوا دروازہ کھولا جس پر برقعے والے سر کی ڈرائنگ بنی ہوئی تھی۔

اندر پہنچ کر میرا کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ فرش گند سے لتھڑا ہوا تھا۔ بند ٹوائلٹ باؤلز منہ تک غلاظت سے پر تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی نے کئی ہفتوں سے وہاں صفائی نہیں کی۔ کسی نے نوٹس ہی نہیں لیا تھا، کیونکہ بااختیار لوگ کبھی اندر گئے ہی نہیں تھے۔

سعودی عرب ایک انتہا ہے۔ آخر اس انتہا پر ہی کیوں ٹکے رہیں جبکہ ترکی جیسے کسی مسلم ملک کے متعلق لکھنا آسان ہوگا جہاں ہر چھ میں سے پانچ جج عورتیں ہیں اور ہر تین نجی کمپنیوں میں سے ایک کی مینیجر عورت ہے؟

میرے خیال میں سعودی عرب کی خوفناک حقیقت پر نظر ڈالنا اہم ہے، کیونکہ یہی وہ بانجھ، علیحدگی یافتہ دنیا ہے جس کا مطالبہ اسرائیل میں حماس، افغانستان میں بیشتر مجاہدین گروپ، مصر میں بہت سے انقلابی اور الجیریا میں اسلامی سالویشن فرنٹ کرتے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی گروپ یہ نہیں کہتا ہے "آیئے ترکی کو نئے سرے سے تعمیر کریں، اور کلیسیا وریاست کو الگ الگ کریں۔" اس کی بجائے وہ تو صرف سعودی انداز کے خواہش مند ہیں عورتوں کی مکمل قطع وبرید، گھر کی جنت میں عورت کا اصل مقصد ہونے کے کلیشے پر اصرار۔

مسلم ممالک کی وسیع اکثریت میں گزشتہ پچاس سال کے دوران عورتوں کی ملازمت کی راہ میں حائل رکاوٹیں ابھی تک دور ہوتی آئی ہیں۔ بادی النظر میں ان رکاوٹوں کو دوبارہ کھڑا کرنا ناممکن ہوگا۔ لیکن زیر سطح عورتوں کے کام کے متعلق پائی جانے والی ایک بے یقینی انہیں زد پذیر بناتی ہے۔

مصر میں عورتیں ہر جگہ پر کام کرتی ہوئی نظر آتی ہیں کھیتوں میں بوائی اور کٹائی کرتی ہوئیں، شہر کی گلیوں کے کنارے بیٹھ کر اشیا فروخت کرتی ہوئیں۔ لیکن بیسویں صدی کے نصف اول میں ان کی اس حیثیت کے متعلق تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ تب صرف غریب ترین خاندانوں کی

عورتیں ہی گھر سے باہر کام کرنے کی 'بے عزتی' سہتی تھیں۔ مصری عورتیں ڈاکٹر، فلم ساز، سیاست دان، ماہرین معاشیات، پروفیسر اور انجینئرز ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر بیوروکریٹس ہیں۔ اب یہ سوچنا تقریباً محال ہے کہ کوئی جوان مصری خاتون کام پر نہیں جاتی ہوگی، کم از کم شادی ہو جانے سے پہلے۔ اکثر اسے اپنے دفتر میں ہی مستقبل کا دلہا مل جاتا ہے۔

صدر ناصر نے حکومت میں عورتوں کے لیے جگہ بنائی اور وعدہ کیا کہ کالج ڈگری کے حامل ہر مصری کو ملازمت دی جائے گی۔ اب زیریں متوسط طبقے بہت سی پڑھی لکھی عورتیں muwazzat کے طور پر سرکاری نوکری حاصل کرتی، صبح آٹھ بجے سے دوپہر دو بجے تک ٹائپنگ اور کاغذات ادھر اُدھر کرتی رہتی ہیں۔ بیوروکریسی کے حجم کا مطلب ہے کہ بیشتر کارکن بے روزگار ہیں، اور بیشتر مرد اور عورتیں سارا دن مسلسل چائے پینے اور گپ بازی میں گزارتے ہیں۔ تنخواہ قابل رحم تقریباً 40S ماہانہ ہونے کے باوجود عورت کو خرچ کرنے پر کچھ نہ کچھ اختیار تو مل جاتا ہے اور وہ گھر کے بجٹ میں کچھ حصہ ڈال کر پروقار بھی بن سکتی ہے۔

مجھے معلوم جوان، غیر شادی شدہ عورتوں میں سے زیادہ تر تنخواہ دار تھیں اور کسی غیر موزوں جگہ پر کام کرنے کی آزادی بھی رکھتی تھیں۔ لیکن میری شادی شدہ دوستوں کا انداز نظر کچھ مختلف تھا۔ اکثر کی ملازمت کمرتوڑ گھریلو محنت سے مختصر پناہ لینے کا ایک ذریعہ تھی۔

مَیں نے ایک دوپہر حال ہی میں شادی کرنے والی اسی قسم کی ایک عورت کے ساتھ گزاری۔ وہ دفتر آنے جانے کے لیے روزانہ ڈیڑھ گھنٹہ بس کا سفر کرتی تھی جو اس قدر بھری ہوتی کہ تین چار مسافر گیٹ سے باہر لٹکے ہوتے۔ وہ اپنے گھر سے کوئی نصف میل دور واقع بس سٹاپ پر اترتی اور بیس منٹ تک سرکاری فوڈ سٹور پر قطار میں کھڑی رہتی تاکہ کم نرخوں پر کھانا حاصل کر سکے۔ وہ اشیائے خورد ونوش اٹھا کر فریج سے عاری کچن میں لاتی اور فوراً اپنے شوہر کے لیے چائے بناتی جو کام سے واپس آکر صوفے پر بیٹھا اپنے باپ اور نوجوان بھتیجے سے گفتگو کر رہا ہوتا۔ اس کے بعد وہ سیڑھیاں چڑھ کر کبوتروں کے پنجرے میں جاتی، پچھلے روز کی بچی ہوئی روٹی ڈالتی اور دو سب سے موٹے کبوتر پکڑ کر وہیں ان کی گردنیں مروڑ دیتی۔

وہ کبوتروں کی کھال اتار کر انہیں پکاتی، دلیہ اور نوڈلز ابالتی اور مردوں کو کھانا پیش کرتی جو تاخیر کی وجہ سے کچھ جھنجلائے ہوئے لگتے۔ اس کے بعد وہ مزید چائے پیش کرتی، برتن اور پلیٹیں دھوتی،

فرش اور فرنیچر سے گرد صاف کرتی، سب کے کپڑے ہاتھ سے دھوتی اور اگلی صبح کام پر جانے سے قبل چھت پہ ڈالنے کی خاطر بالٹی میں رکھ چھوڑتی۔ پھر وہ اگلے روز پکانے کے لیے چنے یا دال وغیرہ بھگوتی، بیٹھ کر کچھ سیتی پروتی اور رات نو بجے ایک مرتبہ پھر چائے بنا کر پیش کرتی۔ اس عورت کی زندگی میں صرف دو باتیں غیر معمولی تھیں: اول، گھر میں دیگر عورتوں یعنی ساس یا نند کا نہ ہونا جو گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹاتیں؛ اور ابھی تک بچے پیدا نہ ہونا جو ذمہ داریوں میں مزید اضافہ کر دیتے۔

اب عورتیں اپنے کنبوں کا معاشی بوجھ مل کر اٹھاتی ہیں، لیکن چند ایک مصری مرد ہی گھر کے کام میں ہاتھ بٹانے پر تیار ہیں۔ وہ کام سے سیدھی دوڑتی ہوئی گھر آتی ہیں تاکہ اہل خانہ کے لیے کھانا پکا سکیں۔ لہٰذا عورت کا رتبہ گھر میں ہونے کے متعلق بنیاد پرستوں کا پیغام کبھی کبھی باعث ترغیب ثابت ہوتا ہے۔

شوہر بھی یہ پیغام سنتے ہیں۔ زیادہ تر کی پرورش ایسی عورتوں کے پاس ہوئی جو گھر سے باہر کام نہیں کرتی تھیں۔ وہ ایسے گھروں کے عادی ہیں جہاں ان کی قمیصیں استری ہوتیں، فرش پر جھاڑو دیا جاتا، کھانا بنا سنوار کا پکایا اور ہمیشہ تیار رکھا جاتا ہے۔ اب ہو سکتا ہے کہ کسی نوجوان کو اپنے دفتر میں ہی کام کرنے والی کوئی لڑکی بیوی بنانے کے لیے پسند آ جائے۔ شادی سے پہلے وہ کبھی کبھی اس کے حسن کی تعریف اور لطیفہ بازی یا گپ شپ کے لیے بھی وقت نکال سکتا ہے۔ لیکن جب وہ بیوی بن جائے تو اُسے یہ سوچ کر تکلیف ہوتی ہے کہ دفتر میں دوسرے لوگ بھی اس کی بیوی کی صحبت کا حظ اٹھاتے ہیں۔ اگر وہ پہلے سے پردہ نہ کرتی ہو تو شوہر اسے حجاب پہننے پر مجبور بھی کر سکتا ہے۔

جب کسی ملازم پیشہ بیوی کے ساتھ خانگی زندگی کسی گھریلو بیوی کی نسبت کم خوشگوار ہو جائے تو شوہر گھر کے کام کاج میں اس کا ہاتھ بٹانے کا نہیں سوچتا کیونکہ اس نے کبھی کسی مرد کو ایسا کرتے دیکھا ہی نہیں ہوتا۔ اس کی بجائے وہ معیشت کی بدحالی پر حکومت کو کوستا ہے جس نے اس کی بیوی کی کمائی کو ضروری بنا دیا۔ اور جب وہ کسی امام یا شیخ کو عورت کی حیثیت کے متعلق وعظ دیتے ہوئے سنتا ہے تو ایک ممکنہ اسلامی حکومت کے تحت بہتر حالات کا خیال اسے ستانے لگتا ہے۔

اس کے اگلا قدم اٹھانے اور انقلابیوں کے ساتھ مل جانے پر بننے والی صورت حال معلوم

کرنے کے لیے ہمیں ایران پر نظر ڈالنا ہوگی۔

کسی انقلاب کے کامیاب ہو جانے پر بھی انتہا پسندوں کا سوچا ہوا ہر مقصد پورا نہیں ہوتا۔ صدیوں سے چلی آ رہی روایات کو قائم رکھنا ایک چیز ہے (جیسا کہ سعودی عرب نے کیا) اور تبدیلی کے باعث ثقافت کی نئی صورت سامنے آ چکنے کے بعد ان روایات کو بالکل نئے سرے سے نافذ کرنا بالکل دوسری بات ہے۔

1920ء کے عشرے سے ہی ایران کے پہلوی حکمران اپنے ملک کو مغربی سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کبھی کبھی تو انہوں نے جبراً بھی ایسا کیا اور مردوں وعورتوں کی الگ الگ زندگیوں کی ہزاروں سال پرانی روایت کو مسمار کر دیا۔ 1979ء میں جب ایرانی انقلابیوں نے شاہ کا تختہ الٹا تو مردی عورتوں کے بال کاٹتے، عورتوں کے ملبوسات بناتے اور لڑکیوں کے سکولوں میں پڑھاتے تھے۔

انتہا پسندوں نے یہ سب کچھ ختم کر دیا اور مرد گائنا کالوجسٹ افراد سے کہا کہ وہ طب کا کوئی اور شعبہ تلاش کریں۔ انہوں نے پردے لٹکا کر یونیورسٹی کے لیکچر ہالز کو زنانہ اور مردانہ حصوں میں تقسیم کرنے کی کوشش کی، اور مرد نائیوں کے لیے عورتوں کے سر کو ہاتھ لگانا ممنوع قرار پایا۔

نائیوں کے سوا دیگر معاملات میں بہت کم کامیابی ہوئی۔ انتہا پسندوں نے یہ تسلیم نہیں کیا تھا کہ جنسوں کی علیحدگی کے معاملے میں خمینی پوری طرح ان کا ہم خیال نہیں تھا۔ خمینی قرآن وحدیث کے الفاظ پڑھتا اور ان کا مفہوم مسخ نہیں کرتا تھا۔ جب اس نے پڑھا کہ رسولؐ اللہ کی ازواج مطہرات اپنے گھروں میں رہیں، تو یہی مفہوم لیا کہ یہ حکم صرف ازواج نبیؐ کے لیے ہے۔ دیگر مسلمان عورتیں گھروں سے باہر اپنے کام کرتی تھیں، اور خمینی نے ان کی حوصلہ افزائی بھی کی۔ وہ ابتداً سے ہی عورتوں کو گلیوں میں آ کر مظاہرے کرنے اور مردوں کے شانہ بہ شانہ انقلابی کردار ادا کرنے پر ابھارتا رہا۔

خمینی کی نظر میں اصول بہت واضح تھے: نامحرم مردوں اور عورتوں کو اکیلے میں اکٹھا نہیں ہونا چاہیے: انہیں ایک دوسرے کو چھونا نہیں چاہیے، ماسوائے طبی ضرورت کے؛ اور عورتوں کو لازما حجاب کرنا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ مرد ہیئر ڈریسرز اپنی کلائنٹس کو چھوتے اور حجاب کے بغیر دیکھتے تھے، اس لیے سیلونز میں سے مرد سٹاف ختم کر دیا گیا۔ یہی اصول جم انسٹرکٹرز پر لاگو ہوا جن کی طالبات

اتھلیٹک لباس میں ورزش کرتی تھیں۔ نیز عورتوں کی سرگرمیوں (جہاں وہ حجاب پہنے ہوئے نہیں ہوتی تھیں) کی رپورٹنگ کرنے والے صحافی مرد بھی پابندی کی زد میں آئے۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اس قسم کی سرگرمیاں بند کر دی جائیں۔ اس کی بجائے ہوا یہ کہ عورتوں کے لیے ملازمت کے بہت سے مواقع پیدا ہوئے۔ مردوں اور عورتوں پر اکیلے میں اکٹھے ہونے کی پابندی سے عورتیں ڈرائیونگ انسٹرکٹرز بنیں۔ میڈیا میں عورتوں کی مخصوص کھیلوں کی رپورٹنگ کے لیے عورتوں کی ضرورت پڑی۔ عورتیں پروڈیوسرز، ڈائریکٹرز، رپورٹرز اور ساؤنڈ ریکارڈسٹ بننے لگیں۔

چونکہ حدیث سے واضح تھا کہ پیغمبر اسلامؐ نے عورتوں کو جنگی سپاہیوں کی مرہم پٹی کرنے کی اجازت دی، اس لیے طب میں یہ امتیاز روا نہ رکھا گیا۔ لیکن نئی اسلامی فضا نے عورتوں کا صرف لیڈی ڈاکٹرز کے پاس جانا قابل ترجیح بنا دیا تھا، چنانچہ میڈیکل سکول میں عورتوں کی نشستوں کا مطالبہ بڑھتا گیا۔ دایا نرسوں کا رتبہ بڑھ گیا۔ نوجوان طالبات کو کسی بھی اثرات سے بچنے کی خاطر سکولوں کو فوراً الگ الگ کر دیا گیا، لیکن زیادہ تر جگہوں پر کلاس رومز سے باہر انہیں الگ رکھنے پر توجہ نہ دی گئی۔ چونکہ یونیورسٹیاں مکمل طور پر اسلامی بنا تھیں، اور داخلے کے لیے مقامی مسجد کے امام کے ریفرنس کی ضرورت تھی، اس لیے ان پاکباز نوجوانوں کو جسمانی طور پر الگ رکھنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ وہ خود بخود ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ لیکچرز میں لڑکے کمرے کی ایک طرف اور لڑکیاں دوسری طرف بیٹھتیں۔ بس پروفیسر کے پوڈیم کی جگہ کا تعین کرنے میں مسائل پیدا ہوئے۔ کچھ لیکچر رومز میں اسے لڑکوں والے حصے میں رکھا گیا کیونکہ بہر حال پروفیسر مرد ہی تھے۔ اس طرح خواتین پروفیسرز کو بھی کم از کم اپنے نوٹس رکھنے کی خاطر لڑکوں والے حصے میں آنا پڑتا۔

جنوبی ایران کے شہر اہواز میں میری ملاقات ایک نوجوان طالبہ سے ہوئی جسے بعد از انقلاب تبدیلیوں سے کافی فائدہ ہوا تھا۔ وہ میڈیسن کا مطالعہ کرتی اور اپنے نہایت مذہبی دیہی خاندان سے بہت دور ہوسٹل میں رہتی تھی۔ اس نے بتایا کہ شاہ کے دور میں والدین اسے کبھی بھی یونیورسٹی جانے یا گھر سے دور رہنے یا ہسپتال میں کام کرنے کی اجازت نہ دیتے۔ لیکن اب وہ یونیورسٹیوں اور ہسپتالوں کو اسلامی نظام کا ایک حصہ خیال کرتے تھے، لہٰذا ان کی دانست میں یہ جگہیں بیٹی کے لیے

محفوظ تھیں۔ گھر سے دور زندگی گزارتے ہوئے اسے لڑکوں سے ملنے جلنے کی آزادی تھی، چاہے نہایت منضبط حالات میں ہی سہی۔ اور حال ہی میں اسے اپنی پسند کا دلہا بھی مل گیا تھا۔ والدین نے حیرت انگیز طور پر اس کی پسند کو قبول کر لیا۔ یوں وہ خاندان کی تاریخ میں پسند کی شادی کرنے والی پہلی لڑکی بن گئی۔

ایران کی مذہبی حکومت میں عورتیں ڈپٹی منسٹرز کے عہدوں تک پہنچی ہیں، رفسنجانی ہر انتخابات میں ووٹروں کو مزید عورتیں پارلیمنٹ میں منتخب کرنے کا کہتا رہا۔ بزنس میں میری ملاقات ایک ایسی عورت سے ہوئی جو ایک والو فیکٹری چلاتی تھی؛ ایک اور عورت ٹرکوں کی کمپنی کی منتظم تھی۔ اول الذکر خاتون نامی رواندوست نے کہا کہ اسے ایران کے اندر اپنا کاروبار چلانے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔ ''میرے تمام مسائل بیرون ملک پیدا ہوتے ہیں۔'' پرزے خریدنے کی خاطر سفر کرنا تجارتی پابندیوں اور ویزے کے مسائل کی وجہ سے اکثر بہت پیچیدہ ہو جاتا۔ موخر الذکر خاتون کا کہنا تھا کہ کامیابی محض عقل سلیم اور تدبیر کا معاملہ تھا، جیسے کہ ہر کاروبار میں ہوتا ہے۔ ''ظاہر ہے کہ میں یہ پہن کر وزارت ٹرانسپورٹ میں نہیں جا سکتی،'' اس نے اپنے پھولدار ریشمی لباس کی جانب اشارہ کر کے کہا۔

بعد از انقلاب معاشرے میں عورتوں کا مقام اب اس قدر جامد ہو چکا ہے کہ کچھ ایک اب کھل کر اس پر تنقید کرنے لگی ہیں۔ طنزیہ میگزین ''گل آگہ'' میں کچھ عورتوں کے بنائے ہوئے کارٹون سب سے زیادہ کٹیلے ہیں۔ اس سے بھی قابل ذکر بات یہ ہے کہ ایران کی خارجہ پالیسی کے ایک نمائندہ جریدے ''Iranian Journal for International Affairs'' (1991ء) میں بشریات کی ایک اسسٹنٹ پروفیسر فاطمہ Givechian نے اپنے مضمون میں جنسی علیحدگی پالیسی کی باقیات کو تنقید کا نشانہ بنایا۔

اس نے لکھا، ''بلا شبہ اس پالیسی نے اپنی جنس کے متعلق آگہی کو بڑھایا، لیکن ضروری نہیں کہ اس طرح جنس مخالف کے بارے میں معلومات میں بھی اضافہ ہو۔ اس حد تک جنسی علیحدگی غیر فطری ہے...... اس طرح مرد اور عورت کا دہرا معاشرہ جنم لے گا جس میں دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی اور ایک دوسرے کے مسائل سے نابلد ہوں گے۔

☙❧

نواں باب

سیاست: ووٹ کا ہونا اور نہ ہونا

خلیج کی جنگ کے ایک سال بعد عراقی کردستان کے پہاڑوں اور وادیوں میں عورتوں کی قطاریں ہمیشہ سے لگی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ موسم بہار کی دھوپ چاندی اور سونے کے جھلملاتے لب سوں کو چمکا رہی تھی۔ انہوں نے اپنے بہترین لباس پہن رکھے تھے، کیونکہ یہ جشن کا دن تھا۔ کردستان کی عورتیں اپنی زندگیوں میں پہلی مرتبہ ووٹ ڈالنے کے لیے قطار بنائے کھڑی تھیں۔

ایک سال پہلے جنگ کے بعد ہونے والی کرد بغاوت کے دوران میں نے اسی طرح کی جھلملاہٹ دیکھی تھی جب ایک عراقی جیل کے فرش پر شوخ رنگوں کے بہوست پھاڑ کر ایک گرد آلود ڈھیر کی صورت میں رکھے گئے تھے۔

کرد عورتوں کو برہنہ کر کے یہاں لایا اور زنا کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ کچھ عورتوں کی نظر میں یہ زنا حکومتی مظالم کا ایک جزو تھا۔ دیگر عورتوں کے ساتھ اس سلوک کا مقصد ان کے جیل میں قید باپوں، بھائیوں یا شوہروں کو اذیت دینا تھا۔ حکومت چاہتی تھی کہ ان آدمیوں کی عزت نفس برباد کرنے کے ذریعے انہیں جذبہ جنگ سے محروم کر دیا جائے۔ یہ طریقہ اس قدر روٹین تھا کہ جیل کے بیوروکریٹس نے عزیز صالح احمد کے نام کا ایک انڈیکس کارڈ بنا رکھا تھا۔ اس میں اس کا پیشہ ''عوامی فوج میں لڑاکا'' اور سرگرمی میں ''عورتوں کی عزت لوٹنا'' درج تھا۔ بہ الفاظ دیگر عزیز صالح احمد کو جیل میں زنا کرنے کے لیے ملازم رکھا گیا تھا۔ صدام حسین نے کردوں کے خلاف اپنی مہم کو

''انفال'' کا نام دیا (قرآن کی ایک سورۃ کی نسبت سے جس میں جہاد کے متعلق بات کی گئی ہے)۔ مذہب کے اس سے زیادہ مسخ شدہ استعمال کا تصور کرنا مشکل ہے۔

کردستان کی عورتوں نے زیادہ تر زندگیوں میں سیاست کا مطلب یہی دیکھا ہے: ایک خطرناک اور ممکنہ طور پر مہلک سرگرمی جو عیلظ گدوں، یا بے ہوا اور فضلے سے بھری زیرزمین کوٹھڑیوں پر منتج ہوتی۔ میرے خیال میں صرف ایک سال کے اندر اندر اس مطلب کا تبدیل ہو کر مسکراتے چہروں والی عورتوں کی قطاروں کی شکل اختیار کر لینا معجزے سے کم نہیں تھا۔ بیلٹ پیپر پر عورتوں کے نام موجود ہونا اور بھی زیادہ حیرت انگیز تھا۔

بیش تر مسلم ممالک میں سیاسی اقتدار کی جانب جاتی ہوئی شاہراہ عورتوں کے لیے مشکلات سے پُر ہے۔ کویت جیسے ممالک میں عورتوں کو تا دمِ تحریر ووٹ کا حق تک نہیں ملا، ان کا حکومت کرنا تو بہت دور کی بات ہے۔ اور جن جگہوں پر عورتوں کے لیے نظام میں جگہ موجود ہے وہاں بھی اپنی جگہ بنانے کا مطلب بدسلوکی اور جسمانی تشدد کی دھمکیوں کا ہدف بننا ہے۔ اردن کے 1993ء کے انتخابات میں ایک خاتون امیدوار کو ریلی سے خطاب کرنے کا حق مانگنے کی خاطر بھی جدوجہد کرنا پڑی، کیونکہ مسلمان انتہا پسندوں کو مخلوط مجمعے میں نسوانی آواز سننے پر اعتراض تھا۔

1994ء میں عورتیں تین مسلم ممالک کی قیادت کر رہی تھیں۔ تاہم، ان کی اعلیٰ ترین حیثیت نے پست ترین حالات سے دوچار عورتوں کی زندگیوں پر بہت کم اثر ڈالا۔ جب تانسو چیلر ترکی کی معیشت کو نئے سرے سے تعمیر کرنے پر توجہ دے رہی تھی تو دیہی علاقوں میں مردوں کے ساتھ میل ملاقات کرتے ہوئے پکڑی جانے والی عورتوں کو مقامی پولیس سٹیشنوں میں زبردستی ''تجزیۂ بکارت'' کے مرحلے سے گزارا جا رہا تھا۔ جب بنگلہ دیش کی بیگم خالدہ ضیا نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی (1993ء) سے خطاب کرنے والی پہلی مسلمان سربراہ خاتون بننے کا اعزاز حاصل کیا تو بنیاد پرست اسلام کے کچھ پہلوؤں پر تنقید کرنے والی ایک مصنفہ کو موت کی دھمکیاں دے رہے تھے۔ پاکستان کی بے نظیر بھٹو نے اپنے پہلے دورِ حکومت میں زنا کے قوانین کو جوں کا توں رہنے دیا جن کے تحت نشانہ بننے والی عورت ''بدکار'' قرار پاتی اور زناکار مرد آزاد ہو جاتا۔ 1993ء میں دوبارہ اقتدار حاصل کرنے پر لگتا تھا کہ وہ کوئی بہتر کام کر سکتی ہے۔ اس نے خواتین کے پولیس سٹیشن

بنانے اور خواتین جج تعینات کرنے کا وعدہ کیا تھا۔

مسلم ممالک میں رہنما خواتین کے لیے کچھ مشکل کی وجہ یہ ہے کہ ان کی اپنی حیثیت اکثر بہت نازک ہوتی ہے۔ ترکی میں ایک کانفرنس کے موقع پر (اگست 1993ء) چیلر کی صنف کے خلاف خفگی کی علامات ظاہر ہوئیں جب مندوبین نے نعرے لگا کر اسے واپس باورچی خانے میں جانے کو کہا۔

مسلمان سیاست دان خواتین ایک خاص نسل ہیں۔ مئی 1992ء میں کردستان میں انتخابات کے روز ایک خاتون امیدوار ہیرو احمد نے زرق برق لباس نہیں پہنا تھا۔ وہ بالکل ویسے کھلے پائجامے اور قمیض میں ملبوس تھی جو 1979ء سے پہنتی آ رہی تھی، جب وہ کرد گوریلے پیش مرگ کے پاس پہاڑوں میں لڑنے گئی۔ پہاڑوں میں بارہ سال گزارنے کے دوران ماہر نفسیات ہیرو نے اسالٹ رائفل اور ایک اینٹی ایئر کرافٹ گن استعمال کرنا سیکھی۔ لیکن وہ زیادہ تر وقت فلم ہی بناتی رہتی۔ اس کا مشہور ترین ویڈیو کلپ 1988ء میں یاک سامر کے گاؤں سے بلند ہوتا ہوا گیس کا بادل دکھاتا ہے عراقیوں کی جانب سے زہریلی گیسوں کے استعمال کا نادر ثبوت۔

انتخابات کے روز عورتیں سارا دن ووٹ ڈالنے کے انتظار میں قطار بنائے کھڑی رہیں۔ کچھ ناخواندہ عورتوں نے اس سے پہلے کبھی قلم بھی نہیں پکڑا تھا۔ گنتی مکمل ہونے پر ہیرو سمیت سات خواتین 105 رکنی پارلیمنٹ کی رکن منتخب ہو گئیں۔

اس کے بعد پیش آنے والے حالات تقریباً ہر اُس اسلامی ریاست کی کہانی ہیں جہاں عورتوں نے سیاسی سرفرازی حاصل کی۔ تقریباً ہمیشہ ہی سیاست دان خواتین شادی، طلاق، بچوں کی تحویل اور جائیداد کے قوانین میں اصلاح کی کوشش کرتی ہیں۔ کردستان میں بھی پارلیمنٹیرین خواتین نے شریعت پر مبنی قوانین کی اصلاح کے لیے مہم شروع کی جو انہیں مردوں کے مساوی حقوق سے محروم کرتے تھے۔ ان کے مطالبات میں مندرجہ ذیل بھی شامل تھے: کثیر الازدواجی کو غیر قانونی قرار دینا (ماسوائے عورت کے ذہنی مرض کے نتیجے میں) اور قوانین وراثت میں تبدیلی لانا تاکہ بیٹیوں کو بھی والدین کی جائیداد میں بیٹوں کے برابر حصہ ملے۔

ہیرو کا خیال تھا کہ پارلیمنٹ شاید کثیر الازدواجی کے خلاف قانون منظور کر دے گی۔ قرآن

میں کثیر الازدواجی کو مردوں کے لیے بطور آپشن پیش کیا گیا ہے نہ کہ بطور ضرورت۔ ساتویں صدی کے عرب معاشرے میں بیویاں رکھنے کی کوئی حد مقرر نہیں تھی۔ قرآن نے زیادہ سے زیادہ چار کی حد مقرر کرتے ہوئے اجازت نہیں دی بلکہ صرف زیادہ سے زیادہ تعداد بتائی ہے۔ غور سے مطالعہ کرنے پر پتا چلتا ہے کہ یک زوجگی قابل ترجیح ہے۔ ''اگر تم انصاف نہیں کر سکتے تو ایک ہی رکھو۔'' ایک اور جگہ پر قرآن میں ارشاد ہے۔ ''اگر تم چاہو بھی تو دو عورتوں کے درمیان کبھی انصاف نہیں کر سکتے۔''

کثیر الازدواجی کا مسئلہ غلامی سے ملتا جلتا ہے، جو اسلامی ممالک میں درجہ بدرجہ ممنوع قرار پائی۔ سب سے آخر میں (1962ء میں) سعودی عرب نے اس کے خلاف قانون سازی کی جب حکومت نے بادشاہت کے تمام غلاموں کو بازار کے نرخ سے تین گنا قیمت پر خرید کر آزاد کر دیا۔ جہاں تک کثیر الازدواجی کا معاملہ ہے تو قرآن کی آیات اس کی اجازت دیتی ہیں، لیکن غلامی کی حوصلہ شکنی کی گئی۔ سنت محمدیؐ میں بہت سے جنگی قیدیوں کو رہا کرنے کی مثالیں ملتی ہیں۔ چونکہ غلاموں کو آزاد کرنا اچھے مسلمان کی نشانی بتائی گئی، اس لیے زیادہ تر مسلمان اب تسلیم کرتے ہیں کہ ساتویں صدی عیسوی کے بعد حالات بہت بدل گئے ہیں۔ ساری اسلامی دنیا میں کثیر الازدواجی کا رجحان بھی ختم ہو رہا ہے، اور بہت سے مسلم علما اس پر قانونی پابندی عائد کرنے میں کوئی شرعی نقص نہیں سمجھتے۔

کرد پارلیمنٹ کے لیے مشکلات ان چیزوں میں تبدیلی کے مطالبات سے پیدا ہوئیں جنہیں قرآن بطور آپشن پیش نہیں کرتا، جیسے بیٹوں کو بیٹیوں کے مقابلے میں دوگنا ترکہ ملنا۔

قرآن نے وراثت کے لیے فارمولا ایک ہدایت کے طور پر متعین کیا جس پر عمل کرنا تمام اہل ایمان پر لازم ہے۔ ساتویں صدی عیسوی کے عرب میں قرآن کا یہ اصول عورتوں کے لیے ایک بہت بڑا اقدام تھا جو تب تک گھریلو سامان کی طرح ورثہ میں منتقل ہوتی تھیں اور انہیں جائیداد پر کوئی حقوق حاصل نہ تھے۔ بیشتر یورپی خواتین کو وہ حقوق حاصل کرنے کی خاطر مزید بارہ صدیوں تک انتظار کرنا پڑا جو قرآن نے مسلمان عورتوں کو دے دیے تھے۔ انگلینڈ میں 1870ء سے پہلے ''شادی شدہ خواتین کی جائیداد کا قانون'' ختم نہ ہوا جس میں شادی ہونے پر عورت کی جائیداد اس کے شوہر کی ہو جاتی تھی۔

آج مسلمان حکام ترکہ کی اس غیر مساوی تقسیم کے دفاع میں نکتہ پیش کرتے ہیں کہ قرآن مردوں سے اپنی بیوی اور بچوں کی کفالت کا تقاضا کرتا ہے، جبکہ عورتوں کو اپنی دولت صرف اپنے زیر استعمال رکھنے کی اجازت ہے۔ یقیناً عملی طور پر یہ اصول شاذ ہی کارگر ہے۔ ہیرو ''Save the Childern'' کے کردچیپٹر کی سربراہ تھی۔ اس تنظیم کی تحقیق نے بار بار ثابت کیا ہے کہ عورتوں کی زیر استعمال دولت سے مردوں کی زیر استعمال دولت کی نسبت کنبے کو کہیں زیادہ فائدہ ہوتا ہے۔

مَیں جنوری 1993ء میں ہیرو سے ملنے گئی جب پارلیمنٹ خواتین کے پلیٹ فارم پر بحث کی تیاری کر رہا تھا۔ اس کا دفتر ایک بڑے سے مکان کے چھوٹے سے کمرے میں تھا جو کبھی صدام حسین کے اعلیٰ حکام میں سے ایک کا ہوا کرتا تھا۔ ہیرو نے کمرے سے فرنیچر اٹھوا کر اسے روایتی کرد پہاڑی رہائش گاہ جیسی صورت دینے کی کوشش کی تھی۔ فرش پر کرد نمدے اور تکیے پڑے تھے۔ دیواروں اور شہتیروں پر بیلوں والے پودے چڑھے ہوئے تھے۔ چھت کے نزدیک ایک گلہری شہتیر کے ساتھ لٹکی اپنی چھوٹی سی اونی تھیلی میں سے باہر آ جا رہی تھی۔

ہیرو کی نظر میں یہ قانون سازی محض ایک ابتدا تھی۔ اس نے کہا: ''میں نہیں سمجھتی کہ کچھ عادات اور سوچنے کے انداز صرف نئے قوانین کی مدد سے تبدیل کیے جا سکتے ہیں۔ اس کے لیے وقت، تشہیر، تعلیم کی ضرورت ہے۔ پہلے لوگوں کو اس کی تفہیم کروانی چاہیے اور پھر آہستہ آہستہ وہ اسے قبول کر لیں گے۔''

اُس وقت خواتین ارکان پارلیمنٹ کی تشکیل دی ہوئی ایک کمیٹی کی اراکین کردستان جا کر قانونی اصلاحات کے لیے حمایت پیدا کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ وہ قصبات اور دور دراز کی عورتوں کے پاس گئیں، اور اصلاح کے حق میں ایک درخواست پیش کی۔ اگست 1992ء میں درخواست پر 3,000 نام درج تھے۔ ایک سال بعد دستخط کرنے والی خواتین کی تعداد 30,000 ہو گئی تھی۔

اصولی طور پر مجوزہ قانونی اصلاح کو پیش کرنے کے لیے دس اراکین پارلیمنٹ کی حمایت کافی تھی۔ ستمبر 1993ء میں 35 ارکان پارلیمنٹ نے تجاویز پر دستخط کر دیے۔ لیکن اصلاحات ابھی تک معرض التوا میں تھیں۔ بزدل ارکان نے کہا کہ انہیں پیش کرنے کے ''درست'' وقت کا انتظار کرنا ضروری ہے۔

یہ واضح نہیں تھا کہ ''درست'' وقت کب آئے گا۔ اور 1994ء کے موسم گرما میں لگنے لگا کہ وہ وقت کبھی آئے گا ہی نہیں۔ تب تک کرد پارلیمنٹ دو مرکزی کرد پارٹیوں کے درمیان شدید لڑائی کا شکار ہو چکی تھی۔ وہاں سے کسی بامعنی تبدیلی کی توقع رکھنا خلاف قیاس تھا۔

اگر ایسا ہو بھی جاتا تو شریعت پر مبنی قانونی اصلاحات شاذ ہی کبھی پائیدار کامیابی حاصل کر سکتی تھیں۔ 1956ء میں تیونس نے قرآنی قانون کی جگہ مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں کے لیے ایک متحدہ ضابطہ متعارف کروایا جس میں کثیر الازدواجی اور تحقیر پر پابندی لگائی گئی، اور عورتوں کو تنخواہ اور طلاق کے مساوی حقوق دیے گئے۔ لیکن یہ قانون ابھی تک عوامی رویوں سے اس قدر آگے تھا کہ کبھی بھی گہری تبدیلی لانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ آج تیونس کی گلیوں میں چلتے ہوئے آپ خود کو کسی اور سیارے پر محسوس کریں گے جہاں بہ مشکل ہی کوئی عورت موجود ہے۔ چند غیر ملکی سیاحوں کے سوا عورتیں عوامی مقامات پر دکھائی نہیں دیتیں۔

ایران میں کثیر الازدواجی اور بچوں کی شادی کے خلاف شاہ کے قوانین انقلاب کے بعد کالعدم ہو گئے۔ جدید عرب حقوق نسواں تحریک کی جائے پیدائش مصر میں قانونی اصلاحات کی تاریخ ملی جلی تھی۔ 1919ء میں باتقاب عورتوں نے برطانوی نوآبادیاتی حکومت کے خلاف احتجاج کے لیے قاہرہ کی گلیوں میں مارچ کیا تھا۔ 1956ء میں برطانوی حکومت کو نکالے جانے پر مصری صدر جمال عبدالناصر نے عورتوں کو ووٹ کا حق دیا۔ لیکن 1979ء تک محدود حیثیت کے قوانین عورت کو اپنے شوہر کی مرضی یا عدالتی حکم کے بغیر گھر سے باہر نکلنے سے منع کرتے تھے۔

نوبیل انعام یافتہ مصری ادیب نجیب محفوظ نے اپنے ناول ''Palace Walk'' میں آمنہ کے متعلق دل گداز انداز میں لکھا ہے جو اپنی ازدواجی زندگی کے پچیس برس کے دوران صرف ایک مرتبہ گھر سے باہر نکلی، اور وہ بھی قریبی مسجد میں جانے کی خاطر۔ جب شوہر کو اس سرکشی کا پتا چلا تو اسے گھر سے نکل جانے کا حکم دیا۔ ''یہ حکم ایک مہلک وار کی طرح اس کے سر پہ پڑا۔ وہ گنگ ہو کر رہ گئی اور ایک لفظ بھی نہ بولی۔ وہ حرکت بھی نہیں کر سکتی تھی...... وہ مختلف قسم کے خدشات سے دوچار تھی: کہ کہیں شوہر اپنا غصہ نکالنے کی خاطر اسے گالیاں نہ دینے لگے۔ اسے جسمانی تشدد کا بھی احتمال تھا، لیکن گھر سے نکالے جانے کا خیال اسے کبھی نہیں آیا تھا۔ وہ پچیس برس سے اس کے ساتھ رہ رہی تھی اور یہ تصور کرنے سے قاصر تھی کہ کوئی بھی چیز انہیں جدا کر سکتی یا اسے ناقابلِ علیحدگی

گھر سے باہر نکال سکتی ہے۔"

لیکن مکان بدری کی دھمکی سے بھی کہیں زیادہ بری چیز Bait el Taa (فرمانبرداری کا گھر) کا قانون تھا۔ اس قانون کے تحت کوئی شوہر اپنی بددل ہو چکی یا گھر سے بھاگی ہوئی بیوی کو واپس لا کر اپنے ساتھ جنسی عمل پر مجبور کر سکتا تھا، چاہے وہ اُس سے کتنی ہی نفرت کرتی ہو۔ ضرورت پڑنے پر عورت کو گھسیٹ کر گھر لانے کے لیے پولیس سے بھی مدد لی جا سکتی تھی۔ دیگر قوانین کا مطلب تھا کہ مصری عورتوں کو انہیں بتائے بغیر بھی طلاق دی جا سکتی تھی۔ ایک سے زائد بیویاں رکھنے والے شوہر قانوناً اپنی ایک بیوی کو دوسری بیویوں کے متعلق بتانے کے پابند نہیں تھے۔ کچھ بیویوں کو صرف شوہر کی وفات پر پتا چلتا جب ایک اور "نیا" کنبہ بھی جائیداد میں حصہ لینے سامنے آ جاتا۔

مصری عورتوں نے آہستہ آہستہ سیاست میں اپنی جگہ بنائی۔ 1962ء میں حکمت ابوزید کابینہ میں آنے والی پہلی عورت تھی۔ وہ سماجی امور کی وزیر بنی۔ لیکن کہیں 1978ء میں آ کر ہی عائشہ راتب نے صدر کی بیوی جہاں سادات کی مدد سے عائلی حیثیت کے قوانین میں اصلاح کی مہم شروع کی۔ وہ اصلاحات بہت نرم سی تھیں جن میں شوہر سے تقاضا کیا گیا کہ وہ بیوی کو طلاق دینے یا نئی بیوی لانے کی نیت کے متعلق بتائے۔ اگر شوہر ایک اور شادی کرے تو پہلی بیوی کو بارہ ماہ کے اندر اندر طلاق لینے کا اختیار تھا۔ اصلاحات نے مطلقہ عورت کو کم از کم دس سال کی عمر تک بیٹے اور بارہ سال کی عمر تک بیٹیاں اپنے پاس رکھنے کا حق بھی دیا۔ عدالت بیٹیوں کی حضانت کا حق پندرہ سال کی عمر اور شادی تک بڑھا بھی سکتی تھی۔ نان نفقہ کے قوانین بہتر ہوئے؛ بچوں والی بیوی کو گھر اپنے پاس ہی رکھنے کا حق ملا، اور وہ جبری Bait el Taa کے خلاف عدالت میں اپیل کرنے کے قابل بھی ہو گئی۔

لیکن نرم پن کے باوجود ان اصلاحات نے "اسلامی قوانین، جہاں کے قوانین نہیں" کے نعروں کو تحریک دلا دی۔ انقلاب پسند شیوخ نے جہاں سادات اور عائشہ راتب کو ملحد اور خاندان کے دشمن قرار دیا۔ قدیم اسلامی یونیورسٹی الازہر میں فسادات شروع ہو گئے۔ طالب علم لڑکوں نے نعرے لگائے: "ایک، دو، تین، چار۔ ہمیں ایک، دو، تین، چار بیویاں چاہئیں!" درحقیقت قوانین نے کثیر الازدواجی یا یک طرفہ طلاق کے حق کو ہرگز چیلنج نہیں کیا تھا۔ حتیٰ کہ ان میں کلائٹورس کاٹنے کا بھی ذکر نہیں تھا۔

1979ء میں انور سادات نے صدارتی فرمان کے ذریعے قوانین نافذ کر دیے۔ اس نے حکومت میں عورتوں کی تعداد بڑھانے کی غرض سے نئے کوٹے بھی متعین کیے۔ لیکن مخالفین نے عدالت میں جنگ جاری رکھی۔ 1985ء میں وہ ''جہاں کے قوانین'' کو منسوخ کروانے میں کامیاب ہو گئے۔ اب لڑائی کا دائرہ کار وسیع ہو گیا تھا اور بنیاد پرست ''خالص اسلامی نظام'' قائم کرنے کی خاطر مصری حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش میں تھے۔ ان کا تجویز کردہ نظام اس وقت موجود تمام نظام ہائے حکومت (بشمول مغربی جمہوریت) کے ساتھ کوئی بھی تعلق نہیں رکھتا تھا۔

اسلامی ریاست اپنی مثالی صورت میں لفظ کے کسی بھی جدید مفہوم میں ''قوم'' یا ''ملک'' نہیں۔ اس کی کوئی سرحدیں نہیں۔ یہ مدینہ میں قائم کردہ امت کی طرز پر تمام مسلمانوں کی سیاسی اور مذہبی یونین ہوگی۔ کوئی سیاسی جماعتیں موجود نہیں ہوں گی، بلکہ صرف ایک متحدہ اسلامی امت یہ مقاصد پورے کرے گی۔ اس کا سربراہ خلیفہ ہوگا جو مسلمانوں کے سیاسی و مذہبی سربراہ کی حیثیت میں سنت نبویؐ پر عمل کرے گا۔

خلیفہ کے لیے مرد ہونا لازمی ہے، کیونکہ نمازوں کی امامت کروانا بھی اس کے فرائض میں شامل ہے، اور عورت کو امامت کروانے کی اجازت نہیں (مبادا اس کی آواز روحانی کی بجائے شہوانی خیالات کو تحریک دلانے کی وجہ نہ بن جائے)۔ خلیفہ کا انتخاب امت کے ممتاز ارکان کریں گے۔ ایسے شخص کا خلیفہ بننا آئیڈیل ہے جو خود کو انتخاب کروانے کی خواہش ظاہر کرنے کے بجائے تذبذب کا مظاہرہ کرے۔

خلیفہ کے ماتحت حکومت کی مقننہ اور عدلیہ ہیں۔ ایک مجلس شوریٰ جو کچھ اعتبار سے پارلیمنٹ جیسی ہے، اگرچہ اس کا کردار قانون سازی سے زیادہ مشاورتی نوعیت کا ہے؛ ماہرین کی ایک مجلس جو خلیفہ کے قریبی مشیروں کا کام انجام دے؛ اور قاضی جو (اکثر اسناد کے مطابق) مرد ہی ہونا لازمی ہے، کیونکہ عورتوں کو جذباتی خیال کیا جاتا ہے۔

ممکنہ اسلامی ریاست کے قوانین کا اولین سرچشمہ قرآن ہوگا۔ لیکن اس کی چھ ہزار آیات میں سے صرف چھ سو آیات قانون، اور صرف 80 براہ راست جرم و سزا، معاہدوں اور ازدواجی قانون سے متعلق ہونے کے باعث دیگر ماخذوں کو بھی مدنظر رکھا جائے گا۔ حدیث بہت سے خلا پر کرتی ہے۔ تیسرا سرچشمہ استصواب رائے ہے، یعنی مسلم امت کے متفقہ طور پر فیصل کردہ معاملات،

کیونکہ ایک حدیث کے مطابق، ''میری امت غلط بات پر متفق نہیں ہوگی۔''

مسلمان ایک مثالی اسلامی ریاست میں اپنے نمائندے منتخب کرنے کے لیے ووٹ ڈال سکتے ہیں، لیکن متصادم آئیڈیالوجیز کو برداشت کرنے کے مفہوم میں یہ نظام جمہوریت نہیں ہو سکتا کیونکہ کوئی بھی دنیاوی نظریہ چاہے اسے اکثریت کی حمایت ہی کیوں نہ حاصل ہو قرآن کے الوہی قوانین پر فضیلت حاصل نہیں کر سکتا۔ جب الجیریائی حکومت نے 1992ء میں ایک اسلامی حکومت قائم ہونے کے خدشے کے پیش نظر انتخابات ملتوی کیے تو بنیاد یہ بنائی کہ اسلام پسند ایک مرتبہ جمہوری انداز میں منتخب ہونے کے بعد الجیریا کے جمہوری اداروں کو ختم کر دیں گے۔ مرکزی اسلامی جماعت ''اسلامک سالویشن فرنٹ'' کے اراکین نے مزاحاً اپنا نعرہ یوں بتایا: ''ایک آدمی، ایک ووٹ، صرف ایک بار۔''

یہ امر بحث طلب ہے کہ ایک مثالی اسلامی ریاست میں عورتیں کیسے حصہ لیں گی۔ اگرچہ وہ خلیفہ یا قاضی نہیں بن سکتیں، لیکن مدینہ میں امت کی تاریخ بتاتی ہے کہ عورتوں نے کلیدی فیصلوں میں حصہ لیا اور پالیسی کے مباحث میں موجود رہیں۔ عورتوں نے اکثر آنحضرتؐ اور خلفائے راشدینؓ سے دلیل بازی کی اور کبھی کبھی ان کی آرا فیصلہ کن بھی ثابت ہوئیں۔

تاہم، غزہ کی اسلامی یونیورسٹی میں طالبات کو مستقبل کی اسلامی ریاست میں اپنے ممکنہ کردار کا منظر بہت دھندلا نظر آیا۔ یونیورسٹی کے ترجمان احمد سائق نے وضاحت کی: ''سیاست کے لیے ایک مخصوص ذہنی قابلیت درکار ہے۔ معدودے چند عورتیں ہی اس قسم کا ذہن رکھتی ہیں۔'' مجھے اس کا جواب بہت بھونڈا لگا، کیونکہ اُس وقت فلسطین کی ممتاز سیاسی شخصیت ہنان اشراوی تھی۔ واشنگٹن میں امن مذاکرات میں فلسطینی ترجمان۔

''اشراوی کے شوہر سے پوچھیں۔ اس کے بچوں سے پوچھیں۔ کیا وہ ایک اچھی بیوی، اچھی ماں اور اچھی بہن ہے۔ اگر وہ یہ تمام فرائض احسن انداز میں پورے کر رہی ہے اور اس کے علاوہ بھی کچھ کرنے کی قابلیت رکھتی ہے تو ٹھیک ہے، اسے سیاست میں خوش آمدید۔ لیکن اگر اس کا شوہر اور بچے سیاست میں اس کی مشغولیت کے باعث متاثر ہو رہے ہیں تو یہ اسلام نہیں،'' احمد سائق نے جواب دیا۔ سب جانتے تھے کہ ہنان کا شوہر دو بیٹیوں کا خیال رکھتا، کھانے پکانے کا انتظام کرتا اور اپنی بیوی کے کام پر فخر مند بھی تھا۔ احمد سائق نے اس میں سے کسی بھی بات کو ماننے

سے انکار کر دیا اور حقارت بھرے لہجے میں بولا، اگر میرا اپنا گھر مسمار ہو رہا ہو تو دوسروں کے لیے گھر کیسے بنا سکتا ہوں؟''

ایران نے اپنے بہت سے سیاسی اداروں کو اصل اسلامی امت کی طرز پر ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ انقلاب پر منتج ہونے والے احتجاجی مظاہروں میں عورتوں کی سیاسی سرگرمی کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ پارلیمنٹ میں عورتیں موجود ہیں، اور کچھ عورتیں تو ڈپٹی وزرا کے اعلیٰ عہدے تک بھی پہنچ چکی ہیں۔

انقلاب کے بعد ایران نے جمہوریت کی جانب کچھ قدم اٹھاتے ہوئے ایک ریفرنڈم کروایا جس میں پوچھا گیا: ''اسلامی جمہوریہ: ہاں یا نہ؟'' بہت بڑی اکثریت کی ''ہاں'' کے ذریعے راہ ہموار ہو جانے پر سیاسی جماعتوں پر پابندی عائد کی گئی اور اسلامی انقلاب کے مقاصد کی حمایت نہ کرنے والے کسی بھی شخص کے لیے عہدے کا امیدوار بننا ممنوع قرار دیا گیا۔ ایران میں سولہ سال سے زائد عمر کے ہر شخص کو ووٹ دینے کا حق ہے۔ ووٹ ڈالنے کو مذہبی فریضہ سمجھنے کے باعث ٹرن آؤٹ کافی زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن امیدواروں کا انتخاب مذہبی حکومت کے لیے قابل قبول افراد تک ہی محدود ہے۔

انقلاب سے قبل کی ایرانی پارلیمنٹ میں منتخب ہونے والی چار خواتین میں سے ایک مرضیہ دباغ ایرانی نظام میں قرین قیاس طور پر کامیاب سیاست دانوں کی مثال ہے۔ شدید مار کھانے کے باعث کبڑے پن کے ساتھ وہ 53 کی عمر میں بھی کہیں زیادہ بوڑھی لگتی ہے۔ اس کی کلائیوں پر سگریٹ سے جلائے گئے (شاہ کی خفیہ پولیس کی زیر حراست) نشانات کا ایک کنگن بنا ہے۔ انقلاب سے قبل مرضیہ اپنے باپ کے کاروبار کتب کی آڑ میں اسلحہ کی سمگلنگ اور بم بنانے کا کام کیا کرتی تھی۔ جب پولیس نے اس پر ہاتھ ڈالا تو اذیتیں دے کر معلومات حاصل کرنے کی کوشش میں اس کی اندام نہانی میں الیکٹروڈز گھسیڑے۔ اس قدر شدید انفیکشن ہو گئی کہ اس کے بقول ''بو کی وجہ سے کوئی Savak چیف بھی میری کوٹھڑی میں نہ گھستا۔'' اعتراف کروانے کی ایک آخری کوشش میں پولیس نے اس کی بارہ سالہ بیٹی کو تشدد کا نشانہ بنایا، لیکن بے سود۔ ''میں نے اپنی بیٹی کی چیخیں سن کر قرآن کی تلاوت شروع کر دی۔''

شاید مرضیہ Savak جیل میں ہی مرگئی ہوتی، لیکن ایک خاتون رشتہ دار نے رضا کارانہ طور پر اس کی جگہ لے لی اور وہ ایک چادر میں چھپ کر فرار ہوگئی۔ صحت بحال ہونے پر وہ دوبارہ لبنان کے اڈوں سے اسلحے کی سمگلنگ اور کمانڈوز کی تربیت کا کام کرنے لگی۔ جب خمینی پیرس میں جلاوطن تھا تو وہ اس کی خاندانی سکیورٹی کی چیف بن گئی۔ مرضیہ نے بتایا کہ 1979ء میں مس خمینی کی وطن واپسی سے ایک روز قبل ایک فرانسیسی رپورٹر نے خبر حاصل کرنے کی خاطر آیۃ اللہ کے گھر کی پچھلی دیوار پھلانگ کر اندر آنے کی کوشش کی۔ ''میں نے اسے دبوچ لیا اور اسی کشمکش میں میرے ٹخنے میں موچ آگئی۔'' اسی وجہ سے وہ مس خمینی کے ہمراہ وطن واپس نہ آسکی۔ آخر وطن پہنچنے پر اس نے اپنی عسکری صلاحیتوں کی زبردست مانگ دیکھی۔ چھ ماہ تک اُس نے اپنے آبائی شہر ہمدان میں ایک انقلابی کور کی قیادت کی۔ مردوں کو اُس سے احکامات لینے میں کوئی مسئلہ نہیں تھا: ''میں شوٹ کرنا جانتی تھی، اور وہ نہیں جانتے تھے۔''

پارلیمنٹ کی رکن منتخب ہونے کے بعد جب ایران نے سوویت یونین کے ساتھ تعلقات بحال کیے تو وہ خمینی کے دو ایلچیوں میں سے ایک کی حیثیت میں گورباچوف سے ملنے گئی۔ جب گورباچوف نے مصافحہ کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا تو تشویش کا وہ لمحہ اسے اب بھی یاد تھا۔ مسلمان عورتوں کو نامحرم مردوں کو چھونے کی اجازت نہیں، لیکن وہ ایک نہایت حساس سفارتی موقعے پر سوویت رہنما کی بے عزتی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ چنانچہ اس نے اپنا ہاتھ چادر میں لپیٹ کر آگے بڑھا دیا۔

پارلیمنٹ میں مرضیہ نے خارجہ پالیسی اور معاشی اصلاح کے معاملات میں عموماً کٹر پسندوں کا ساتھ دیا۔ لیکن وہ عورتوں کے لیے اقدامات کی ہمیشہ حامی رہی، جیسے وظیفوں تک رسائی میں آسانی پیدا کرنا، بیوہ ماؤں کے لیے وظائف بہتر بنانا اور بیرون ملک وظائف کی تقسیم میں امتیاز کا خاتمہ کرنا۔

کٹر ایران میں مرضیہ جیسی عورتوں کا منتخب ہو جانا مضحکہ خیز لگتا تھا، کیونکہ نسبتاً کہیں زیادہ معتدل اسلامی ممالک میں عورتوں کو کوئی رتبہ حاصل نہیں تھا۔ اردن میں عورتوں کو 1973ء میں ووٹ کا حق ملا۔ بدقسمتی سے 1967ء میں پارلیمنٹ معطل ہو جانے کے باعث انہیں اس وقت تک

یہ حق استعمال کرنے کا موقع نہ ملا جب شاہ حسین نے 1989ء میں انتخابات کروانے کا اعلان کیا۔

ٹی وی کی 41 سالہ میزبان توجان فیصل نے سوچا کہ یہ ایک نشست جیتنے کا اچھا موقع تھا۔ ایک سال قبل اس نے نیا چیٹ شو "عورتوں کے مسائل" شروع کیا تھا جس میں ہر ہفتے عورتوں سے متعلقہ کوئی مخصوص موضوع زیر بحث لایا جاتا۔ یہ جلد ہی اردن کی تاریخ کا متنازع ترین ٹی وی شو بن گیا۔ ایک پروگرام میں بیویوں کی پٹائی کے بہت زیادہ واقعات پر تنقید کی گئی تو غصیلے مردوں کی جانب سے سینکڑوں خطوط موصول ہوئے جنہوں نے اصرار کیا کہ بیویوں کو مارنے کا حق انہیں خدا نے دیا تھا۔

حقوق نسواں کی حامی مسلمان عورتوں کے لیے چند ایک معاملات ہی زیادہ حساس ہیں۔ قرآن میں فرماں بردار عورتوں کو صالح قرار دیا گیا، اور سرکشی کا خدشہ محسوس ہونے پر انہیں ڈانٹنے، بستروں سے الگ کرنے اور چابک سے مارنے کی ہدایت بھی ملتی ہے۔ قرآن میں "ضرب" کی اصطلاح استعمال ہوئی۔ نسوانیت پسندوں کے خیال میں اس کا ترجمہ "پر سے مارنا" بھی کیا جا سکتا ہے۔ قرآن میں دیگر جگہوں پر عورتوں سے شفیقانہ سلوک پر ہی زور دیا گیا، لہٰذا ان کی رائے میں لفظ کا درشت ترین مفہوم اخذ کرنا غیر منطقی ہے۔ ان کے مطابق آیت کا مطلب مرحلہ بہ مرحلہ اقدامات ہیں: پہلے ڈانٹنا، پھر بستر سے دور رکھنا، اور اس کے بعد ہلکے سے مارنا۔ سنت نبویؐ پر عمل کرنے والا کوئی مسلمان کبھی آخری حد تک نہیں جائے گا۔ کیونکہ آنحضرتؐ نے کبھی اپنی کسی بیوی کو بطور سزا ہم بستری کے حق سے محروم نہ کیا، اور اس بات کا بھی کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ آپؐ نے کبھی کسی زوجہ پر ہاتھ اٹھایا ہو۔ ایک حدیث کے مطابق آپؐ نے مسلمانوں کو بتایا: "تم میں سے کچھ کی بیویاں میرے پاس آ کر شکایت کرتی ہیں کہ شوہر انہیں مارتے پیٹتے ہیں۔ اللہ کی قسم تم میں سے ایسا کرنے والے لوگ بہترین نہیں ہیں۔" توجان نے گھریلو تشدد کا خاتمہ کرنے کے لیے اس حدیث پر بہت زیادہ زور دیا۔ لیکن قرآن کا لفظی ترجمہ واضح طور پر بیوی کو مارنے پیٹنے کی اجازت دیتا تھا۔ لہٰذا معترض مردوں نے اسے فوراً ملحد قرار دیدیا۔

جب ٹیلی ویژن سٹیشن نے کوئی ایک سال تک دھمکیاں سننے کے بعد توجان کا پروگرام منسوخ کیا تو اس نے انتخاب لڑنے کی ٹھانی۔ اس کے پروگرام میں عورتوں کو مزید حقوق دینے کے لیے عائلی قوانین میں اصلاح کرنا بھی شامل تھا۔ جواب میں بنیاد پرستوں نے اس کے خلاف مذہبی

عدالت میں تکفیرِ دین کا مقدمہ دائر کر دیا۔ قرآن میں مرتدوں کے لیے سزائے موت کا حکم ہے، لیکن اردن اس قسم کی سزائے موت کی منظوری نہیں دیتا۔ اس کے باوجود اگر توجان مجرم قرار پاتی تو اس کا نکاح فسخ ہو جاتا اور بچوں کی تحویل کا حق بھی نہ ملتا۔ الزام لگانے والوں نے مطمئن نہ ہونے پر مطالبہ کیا کہ توجان کو قتل کرنے والے کسی بھی مسلمان کو سزا سے مبرئی قرار دیا جائے۔ عدالت میں آتے وقت توجان پولیس کے پہرے میں ہوتی تا کہ اسے نعرے لگاتے ہوئے انتہا پسندوں کے مجمعے سے بچایا جا سکے۔

اس نے بتایا ''مجھے آدھی رات کے وقت کالز آنے لگیں۔ مردوں کے ساتھ ساتھ عورتیں بھی مجھ پر چلاتیں۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ مجھے مرنا ہوگا۔'' توجان کو رضا کار باڈی گارڈز کے نرغے میں انتخابی مہم چلانا پڑی۔ اس کے گائنا کالوجسٹ شوہر کو شدید دھمکیوں کے باعث اپنا کلینک بند کرنا پڑا۔ انتخابات کے نتائج میں توجان چھ امیدواروں میں تیسرے نمبر پر آئی۔ اس کا حلقہ ایسے دو حلقوں میں شامل تھا جہاں انتخابی افسروں کو سنگین بے قاعدگیوں کا ثبوت ملا۔ کوئی بھی خاتون امیدوار پارلیمنٹ کی نشست نہ جیت سکی۔ اسلام پسند غالب دھڑا بن کر ابھرے۔ بیس نشستیں اسلامی برادری اور مزید ایک درجن خود مختار رکن مسلمانوں کو ملیں۔

اسلامی بلاک جلد ہی الگ سکولوں کے قیام، شراب پر پابندی لگانے اور سودی کاروبار ختم کرنے کے لیے مہم چلانے لگا۔ پارلیمنٹ میں مرد ہیئر ڈریسرز کے عورتوں کے بال کاٹنے پر پابندی لگانے جیسے فروعی مسائل زیرِ بحث لائے گئے۔ جب کچھ ایک وزرا نامزد ہو گئے تو ان کے زیرِ انتظام وزارتیں خاتون ملازمین کے لیے مشکل جگہ بن گئیں۔ کچھ ایک کو اپنے بال چھپانے پر مجبور کیا گیا، کچھ دیگر، بالخصوص شادی شدہ خواتین کو مستعفی ہونے کا کہا گیا تا کہ بے روزگار مردوں کو نوکریاں مل سکیں۔

جلد ہی توجان کے چھوٹے سے فلیٹ پر عورتوں کا تانتا بندھ گیا۔ ''زیادہ تر نے خفت کا اظہار کیا کہ انہوں نے انتخابات کو سنجیدگی سے نہ لے کر بہت بڑی غلطی کی،'' توجان نے بتایا۔ اردن کے امیر اور پڑھے لکھے اعتدال پسند لوگوں کو یقین تھا کہ اردن کا بادشاہ پارلیمنٹ کو حقیقی اختیارات نہیں دے گا۔ انہوں نے انتخابات کا دن بطور تعطیل منایا اور ووٹ دینے کی زحمت گوارا نہ کی۔ ''ان سب نے اگلی مرتبہ ووٹ ڈالنے کا وعدہ کیا۔ میں بس یہی امید کر سکتی ہوں کہ اگلے انتخابات

آتے آتے بہت دیر نہ ہو جائے،'' توجان نے کہا۔

نومبر 1993ء میں جب اردن کے نئے انتخابات ہوئے تو 60 فیصد ووٹروں نے اپنا حق استعمال کیا، جبکہ 1989ء میں یہ شرح 41 فیصد تھی۔ یہ اضافی ووٹ بنیاد پرستوں کو اٹھا کر پھینکنے اور توجان کو اردن کی پہلی منتخب نمائندہ خاتون کے طور پر پارلیمنٹ میں لانے کے لیے کافی تھے۔

نتائج میں شاہ حسین کے ایک خصوصی اقدام نے بھی حصہ ڈالا۔ اس نے شہری علاقوں میں بنیاد پرستوں کی برتری کم کرنے کی خاطر ووٹنگ کے قوانین میں نہایت لطیف تبدیلیاں کیں۔ عوامی ریلیوں پر عائد پابندی اٹھانے سے قبل شاہ حسین نے اپنے خطاب میں ''منبر پر بیٹھنے والوں کو بات کرتے وقت خوف خدا کرنے'' کا کہا۔ شاہ کی مہارت بنیاد پرستوں کو سیاسی عمل سے خارج کیے بغیر ان کا اثر و رسوخ کم کرنا اور انڈر گراؤنڈ جانے پر مجبور کرنا تھی، جیسا کہ الجیریا میں بھی ہوا۔

لیکن انتخابی طریقہ کار میں تبدیلیوں کے باوجود توجان کی حمایت کافی بڑھتی جا رہی تھی۔ بہت سے اہل اردن نے ساری انتخابی مہم کے دوران اس کا حوصلہ بڑھایا؛ انتہا پسندوں نے اس کا خون بہانے کو ایک مرتبہ پھر مذہبی فریضہ قرار دیا تھا۔ عمان میں ایک مقابل امیدوار نے اپنے پروگرام میں ''عورتوں سے آئینی حقوق واپس چھیننے'' کا وعدہ کیا۔

فتح کے سرور میں ڈوبی ہوئی توجان نے کہا، ''میں نے صرف اپنے اوپر بھروسہ کیا اور کامیاب رہی۔'' دیگر امیدوار خواتین نے اچھی کارکردگی نہ دکھائی۔ تین عشروں سے سماجی خدمت میں مشغول پچاس سالہ نادیہ بشیر پر ایک مباحثہ سے اٹھنے پر پتھر برسائے گئے کیونکہ بنیاد پرستوں نے کہا تھا کہ وہ پوچھے گئے سوالات کا جواب کسی مرد کے توسط سے دے مخلوط اجتماع میں اس کی آواز شہوت انگیز خیال کی گئی۔ نادیہ نے اپنی شکست کو فلسفیانہ انداز دیتے ہوئے بلا تاسف کہا، ''ایسا دور آئے گا جب عوام پارلیمنٹ میں عورتوں کی موجودگی کے عادی ہو جائیں گے۔''

توجان یقیناً واقعی یہ مقصد اپنائے ہوئے تھی۔ اور اس کا راستہ آسان نہیں تھا۔ بحیثیت قانون ساز اس کا اولین مقصد عورتوں کی بے توقیری کرنے والے متعدد قوانین میں سے ایک کی اصلاح پر زور دینا تھا۔ اس نے سفر کا پرانا ضابطہ تبدیل کرنے کی کوشش کی جو عورتوں کو ملک چھوڑنے سے قبل اپنے شوہروں سے اجازت نامہ لینے کا تقاضا کرتا تھا۔ وہ عورتوں کے پاسپورٹ بھی تبدیل کرنا چاہتی تھی جس میں ان کے اپنے ناموں کو وقعت دینے کی بجائے محض شوہر یا سابق شوہر کی

''بیوی،'' ''بیوہ'' یا ''مطلقہ'' لکھا جاتا۔ اس وقت پارلیمنٹ میں تو جان کی کامیابیوں کے متعلق کچھ کہنا قبل از وقت تھا، لیکن انتہا پسند جانتے تھے کہ اس کا وہاں موجود ہونا ہی کافی بڑی کامیابی تھی۔

کچھ اسلامی ممالک میں عورتوں کے سیاست دان بننے کا تصور بھی بڑی دور کی بات ہے۔ سات ماہ طویل عراقی قبضے کے دوران کویت میں عورتوں نے ہی عراقی گولیوں کا سامنا کیا اور امیر کی واپسی کے حق میں مظاہرے کیے۔ عورتوں نے مختصر سی مدافعتی تحریک کو زندہ رکھا، کھانا اور ہتھیار سمگل کیے، غیر ملکیوں اور جنگجوؤں کو پناہ دی۔ لیکن جب امیر واپس آیا تو 1992ء کے پارلیمانی انتخابات میں انہیں ووٹ کا حق بھی نہ دیا۔

حملے سے قبل میڈیکل کی ایک طالبہ اریج الخطیب نے اپنی گولڈ مرسیڈیز سپورٹس کار میں رکھے ہوئے فون کی مدد سے سیاسی تنظیم سازی کی۔ عراقیوں نے ''آئی لَو ڈیموکریسی'' کے سٹکر سمیت کار چرا لی۔ اریج کے سوشلسٹ والدین کویت کے روایتی نظریہ عورت کی پروا نہیں کرتے تھے، لیکن اریج نے خود ہی پھونک پھونک کر قدم رکھا؛ وہ اپنے نسوانیت پسند خیالات کو سننے والوں اور حالات کی مطابقت میں معتدل بناتی رہی تاکہ وہ یونیورسٹی کی ساتھی طالبات کے لیے قابل قبول ہوں۔ جنسوں کی علیحدگی کی کویتی روایت پر عمل کرتے ہوئے اس نے سیاسی اجتماعات میں عورتوں کے لیے الگ کمرے مختص کیے جن میں ویڈیو سسٹم لگایا گیا تھا تاکہ وہ بحث سن سکیں۔

سرحد کے اس پار سعودی عرب میں بحث کا تصور بھی ناقابل تفریق تھا۔ سعودی عرب میں واقعتاً کوئی سیاسی کلچر موجود نہیں۔ دہران میں ملبوسات اور تحفوں کا ایک سٹور چلانے والی سعودی خاتون نبیلہ الباسم نے کہا، ''ہمیں جمہوریت کی ضرورت نہیں، ہمارے پاس اپنی صحرائی جمہوریت ہے۔'' اس کا اشارہ ''مجلس'' نامی قدیم صحرائی روایت کی جانب تھا حکمران خاندان کے زیر اہتمام ہفتہ وار اجتماعات جہاں رعایا کا کوئی بھی شخص درخواستیں دائر کرنے یا شکایات پیش کرنے کی آزادی رکھتا تھا۔ درحقیقت مجلس کی نوعیت نہایت جاگیردارانہ تھی جس میں بااحترام رعایا اپنے بادشاہ کے کان میں چپکے سے کچھ کہنے کے لیے چند سیکنڈ نصیب ہونے کا عاجزانہ انداز میں انتظار کرتی۔

نبیلہ نے مجھے ایک دوست کے متعلق بتایا جس نے حال ہی میں شاہ فہد کی بیوی کو درخواست دی تھی کہ اُسے بیڑ سیلون کے آلات درآمد کرنے کی اجازت دی جائے۔ تکنیکی لحاظ سے سارے

سعودی عرب میں، ہیئر ڈریسنگ سیلونز پر پابندی تھی کیونکہ مذہبی اسٹیبلشمنٹ ہر ایسی چیز پر غضب ناک ہو جاتی جو عورتوں کو ان کے گھروں سے باہر آنے پر مائل کرتی۔ درحقیقت ممتاز سعودیوں کی زیر ملکیت اور فلپائنی یا شامی بیوٹیشنز کے عملے والے سیلون بھرپور کاروبار کر رہے تھے۔ ''میری دوست چوری چھپے کاروبار چلاتے چلاتے تنگ آ گئی تھی،'' نبیلہ نے بتایا۔ لیکن ابھی تک درخواست کا کوئی جواب نہیں آیا تھا۔ ''درخواستیں کارگر ہیں۔ لیکن اس معاشرے میں آپ کو دوستانہ بنیادوں پر کام کرنا ہوتے ہیں، ایک گھرانے کے فرد کی طرح۔ آپ چیزوں کا مطالبہ کر سکتے ہیں، لیکن یہ نہیں کہ اپنا حق سمجھ کر ہاتھ بڑھایا اور چیز تک پہنچ گئے۔'' مسترد کیے گئے درخواست دہندہ کو السعود کا فیصلہ قبول کرنا پڑتا۔ کوئی آزاد پریس اور رائے عامہ ہموار کرنے کا کوئی راستہ موجود نہ ہونے کے باعث السعود حکمران من مرضی کے مطابق حکومت کرتے تھے۔

سعودی عورتیں صرف ایک حوالے سے اپنی قسمت پر تنقید کرنے کو تیار تھیں — ان کی ڈرائیونگ پر عائد پابندی۔ خلیج کی جنگ کے دوران سعودی عرب کی سڑکوں پر پونی ٹیل والی امریکی فوجی عورتوں کو ٹرک چلاتے دیکھ کر طویل عرصہ سے چلی آ رہی اس سلگتی ہوئی بحث کو نئی ہوا ملی۔ جنگ کے باعث صرف امریکی خواتین ڈرائیور ہی نہیں آئی تھیں۔ عراقی حملے سے بھاگنے والی بہت سی کویتی عورتیں بھی مرسیڈیز خود چلا کر بے نقاب سعودی عرب پہنچیں۔

اکتوبر 1990ء میں ڈرائیونگ کے حق کی خواہش مند سعودی عورتوں کے متعلق اخبارات میں مضامین چھپنے لگے۔ مختلف عورتوں نے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ سوچ ان کے لیے سوہان روح ہے کہ وہ کویتی عورتوں کی طرح اپنے بچوں کو بحفاظت دوسری جگہ پر نہیں لیجا سکتی تھیں۔ کچھ نے معاشی مسائل اٹھائے اور بتایا کہ اوسط سعودی گھرانے کی بیس فیصد آمدنی ڈرائیوروں کی تنخواہوں پر خرچ ہوتی تھی۔ سعودی عرب میں 3,00 000 کل وقتی پرائیویٹ شوفرز تھے، لیکن باہر آنے جانے کی خواہش مند ہر سعودی عورت کے لیے ایک ڈرائیور پھر بھی مہیا نہیں ہو رہا تھا۔ ڈرائیوروں سے محروم عورتیں کہیں آنے جانے کے لیے اپنے بیٹوں اور شوہروں کی مرہون منت تھیں۔ عورتوں کو ڈرائیونگ کا حق دینے کی کچھ حامیوں نے اسلام کا پتا کھیلا اور نکتہ اٹھایا کہ عورت کا کسی اجنبی مرد کو گھر میں رکھنا اور اس کے ساتھ اکیلے ادھر اُدھر جانا کتنا غلط تھا۔

ماہ نومبر کے اوائل میں منگل وار کی ایک دوپہر کو 47 عورتیں اپنے شوفرز کے ساتھ کاروں میں

بیٹھ کر ریاض کی اتمیم سپر مارکیٹ کی پارکنگ میں جمع ہوئیں۔ انہوں نے اپنے ڈرائیوروں کو ملازمت سے فارغ کیا۔ تب ان میں سے ایک چوتھائی نے اپنی کاروں کا سٹیرنگ سنبھالا اور باقی ان کے پیچھے بیٹھ گئیں۔ ابھی انہوں نے چند بلاکس کا فاصلہ ہی طے کیا ہوگا کہ نیکی کے فروغ اور بدی کے انسداد کی کمیٹی کے چھڑی بردار mutawain نے کاروں کو ایک چوراہے پر روک لیا اور عورتوں کو ڈرائیور سیٹ چھوڑنے کا حکم دیا۔ جلد ہی پولیس بھی آ گئی۔ عورتوں نے پولیس سے کہا کہ انہیں mutwain ہیڈکوارٹرز میں نہ لیجانے دیا جائے۔ mutwain کا کہنا تھا کہ ان عورتوں نے ایک مذہبی جرم کیا ہے۔ لہٰذا ان کے اور ٹریفک پولیس کے درمیان کافی تکرار ہوئی۔ انجام کار پولیس عورتوں کی کاریں چلا کر پولیس ہیڈکوارٹرز لے گئی ایک ایک mutwain مسافر سیٹ پر جبکہ عورتیں پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھیں۔

مظاہرے میں حصہ لینے والی عورتیں سعودیوں کے بقول ''اچھے خاندانوں'' سے تعلق رکھتی تھیں — دولت مند، ممتاز قبیلے جو حکمران السعود سلطنت کے ساتھ قریبی تعلقات میں بندھے ہوئے تھے۔ ڈرائیونگ کرنے والی تمام عورتیں پختہ کار پروفیشنلز تھیں جنہوں نے سمندر پار سے انٹرنیشنل ڈرائیونگ لائسنس لے رکھے تھے۔ متعدد کا تعلق ریاض یونیورسٹی کے شعبۂ خواتین کی فیکلٹی سے تھا، مثلاً میڈیسن کی پروفیسر فاتن الزمیل۔ دیگر عورتیں پیشہ ورانہ لحاظ سے قابل قدر تھیں، جیسے عائشہ المنا جس نے کولوراڈو یونیورسٹی سے سوشیالوجی میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی اور فیشن سے لے کر کمپیوٹر ٹریننگ سنٹر تک عورتوں کی زیر ملکیت کاروباروں کے ایک کنسورشیم کی سربراہ تھی۔ اگرچہ ان میں سے کچھ عورتیں عام طور پر نقاب نہیں کرتی تھیں، لیکن مظاہرے میں آتے وقت سب نے آنکھوں تک سارا چہرہ ڈھانپ رکھا تھا۔

مظاہرے سے قبل عورتوں نے گورنر ریاض شہزادہ سلمان بن عبدالعزیز کو ایک درخواست بھیجی جسے حکمران خاندان کا ایک کافی ترقی پسند رکن خیال کیا جاتا تھا۔ درخواست میں شاہ فہد التجا کی گئی کہ وہ ''اپنا پدری دل'' کھول کر ان کا ڈرائیو کرنے کا ''انسانی مطالبہ'' پورا کرے۔ انہوں نے دلیل دی کہ عہد نبوی کی عورتیں بھی اونٹوں پر سواری کیا کرتی تھیں۔ انہوں نے لکھا کہ اسلام میں اس کی شہادت موجود تھی، ''معلم انسانیت اور انسانوں کا آقا اس قدر عظیم ہے کہ اس کے دیے ہوئے اسباق جہالت کی تاریکی دور کرنے کے لیے روز روشن کی طرح عیاں ہیں۔''

عورتیں پولیس سٹیشن میں زیر حراست تھیں کہ پرنس سلمان نے ان کی حرکت پر بحث کرنے کے لیے ممتاز مذہبی اور قانونی ماہرین کا اجلاس بلوایا۔ قانونی ماہرین نے نتیجہ اخذ کیا کہ کسی سول خلاف ورزی کا ارتکاب نہیں ہوا، کیونکہ سب عورتوں کے پاس انٹرنیشنل ڈرائیونگ لائسنس تھے جنہیں سعودی قانون بھی تسلیم کرتا تھا۔ مذہبی نمائندوں نے رائے دی کہ کوئی اخلاقی خدشات ملوث نہیں تھے، کیونکہ عورتیں باپردہ تھیں، اور قرآن میں ڈرائیونگ جیسے کسی فعل کو ممنوع قرار نہیں دیا گیا۔ عورتیں رہا ہو گئیں۔

جدہ اور دہران میں عورتیں اسی طرح کے مظاہرے کرنے کے لیے جمع ہوئیں۔ وہ حکمران خاندان کی جانب سے پس پردہ حمایت دیکھ کر باحوصلہ ہو گئی تھیں۔ لیکن تب پشت سے وار ہوا۔

مظاہرے کی افواہ بہت تیزی سے پھیلی، حالانکہ سعودی میڈیا نے اسے کوئی کوریج نہیں دی تھی۔ مظاہرے میں حصہ لینے والی عورتیں جب اگلے روز یونیورسٹی پہنچیں تو انہیں اپنی تمام طالبات کی جانب سے ہیروؤں والا استقبال ملنے کی امید تھی۔ مگر کچھ ایک نے اپنے دفتروں کے دروازوں پر چٹیں لگی ہوئی پائیں جن میں انہیں غیر اسلامی قرار دے کر تنقید کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ رجعت پسند طالبات کی ایک بہت بڑی تعداد نے کچھ اساتذہ کی کلاسوں کا بائیکاٹ کیا۔ جلد ہی مساجد سے ان کے خلاف فتوے جاری ہوئے۔ گلیوں بازاروں میں پمفلٹوں کی بارش ہونے لگی۔ ایک پمفلٹ میں ''برائی اور شہوانیت کے فروغ کی حامیوں کے ناموں'' کی فہرست اور فون نمبر دیے گئے۔ ہر نام کے آگے ''امریکی سیکولرسٹ'' یا ''کمیونسٹ'' جیسے القابات بھی درج تھے۔ پمفلٹوں میں کہا گیا: ''یہ ہیں آفت کی جڑیں۔ انہیں اکھیڑ پھینکو! انہیں اکھیڑ پھینکو! سرزمین توحید کو پاک کر دو۔'' توقع کے مطابق ان عورتوں کے ٹیلی فون بجنے لگے اور گالیوں بھری کالز آنے لگیں۔ اگر فون ان کے شوہر اٹھاتے تو انہیں بدکردار بیویوں کو طلاق دینے کا کہا جاتا، یا پھر بیویوں کو کنٹرول نہ کر سکنے پر ان کی تحقیر کی جاتی۔

انتہاپسندوں کے دباؤ ڈالنے پر شاہی خاندان فوراً بھیگی بلی بن گیا۔ شہزادہ سلمان کی کمیٹی کی آرا دفن کر دی گئیں۔ اس کی بجائے حکومت نے عورتوں کو ان کی ملازمتوں سے معطل کیا اور پاسپورٹ ضبط کر لیے۔ سکیورٹی پولیس نے ایک ممتاز اور بارسوخ سعودی مرد کو بھی گرفتار کیا جس پر الزام تھا کہ اس نے برطانوی فلم ساز عملے کو کچھ بتایا تھا۔ اسے مار پیٹ کر پوچھ گچھ کی گئی اور پھر کئی ہفتوں تک جیل میں رکھا گیا۔

حکمران خاندان اسلامی بنیادوں پر عورتوں کا ساتھ دے سکتا تھا۔ انتہا پسندوں کی تمام کارروائیاں قرآن کے عین خلاف تھیں۔ قرآن کے مطابق کسی عورت پر بہتان لگانے والے شخص کو اسّی دُرّوں کی سزا ملنی چاہیے۔

لیکن مظاہروں کے ایک ہفتے بعد وزیر داخلہ شہزادہ نیف بن عبدالعزیز بھی دشنام طرازوں کے ساتھ مل گیا۔ مکہ میں ایک اجلاس کے دوران اس نے مظاہروں کو احمقانہ حرکت قرار دے کر مسترد کیا اور کہا کہ واقعہ میں ملوث کچھ خواتین کی پرورش سعودی عرب سے باہر ہوئی تھی نہ کہ ''اسلامی گھرانے میں۔'' تب اس نے سعودی عرب کے سرکردہ شیخ عبدالعزیز بن باز کی جانب سے ایک نیا فتویٰ پڑھ کر سنایا جس میں کہا گیا تھا کہ عورتوں کی ڈرائیونگ ''سعودی شہریوں کی اسلامی روایت سے متضاد تھی۔'' اگر اس سے پہلے ڈرائیونگ کرنا غیر قانونی نہیں تھا تو اب ہو گیا۔ وزیر داخلہ کے بیان کو صفحہ اول پر جگہ ملی اور یہ ڈرائیونگ کے سلسلے میں احتجاجی مظاہرے کے حوالے سے سعودی پریس میں چھپنے والی اولین خبر بھی تھی۔

اگرچہ مظاہرے سے قبل ان میں سے چند ایک عورتوں کے ساتھ میرا رابطہ تھا لیکن بعد میں کسی نے بھی میری کال نہ سنی۔ ان سب کو خبردار کر دیا گیا تھا کہ غیر ملکی میڈیا کے ساتھ کسی بھی رابطے کے نتیجے میں انہیں دوبارہ گرفتار کر لیا جائے گا۔ سب عورتوں کو اپنے فون ٹیپ ہونے اور گھروں کی نگرانی کیے جانے کا یقین تھا۔ مجھے ''ایک فکر مند سعودی خاتون'' کی جانب سے ایک اداس خط موصول ہوا جس میں ''چڑیوں کو پکڑنے'' کی تفصیل بیان کی گئی تھی۔ اس نے لکھا، ''کٹر بنیاد پرست ان عورتوں کے خلاف درخواستوں پر طالبات سے جبراً دستخط کروا رہے ہیں۔'' وہ ''اس موقع سے فائدہ اٹھا کر لبرل ازم، حکومت اور امریکہ کے خلاف جذبات کو بھڑکانا اور اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنا چاہتے تھے۔'' ایک اور عورت نے مجھے سادہ سا پیغام بھیجا: ''میں نے اس لیے ایسا کیا تاکہ میری پوتیاں یہ کہنے کے قابل ہو سکیں کہ میں وہاں موجود تھی۔''

میں نے مظاہرے میں شرکت کرنے والی ایک خاتون کے کسی رشتہ دار سے بھی بات کی۔ اس نے اداس لہجے میں کہا، ''میں نے اسے حوصلہ دلایا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وقت بہت موزوں ہے۔ اب یہ نصب العین دس سال پیچھے چلا گیا ہے میں ٹن کنکریٹ تلے دب گیا ہے۔''

دسواں باب

مسلم عورتوں کی کھیلیں

جب خواتین کی پہلی اسلامی کھیلوں کی افتتاحی تقریب کے موقع پر مشعل بردار ایتھلیٹ سٹیڈیم میں داخل ہوئی تو دس ہزار تماشائیوں نے تالیوں سے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ اس نے لمبے لمبے اور نپے تلے ڈگ بھرتے ہوئے ٹریک کا چکر لگایا تو مشعل سے شعلے اوپر کی ہوا کو چاٹ رہے تھے۔

مجمعے کے درمیان اونچے سٹینڈز پر بیٹھا ہوا اس کا باپ خوشی سے رو دیا۔ مشعل بردار، اٹھارہ سالہ پدیدہ بولور یزادہ سات سال کی عمر سے ایرانی ٹریک سٹار چلی آ رہی تھی۔ لیکن یہ پہلا موقع تھا جب باپ نے اسے بھاگتے ہوئے دیکھا۔

وہ اس لیے دیکھنے کے قابل ہوا تھا کیونکہ پدیدہ نے دنیا کا پہلا ٹریک سوٹ حجاب پہن رکھا تھا۔ سوٹ کا سفید سکارف بالوں کی ہر ایک لٹ کو چھپائے ہوئے تھا، اور ایک کالا، ٹخنوں تک لمبا جبہ لمبی جرسی کے نیچے اور پاجامے کے پائنچوں کے گرد لہرا رہا تھا۔ سٹیڈیم کے وسط میں دس ممالک سے خواتین کی سپورٹس ٹیمیں اپنے اپنے قومی جھنڈوں کے سامنے قطار بنائے کھڑی تھیں۔ شام اور ترکمانستان کے دستوں کے درمیان کبھی کبھی کوئی توہماتی ہاتھ اپنے سکارف کو ٹھیک کرتا ہوا دکھائی دے جاتا تھا۔

اگلے روز بڑے جوش و خروش سے مقابلہ شروع ہوا تو ایتھلیٹس اپنی زیادہ جانی پہچانی لائکرا (Lycra) شارٹس اور چست بے آستین قمیصوں میں نظر آئیں۔ باسکٹ بال سٹیڈیم میں جب

ایرانی ٹیم کی کپتان سپرنٹ لگا کر آذربائیجانیوں کے سامنے سے سروس کروانے گئی تو مسرور خواتین تماشائیوں کی داد اور چیخ و پکار نے سارے سٹیڈیم کو دہلا دیا۔ سٹیڈیم کے دروازوں سے باہر مسلح پولیس اہلکار چہل قدمی کر رہے تھے تاکہ کوئی مرد اندر نہ جا سکے۔ اندر، سٹیڈیم کی دیوار سے بہت اوپر خمینی کا قد آدم پوسٹر پسینے میں شرابور اور شارٹس میں ملبوس خواتین ایتھلیٹس کو دیکھ رہا تھا۔

فروری 1993ء کے اوائل میں مجھے خواتین کی پہلی اسلامی کھیلوں کے متعلق پتا چلا، جب انٹرنیشنل اولمپک کمیٹی کی برطانوی نمائندہ میری گلین ہیگ نے لندن میں مجھے گھر پر فون کر کے اطلاع دی اور پوچھا کہ ایک مغربی عورت کو تہران جاتے وقت سامان میں کیا کچھ شامل کرنا چاہیے۔ انٹرنیشنل اولمپک کمیٹی کو بطور مبصر کھیلوں میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی اور سابق اولمپک چیمپئن ہونے کے ناتے اسے مبصر بننا تھا۔

چند روز بعد میں اپنے لیے خود ہی دعوت نامے کا بندوبست کر کے ٹریک اینڈ فیلڈ سٹیڈیم میں کھلاڑیوں اور تماشائیوں کے درمیان اسے ملنے گئی۔ کسی نے ایک آفیشل میز کی جانب اشارہ کر کے میری راہنمائی کی جہاں کالے نقاب والی عورت کے پہلو میں کسرتی جسم والی، دبلی پتلی عورت بیٹھی تھی: اس کے بال تراشے ہوئے تھے، جسم پر ایک ڈینم جیکٹ اور لبرٹی مجسمے کی تصویر والی شرٹ، بلیو جینز اور پیروں میں ایتھلیٹ شوز تھے۔ میں نے فون پر اسے بتا دیا تھا کہ عورتوں کے سبھی اجتماعات میں حجاب پہننا لازمی نہیں۔ میں نے قریب جا کر اپنا تعارف کروایا۔ وہ مسکرا دی، اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور بولی: ”فائزہ ہاشمی، ایرانی اولمپک کمیٹی کی وائس پریذیڈنٹ۔“ پھر اس نے کالے برقعے والی عورت کی جانب اشارہ کر کے کہا، ”یہ انٹرنیشنل کمیٹی سے آئی ہوئی ہماری برطانوی مہمان ہے۔“

فائزہ ہاشمی صدر ہاشمی رفسنجانی کی تیس سالہ بیٹی اور خواتین کی پہلی اسلامی کھیلوں کی روح رواں تھی۔ اسلامی انقلاب کے بعد خواتین کی کھیلیں عملاً بالکل ختم ہوگئی تھیں کیونکہ ملاؤں نے سابقہ شاہی عہد کے مخلوط اجتماعات اور مقابلہ بازی پر فوری پابندی عائد کر دی تھی۔ بے پردگی والے ایتھلیٹ لباس میں لڑکیوں کے جسم کی نمائش اور لڑکوں کے ساتھ ٹریننگ کے خیال نے بہت سے مذہبی ایرانیوں کو کھیلوں، بالخصوص عورتوں کی کھیلوں کے خلاف کر دیا تھا۔

1979ء میں اپنے ریڈیو خطاب میں خمینی نے عوام کو بتایا تھا، ''اسلام میں کوئی تفریح نہیں۔''
اس کے جیتے جی تہران شہر اس خیال کی عکاسی کرتا رہا۔ عراق کے ساتھ معاشی طور پر تباہ کن جنگ اور اسلامی جوشیلوں کی عقابی نگاہوں نے شہر کو سیمنٹ کے رنگ کی دلگیر عمارات اور بے تیز لوگوں کا شہر بنا دیا تھا۔ انقلاب سے پہلے کے تمام شبینہ اجتماعات ختم ہو چکے تھے۔ حتیٰ کہ بلٹز اور کینٹکی فرائیڈ چکن جوائنٹس بھی یکسر تبدیل ہو گئے۔ خوفناک امتزاجات نے جنم لیا تھا، جیسے سابق لاس اینجلس بولیوارڈ پر سابق انٹرکانٹی نینٹل ہوٹل حجاب سٹریٹ پر ''گل شہادت'' ہوٹل بن گیا تھا جہاں باتھ رومز میں فلش لگے اور لابی میں ''امریکہ مردہ باد'' کا پوسٹر آویزاں ہو گیا۔

تاہم، خمینی اس کے باوجود جسمانی چستی کی ضرورت سے بالکل ہی بے بہرہ نہیں تھا۔ اس کے اپنے روزمرہ معمول میں گھر کے صحن کے اندر ہی ایک واک شامل تھی۔

دولت مند، زمینوں کے مالک رفسنجانی قبیلے نے جسمانی ورزش کرنے اور حتیٰ کہ ملاؤں کی نظر میں کچھ ناپسندیدہ تفریح کو بھی مناسب سمجھا۔ اپنے گھر کی حدود کے اندر رفسنجانی کی دو بیٹیاں اور تین بیٹے تیراکی کرتے، بائیسکل چلاتے، ٹیبل ٹینس اور والی بال کھیلتے۔ سارا وقت صدارت کے فرائض کی نذر ہونے سے قبل رفسنجانی اکثر خود بھی سوئمنگ پول میں بچوں کے ساتھ تیراکی کرتا یا ٹیبل ٹینس کی ٹیم لگاتا۔

1979ء کے انقلاب کے بعد ایران میں کھیلوں کی زیادہ تر سہولیات مردوں کے سپرد کر دی گئی تھیں۔ حکومت نے 1980ء میں ''ڈائریکٹوریٹ آف وویمن سپورٹس افیئرز'' قائم کیا، لیکن یہ محض اپنے نام تک ہی محدود رہا۔ آخر کار 1985ء میں ایرانی عورتوں کے ایک بے جوڑ اتحاد نے عورتوں کی کھیلیں دوبارہ ایجنڈے پر لانے کی پرجوش مہم شروع کی۔ کچھ کارکن ایران کی سابقہ خواتین ایتھلیٹس تھیں　　چند ایک اولمپک لیول کی کھلاڑی　　جن کے سپورٹس ویئر اتروا کر زبردستی حجاب پہنا دیے گئے تھے۔ جلاوطنی اختیار نہ کرنے والی ایتھلیٹس نے انجام کار ''اگر انہیں شکست نہیں دے سکتے تو ان کے ساتھ مل جاؤ'' والا نصب العین اپنا لیا اور مدد کے لیے مذہبی اسٹیبلشمنٹ کے اندر عورتوں کے گروپس سے رابطے کیے۔ انقلابی ملاؤں کی زبان بول سکنے والی فائزہ ہاشمی ان کی بہترین حلیف ثابت ہوئی۔ اپنے باپ کے دست امداد کے علاوہ فائزہ اور بھی کئی اثاثوں کی مالک تھی۔ تہران یونیورسٹی میں ایم اے مینجمنٹ کی طالبہ ہونے کے ناتے اسے علم تھا کہ اداروں کو

اپنے حق میں کیسے استعمال کرتا ہے۔

کچھ کرنے کی خواہش مند بیشتر مذہبی عورتوں کی طرح اس نے بھی حدیث نبوی کو بنیاد بنا کر اپنا کیس تیار کیا۔ ریکارڈ میں یہ بات موجود ہے کہ رسول اللہ نے مسلمانوں کو ''جسم مضبوط'' بنانے کی منظوری دی تھی اور یہ بھی فرمایا کہ ''اگر تم مسلمان ہو تو تمہیں ہر لحاظ سے برتر ہونا چاہیے۔'' فائزہ نے دلیل دی کہ کھیلوں کو جستجوئے کمال کا حصہ ہونا چاہیے، اور یہ باتیں عورتوں اور مردوں دونوں پر یکساں لاگو ہوتی ہیں۔ عورتیں اسلامی خاندان کا لازمی عنصر ہونے کی وجہ سے انہیں طبعی اور ذہنی فوائد کی ضرورت تھی جو سپورٹس کے ذریعے مہیا ہو سکتے تھے۔ رجعت پسندوں نے جواب میں کہا، ٹھیک ہے! تو پھر وہ اپنے گھروں کی چاردیواری کے اندر ورزش کرتی رہیں۔ فائزہ نے جواب دیا کہ عورتوں اور لڑکیوں سے مل جل کر کام کرنے اور مقابلہ بازی کے سماجی فوائد نہیں چھیننا چاہئیں۔

کہا جاتا ہے کہ آنحضرتؐ نے بالخصوص تین کھیلوں کی تعریف کی تھی: تیراکی، تیراندازی اور گھوڑسواری۔ چونکہ حدیث ''اپنی اولاد کو تیراکی اور تیراندازی سکھاؤ'' میں اولاد کا لفظ استعمال ہوا تھا نہ کہ ''اولاد و بنات'' کا، اس لیے زیادہ کٹر والدین نے کہا کہ ان مشاغل میں صرف بیٹوں کے حصہ لینے کی بات کی گئی تھی۔ لیکن تیراندازی کا جدید متبادل پستول یا رائفل اندازی ایک انقلابی ملک میں مفید مہارت تھی جو اُس وقت جنگ میں بھی ملوث تھا؛ اور یہ چادر لے کر کھیلی جا سکنے والی چند ایک سپورٹس میں سے بھی ایک تھی۔ چنانچہ سب سے پہلے شوٹنگ رینج میں عورتوں کو خوش آمدید کہا گیا — شروع میں سول ڈیفنس ملیشیا کی اراکین اور بعد ازاں گھر سے باہر نکلنے اور مشغلے کی متلاشی عورتوں کے طور پر۔

فائزہ نے دلیل دی کہ ایران کی اسلامی حکومت طبقہ اشراف کی اتھلیٹس کی حوصلہ افزائی کرنے کے بجائے ''تمام عورتوں کے لیے سپورٹس'' میں دلچسپی کا مظاہرہ کر کے بھی خود کو سابقہ شاہی عہد سے ممیز کر سکتی تھی۔ اس کے دلائل کے نتیجے میں بڑھتے ''خواتین کے اوقات'' میں سپورٹس کی سہولیات فراہم کی جانے لگیں اور لڑکیوں کے سکولوں میں سپورٹس پر زیادہ توجہ بھی دی گئی۔ انجام کار تہران کا ''رزرز پارک'' مردوں کے لیے ہفتے میں تین دن، آٹھ سے چار بجے تک بند رہنے لگا، تاکہ عورتیں حجاب کے بغیر جاگنگ کر سکیں۔

تب فائزہ نے بین الاقوامی مقابلوں میں شرکت کا کہیں زیادہ مشکل مسئلہ اٹھایا۔ بہت سے

اسلامی ممالک اپنی عورتوں کو بین الاقوامی سٹینڈرڈز سے دور رکھتے تھے: کبھی پردے کے تقاضوں اور کبھی روپے کی قلت اور کبھی دونوں کی وجہ سے۔ قلیل سپورٹس بجٹ کے باعث پاکستان جیسے ممالک (جہاں اولمپک لیول کی بہت سی کھلاڑی خواتین موجود ہیں) نے بارسلونا اولمپکس میں کسی کو بھی نہ بھیجا۔ ''پاکستان آبزرور'' میں سپورٹس کے موضوع پر کالم لکھنے والی فرحانہ ایاز نے کہا، ''بنیادی طور پر مرد ہم سے بہتر ہیں، اور حکومت بہترین کھلاڑیوں کو ہی موقع دیتی ہے۔'' لیکن وہ اس قسم کے فیصلوں کے پیچھے بڑھتے ہوئے اسلامی اثرات کا ہاتھ بھی دیکھتی ہے۔ پاکستان میں زیادہ تر ایتھلیٹ لڑکیاں ڈھیلی ڈھالی اور لمبی ٹی شرٹس اور نیچے لمبے پاجامے پہنتی ہیں، لیکن کچھ حلقوں کی رائے میں یہ بھی کافی نہیں تھا۔ ''ملاؤں نے حال ہی میں ہاکی کا مسئلہ اٹھایا ہے، کیونکہ آپ کو جھکنا اور بھاگنا پڑتا ہے۔ اور ملاؤں کی جانب سے دباؤ پر اولمپکس کے دوران خواتین کا کوئی بھی ایونٹ ٹیلی ویژن پر نشر نہ کیا گیا۔''

جب الجیریائی رنر حسیبہ بولمیرکا (Boulmerka) نے بارسلونا اولمپکس میں سونے کا تمغہ جیتا تو اس نے دل گداز تقریر میں اس امر پر خوشی کا اظہار کیا کہ ایک مسلمان عورت بھی ایسی کامیابی حاصل کر سکتی تھی۔ لیکن اس کی فتح پر ساری اسلامی دنیا نے ہی خوشی نہ منائی۔ الجیریا میں مرکزی مسلم سیاسی جماعت اسلامک سالویشن فرنٹ نے مساجد کے خطبات میں اسے ''نیم ننگا'' ہو کر بھاگنے پر ملعون کیا۔ حسیبہ کو مجبوراً ملک چھوڑنا پڑا۔

اگرچہ کچھ ایرانیوں نے بھی ساتھ دیتے ہوئے حسیبہ کو ''ایک جعلی مسلمان'' قرار دیا، لیکن فائزہ ہاشمی کو اسلام پسندوں کے ان بیانات سے خطرے کی بو آئی جو کوئی مثبت متبادل پیش نہیں کر رہے تھے۔ اس نے کہا کہ مسلمانوں کو کسی مسلمان عورت کی کامیابی پر خوش ہونا چاہیے، تمام مسلم ممالک کی روایات مختلف ہیں، اور حقیقی اسلامی نظام کی برتری ثابت کرنا ایران کا کام ہے۔ اس نے دلیل دی کہ ''استحصالی قوتیں'' (یعنی مغربی ممالک) سپورٹس کے میدانوں میں مسلمان عورتوں کی عدم موجودگی کی بنیاد پر اسلامی ممالک میں عورتوں کی کمتر حیثیت کی دلیل بناتی تھیں۔ ایک مقبول تقریر میں اس نے کہا، ''اگر اسلامی ممالک نے عورتوں کی کھیلوں کے لیے اپنے اصول وضع نہ کیے تو مغربی استحصالی ممالک کی بتائی ہوئی راہ ہی اپنانا پڑے گی۔'' ایران بین الاقوامی ممالک میں مردوں کی ٹیمیں بھیجتا تھا۔ فائزہ نے کہا کہ حجاب میں رہ کر کھیلی جا سکنے والی پانچ کھیلوں

میں عورتوں کو بھی حصہ لینے کی اجازت کیوں نہ دی جائے؟

ستمبر 1990ء میں اس نے اپنا نکتہ منوالیا، اور جب ایرانی ٹیم بیجنگ میں ایشیائی کھیلوں کی افتتاحی تقریب میں شامل ہوئی تو ایرانی شوٹنگ ٹیم کی چھ چادر پوش عورتیں آگے آگے تھیں۔ ان میں سے ایک لڑکی، اٹھارہ سالہ الہام ہاشمی ایرانی مردوں کا ریکارڈ توڑنے میں کامیاب رہی۔

فائزہ نے امید ظاہر کی کہ 1996ء کے اٹلانٹا اولمپکس میں باحجاب گھوڑ سوار لڑکیوں کا ایک سکواڈ بھی بھیجا جا سکے گا۔ باپردہ لباس پہن کر اور بالوں کو ہیلمٹ میں چھپا کر بہ آسانی شو جمپ کیا جا سکتا تھا، لیکن اس صورت میں کیا ہوگا اگر کوئی گھوڑ سوار لڑکی گھوڑے سے نیچے گر پڑی؟ اور عین اسی لمحے کھینچی گئی تصاویر میں اس کی ٹانگیں اوپر آسمان کی طرف کھلی ہوئی اور سر سے سکارف سرک گیا ہوا؟ رجعت پسند تو تیر انداز لڑکیوں پر بھی اعتراض کر رہے تھے کیونکہ ان کے خیال میں کمان کو کھینچتے وقت سینہ نمایاں ہو جاتا تھا حتیٰ کہ چادر میں بھی۔

بیشتر ایرانی ایتھلیٹ خواتین رنرز، تیراک، ہائی جمپرز کے لیے حجاب سمیت مقابلے میں حصہ لینا ہرگز ممکن نہیں تھا۔ انہی کی خاطر فائزہ نے متبادل اولمپکس کا خیال پیش کیا جس میں صرف مسلم ممالک کی لڑکیاں حجاب پہن کر مخلوط افتتاحی تقریب میں اکٹھی ہوتیں؛ اور بعد میں وہ اپنے لبادے اتار کر صرف خواتین تماشائیوں کے سامنے مہارتوں کا مظاہرہ کرتیں۔

لیکن اس سکیم سے فائدہ اٹھا سکنے کے قابل مسلم ممالک میں کوئی ایتھلیٹ خواتین ہی نہیں تھیں جنہیں بھجوایا جاتا۔ سعودی اور خلیجی ریاستوں میں خواتین کی سپورٹس کا کوئی ادارہ موجود نہیں تھا۔ فٹنس کی خواہشمند امیر عورتوں نے اپنے گھروں کے اندر جم بنا رکھے تھے اور نجی ٹرینرز سے راہنمائی لیا کرتی تھیں۔ بقیہ عورتیں بس گھریلو زندگی ہی گزارتی رہتیں۔

ایران کی دعوت پر فوری ردعمل دینے والے ممالک سابقہ سوویت مسلم جمہوریائیں تھیں جن کی ایتھلیٹ خواتین نے سوویت سپورٹس جوگرناٹ میں تربیت پائی تھی۔ ان میں سے کسی نے کبھی نقاب نہیں کیا تھا؛ چند ایک قرآنی احکامات کی خلاف ورزی بھی کی۔ لیکن سوویت نظام منہدم ہونے پر محض نام کی مسلم جمہوریائیں، مثلاً آذربائیجان، سپورٹس جیسی تعیشات کے لیے فنڈ کی شدید قلت کا شکار تھیں۔ آذربائیجانی ٹیم منیجر Alyev مسلم نے آہ بھری، ''اس سال کے لیے ہمارا کھیلوں کا سارا بجٹ صرف ایک ایتھلیٹ کو ایک مقابلے میں بھیجنے کے ہی قابل ہے۔ بشرطیکہ وہ مقابلہ یورپ

کے اندر ہی ہو رہا ہو۔'' اس کے خیال میں 120 ایتھلیٹ خواتین کے لیے بمعہ اخراجات ایران کا دورہ بہت اچھی پیشکش تھی چاہے انہیں نقاب پہن کر باکو سے ایک بس میں سوار ہو کر چھبیس گھنٹے سفر ہی کیوں نہ کرنا پڑتا۔

ایران میں ہر معاملے کی طرح یہاں بھی سیاست نے کردار ادا کیا۔ ایران سابق سوویت جمہوریاؤں کی بڑی ٹیموں کے لیے اخراجات ادا کرنے کو تیار تھا، کیونکہ وہ وہاں پر اپنا اثر ونفوذ بڑھانا چاہتا تھا۔ لیکن اس نے سوڈان جیسے ممالک کے بل ادا کرنے سے انکار کر دیا جو سب سے آگے آ گئے تھا۔ اسی طرح مصر جیسے ملکوں کو بھی نظر انداز کیا گیا جس کے ساتھ ایران کے تعلقات کشیدہ تھے۔ دیگر ممالک نے محض جذبہ خیر سگالی کے تحت مختصر ٹیمیں روانہ کیں۔ مالدیپ کے پانچ رکنی سکواڈ میں شامل پست قد ٹیبل ٹینس کھلاڑی نے کہا،''ہم ایرانی نظام کی توثیق کرنے یہاں آئی ہیں۔ لیکن سپورٹس کے نکتہ نظر سے یہ ہمارے لیے بے معنی ہے۔'' یہ بات کرتے ہوئے وہ سردی سے کانپنے لگی، کیونکہ تہران کے کم گرمائش والے ٹیبل ٹینس سنٹر کے باہر برف باری ہو رہی تھی۔''ہمارا ملک خط استوا پر ہے۔ یہاں خود کو گرم رکھنا ناممکن ہے۔''

سابق سوویت جمہوریاؤں کی ٹیم ہر لحاظ سے ''بڑی'' ثابت ہوئی۔ چار جمہوریاؤں نے کل 332 ایتھلیٹس بھیجیں۔ ان میں سے زیادہ تر دراز قامت اور گوری تھیں۔ وہ ملائشیا، پاکستان، مالدیپ اور بنگلہ دیش سے آئے ہوئے چھوٹے سکواڈز کی لڑکیوں کے درمیان نمایاں نظر آ رہی تھیں۔

کچھ لڑکیاں قومی چیمپئن اور ایک یادو اولمپیئن تھیں۔ لیکن 122 رکنی ایرانی سکواڈ کی شوٹنگ ٹیم کے سوا تمام ایتھلیٹس کا کسی بین الاقوامی مقابلے میں شرکت کا یہ پہلا موقعہ تھا۔ 12,000 سیٹوں والے آزادی سٹیڈیم میں مارچ کرتے ہوئے ان کے چہرے نقاب کے نیچے دمک رہے تھے۔

کھیلوں کے دوران مردوں کو شوٹنگ رینج کے سوا تمام سٹینڈز سے نکال دیا گیا۔ سوئمنگ کمپلیکس میں سکول کی لڑکیاں تماشائیوں کے بنچوں پر بیٹھی منی سکرٹس اور سبز ٹی شرٹس میں ملبوس ایرانی لیڈی ججوں کا نامانوس نظارہ کر رہی تھیں۔

ٹریک سٹیڈیم میں مشتعل بردار پدیدہ نے اپنا حجاب اتار کر کالی لائکرا شارٹس پہن لیں اور ہائی جمپ میں اپنی بہترین کارکردگی دکھائی۔ اس کی 1 67 میٹر اونچی جمپ کرغیزستانی چیمپئن کو نیچا

دکھانے کے لیے کافی نہ تھی، لیکن اس نے انقلاب سے پہلے کے دور میں قائم کیا گیا ایرانی ریکارڈ توڑ دیا۔ اس دوپہر کو ایتھلیٹس کے ہوٹل میں پدیدہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھی۔ 400 میٹر ریس کی ہیٹس میں وہ آخری چار کھلاڑیوں میں شامل ہوگئی تھی، اور اسے قوی امید تھی کہ اگلے روز میڈل جیت لے گی۔

اگرچہ شاہی دور میں پدیدہ کی ماں کھلاڑی رہ چکی تھی، لیکن پدیدہ کی پرورش عورتوں کی علیحدہ سپورٹس کے تصور سے عاری ماحول میں ہوئی۔ اس نے تماشائیوں کے سٹینڈز کی جانب ہاتھ لہرا کر کہا، "یہ ہمارے لیے بہت خوب صورت ہے۔ ہمارا سوچنے کا انداز، ہماری ثقافت کی طرز یہی ہے۔ اب مردوں کے سامنے مقابلہ بازی کرنا ہمارے لیے مشکل ہوگا۔"

ایتھلیٹس کے آس پاس منڈلاتی ہوئی سرکاری مترجمین بات چیت میں مدد دے رہی تھیں۔ ہر مترجم عورت نے معمول کا ایرانی لباس پہن رکھا تھا — کالا سرپوش اور لمبا عبایہ — لیکن ایتھلیٹس والی شوخ رنگ وارم اَپ جیکٹ کے ساتھ۔ انگلش بولنے والی مترجمین کے لیے ارغوانی اور سبز رنگ؛ روسی بولنے والیوں کے لیے گلابی اور پیلا؛ اور عربی بولنے والیوں کے لیے ہلکا سبز اور نیلا آسمانی رنگ۔ گفتگو فارسی سے اردو اور اردو سے انگلش میں منتقل ہوتے ہوئے ہوٹل کی لابی ایک خوشگوار زنانہ بھنبھناہٹ سے بھر گئی۔ مجھے اپنے ہائی سکول کا وہ سپورٹس ڈے یاد آ گیا جو صرف لڑکیوں کے لیے تھا۔

لیکن ایک کونے میں بیٹھے مرد کسی نوجوان خاتون مترجم کی مدد کے بغیر روسی زبان میں ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔ آذر بائیجانی ٹیم مینجر Alyev مسلم نے ایلیویٹر کے انتظار میں دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر آہ بھری جس پر "صرف مردوں کے لیے" لکھا تھا۔ ایتھلیٹس پر قابو رکھنا اسے بہت مشکل لگ رہا تھا جو صبح سویرے صرف خواتین والی بسوں میں سوار ہو کر سپورٹس ایرینا میں چلی گئیں اور مردوں کو اندر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ کرغیزستانی والی بال کوچ اپنی ٹیم کے میچوں کے دوران باہر کھڑا انتظار کرتا رہتا کہ کب کوئی عورت سکارف اوڑھ کر بھاگتی ہوئی باہر آئے اور صورت حال بتا کر آئندہ حکمت عملی پوچھے۔ Alyev نے کاندھے اچکائے "اگر ہم بورڈ کو دیکھے بغیر شطرنج کھیل سکتے ہیں تو اس میں بھی ایسا کیوں نہیں ہو سکتا؟"

میں نے سوچا کہ وہ میچوں میں جانے کی اجازت نہ ملنے کی وجہ سے بور ہو رہا تھا۔ لیکن اس

نے بتایا، ”ہرگز نہیں۔ ان قواعد کی وجہ سے اپنی ٹیم کو درپیش مسائل نے مجھے گھیر رکھا ہے۔“ کچھ عورتیں اپنے پھولدار سکارف بار بار سر سے پھسل جانے کے باعث ایرانیوں کی پھٹکار کا نشانہ بنیں۔ ”لگتا ہے کہ یہاں سب سے بڑی خطا کسی کو اپنے بال دکھانا ہے۔ لیکن اگر خدا کو یہ بات پسند نہیں تھی تو اُس نے آپ کو آنکھیں ہی کیوں دیں؟“ دیگر نے اس اصول پر افسوس کا اظہار کیا کہ ایونٹس کے درمیان وقفے میں وہ اکیلی شہر میں گھوم پھر نہیں سکتیں۔ ایرانی حکام نے اپنی مہمان خواتین کی جانب حد سے زیادہ حفاظتی رویہ اختیار کر رکھا تھا۔ وہ اصرار کرتے کہ وہ صرف آفیشل بسوں میں سفر کریں اور صرف ایک آفیشل مترجم ساتھ رکھیں۔ کسی بھی وقت تہران کی گلیوں میں گھومنے پھرنے والا شخص اس اصول کو بیوقوفانہ خیال کرے گا۔ تہران کسی تنہا عورت کے لیے دنیا کے محفوظ ترین شہروں میں سے ایک تھا۔

مرشدہ مستقیم نے بھی اس اصول کو کافی احمقانہ تصور کیا۔ اس نے ایک بندوق بردار انقلابی گارڈ کو حیران کر دیا جس نے اسے ہوٹل کے دروازے سے باہر نکلنے سے روکنا چاہا تھا۔ اس نے کہا: ”میں نے اسے بتایا کہ میں ملائشیائی پولیس فورس کی ریٹائرڈ سپرنٹنڈنٹ ہوں اور سارے کیریئر کے دوران اس جیسے لڑکوں کو احکامات دیتی رہی ہوں۔ پھر میں نے اسے اپنے راستے سے ہٹنے کو کہا۔“ دراز قد اور چوڑی چکلی عورت مرشدہ شوٹنگ ٹیم کی سربراہ کی حیثیت میں تہران آئی تھی اور ٹیم میں شامل تمام خواتین کا تعلق ملائشیا کے محکمہ پولیس سے تھا۔

اس کی نظر میں ایران اور سعودی عرب جیسے ممالک، جہاں وہ حج کے سلسلے میں آئی تھی، میں آنا ماضی کی سیر کرنے جیسا تھا۔ اس کی زندگی میں ہی ملائشیا اسلام کے عقائد پرستانہ نکتہ نظر سے ہٹ گیا تھا۔ اس نے بتایا: ”جب میں بچی تھی تو سپورٹس کے لیے لڑکیوں کا بے پردہ ہونا کافی مشکل کا باعث تھا۔“ ملائشیا کا روایتی ملبوس سرانگ (Sarong) تہران میں حجاب کے مساوی نہ تھا، لیکن رجعت پسند اہل ملایا کے خیال میں اس کی ٹخنوں تک لمبائی مسلم پردے کا تقاضا کافی حد تک پورا کرتی تھی۔ مرشدہ ہرڈل ریسر رہ چکی تھی۔ ”میں ریس شروع ہونے سے چند لمحے قبل اپنا سرانگ اتارتی، شارٹس میں ریس دوڑتی اور پھر فنش لائن پہ پہنچتے ساتھ ہی دوبارہ سرانگ باندھ لیتی۔“ اس نے بتایا کہ آج کل بیشتر ملائشیائی مسلمان عقیدے کے معاملے میں کشادہ نظر ہو گئے تھے اور وہ عورتوں کے مرضی کا لباس پہن کر معاشرے میں مردوں کے شانہ بشانہ کام کرنے کا حق بھی قبول

کرنے لگے تھے۔ لیکن اس کا دور دراز ملک اسلامی لہر کے اثرات سے بالکل محفوظ نہ رہا اور بہت سی نوجوان لڑکیاں سر اور جسم کے بالائی حصے کو ڈھکنے لگی تھیں۔ ملائشیا کی ایک ریاست کیلنتن کے مقامی ووٹروں نے حال ہی میں ایک بنیاد پرست ذیلی ریاست کی بنیاد رکھی تھی جس میں ڈیٹ پر جانے والے غیر شادی شدہ جوڑوں کو پکڑنے کے لیے ''اخلاقی چھاپے'' مارے جاتے۔

میں بس میں مرشدہ کے ساتھ بیٹھ کر ایرانیوں کے ایک آفیشل دورے پر گئی: آیۃ اللہ خمینی کے مقبرے کی زیارت۔ زیادہ تر تفریحی دوروں کا عنوان ملتا جلتا تھا: رشد وہدایت کے میوزیم (سابقہ شاہی محل) کا دورہ، ''اسلامی نظام میں عورتوں کا وقار اور عظمت'' کے زیرعنوان ایک نمائش کا دورہ۔ خمینی کے طلائی گنبد والے مقبرے کی جانب طویل ڈرائیو پر بسوں کی روانگی سے قبل چادر پوش ایرانی حکام کلینیکس (ٹشوز) کے ڈبے لیے اندر آئیں۔ پہلے میرے دماغ میں یہ فضول سوچ آئی کہ وہ خمینی کی قبر پر ہمارے بے اختیار نکلنے والے آنسو پونچھنے کی خاطر ہمیں ٹشوز سے مسلح کرنے آئی ہیں۔ لیکن جب معلوم ہوا کہ ان کی پریشانی کی وجہ کچھ غیر ایرانی ایتھلیٹس کے ہونٹوں پر لگی ہوئی لپ سٹک تھی۔ مرشدہ نے ٹشو پکڑا اور سرخی لگے ہونٹوں پر پھیرتے ہوئے بولی: ''یہاں ٹھہرنے کے حوالے سے ایک بات اچھی ہے۔ میں نے میک اپ کی کافی بچت کر لی ہے۔''

لیکن ٹریک ایونٹس کے آخری روز میک اپ سے عاری ایتھلیٹس اور حکام بسوں سے اتر کر سٹیڈیم کے دروازے میں داخل ہوئیں اور فوراً اپنے حجاب اتار پھینکے۔ وہ خواتین کے چینجنگ لاؤنج کی جانب دوڑیں تاکہ پاؤڈر اور مسکارا تھوپ سکیں۔ ہر خاتون بہترین نظر آنا چاہتی تھی کیونکہ ایک کیمرا وومن کھیلوں کی ویڈیو ٹیپ ریکارڈ کر رہی تھی۔ یہ فلم ایران بھر میں عورتوں کے اجتماعات میں دکھائی جاتا تھی۔

ایرانی رنر پدیدہ 400 میٹرز کے فائنل میں میڈل جیتنے کی امید لیے اکیلی بیٹھی تسبیح کر رہی تھی۔ گزشتہ رات میں نے ایک پاکستانی رنر کی دلجوئی کی جو اپنے بہترین ایونٹ کے فائنل میں پہنچنے کا موقع کھو بیٹھی تھی۔ وہ بہت دکھی ہوئی، لیکن اگلے روز ایشین گیمز یا چین ایشین گیمز یا کوئی نصف درجن دیگر مقابلوں میں کامیابی کے متعلق سوچنے لگی جن میں اسے آئندہ ایک یا دو سال کے دوران شرکت کرنا تھی۔

پدیدہ کا سب کچھ اس ایک مختصر سی ریس پر منحصر تھا۔ اسے کسی بین الاقوامی مقابلے کا اگلا چانس

چار سال بعد منا تھا۔ جب وہ سٹارٹنگ لائن پر جھکی ہوئی تھی تو اس کا دبلا پتلا جسم ترکمانستان، کرغیزستان اور آذربائیجان کی تنومند ایتھلیٹس کے مقابلے میں کافی نازک لگ رہا تھا۔ پسٹل کی آواز آنے پر وہ تیزی سے بھاگ کھڑی ہوئی تو اس کے لمبے لمبے قدم تنومند حریفوں کا مقابلہ کر رہے تھے۔

لیکن یہ مقابلہ ایک مختصر التباس ثابت ہوا۔ تین تہائی ریس مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ پیچھے رہ گئی اور ابتدائی کوشش کی تھکن چہرے پر ظاہر ہونے لگی۔ پدیدہ کو ٹریننگ کی سہولت صرف یونیورسٹی کلاسز کے درمیان میسر تھی قریبی سٹیڈیم کے نہایت مختصر خواتین کے اوقات میں۔ اس نے کبھی وزن نہ اٹھایا تھا اور نہ ہی کسی پروفیشنل کوچ سے تربیت لی تھی۔ وہ جیتنے والی ایتھلیٹ سے تین سیکنڈ اور تیسرے نمبر والی ایتھلیٹ سے دو سیکنڈ پیچھے رہی اور فنش لائن پر گر پڑی۔ اس نے دکھ اور مایوسی کی سسکیوں کے درمیان سانس لینے کے لیے منہ کھولا۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ کسی مختلف جگہ اور مختلف وقت پر چیمپئن بن سکتی تھی، ایک ایسے نظام میں جہاں پردے پر کم اور باضابطہ تربیت پر زیادہ تربیت دی جاتی ہو۔ لیکن 400 میٹرز میں اس کا دورانیہ مقابلہ جیتنے کے لیے بہت ناکافی ہونے کے باوجود اپنے سابقہ ذاتی ریکارڈ سے آٹھ سیکنڈ بہتر تھا۔

گیمز کی اختتامی تقریب کے بعد الوداعی ڈنر کے موقع پر پدیدہ کی حالت کچھ بحال ہوئی اور وہ ایرانی ریلے (Relay) ٹیم کے لیے اپنے جیتے ہوئے کانسی کے تمغے کے متعلق فخر مندانہ انداز میں بات کرنے لگی: ''یقیناً ذاتی تمغہ جیتنے کا مجھے بہت شوق تھا۔ اور اب میں وہ کبھی حاصل نہیں کر سکوں گی۔'' میں نے اسے یاد دلایا کہ پاکستان اور آذربائیجان دونوں نے چار سال کے اندر اندر عورتوں کی اسلامی کھیلیں منعقد کروانے کی بات کی تھی۔ شاید وہ تب کامیاب ہو جاتی۔

اس نے اپنا سر نفی میں ہلایا اور اداس انداز میں مسکرا کر ایک طرف دیکھتے ہوئے بولی: ''نہیں۔ شاید کوئی اور جیت لے گی۔ میرے خیال میں مجھے کافی دیر ہو چکی ہے۔''

گیارہواں باب

ایک مختلف ڈھول نواز

قاہرہ سٹیج کی سب سے مشہور عورت سوہیر البابلی (Soheir el-Babli) ہر لحاظ سے مکمل لگتی تھی۔ اپنے فنکاروں سے ہمیشہ محبت کرنے والے شہر میں وہ مقبول ترین تھی۔ 700 نشستوں والے مصر آرٹ تھیٹر میں اس کا مرکزی کردار بطور "عطیہ، دہشت گرد عورت" دیکھنے کے لیے لوگ جوق در جوق اندر آ رہے تھے۔

جولائی 1993ء میں کھیل اپنا دوسرا سیزن شروع کرنے والا تھا کہ اس نے سب کچھ چھوڑ دیا۔ اس نے کہا کہ وہ شوبزنس چھوڑ کر اسلامی پردہ اختیار کرنے جا رہی تھی۔

سوہیر کی ریٹائرمنٹ خواتین آرٹسٹوں کی ایک لہر کا حصہ تھی جو 1980ء کی دہائی کے اواخر میں قاہرہ کی بیلی ڈانسرز سے شروع ہوئی۔ جلد ہی درجنوں گلوکاراؤں اور اداکاروں نے بھی اپنے مختصر آرائشی لباس اتار پھینکے، میک اپ صاف کیا، حجاب پہنا اور اپنے سابقہ ناظرین کو آرٹسٹوں کی دنیا کی برائیوں کے متعلق وعظ کرنے لگیں۔ 1992ء کے موسم بہار میں ایک ایسی بات ہوئی جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا: رمضان کی شبینہ محفلوں میں جان ڈالنے والے موسیقی کے پروگرامز کو غیر اسلامی قرار دے کر پابندی عائد کر دی گئی۔ سینکڑوں آرٹسٹ بیکار ہو گئے۔

لیکن جب سوہیر نے استعفیٰ دیا تو آرٹسٹوں کی دنیا نے ردعمل دیا۔ کھیل کا پروڈیوسر ڈائریکٹر سکرپٹ پر نظر ثانی کر کے اسلامی انتہا پسندوں کی جانب سے بم مارنے کی حالیہ لہر کے حوالے بھی

شامل کر چکا تھا۔ اُس نے سوہیر کی جگہ پرانیس سالہ بیٹی کو منتخب کیا جو قاہرہ کی امیریکن یونیورسٹی میں طالبہ تھی۔ اسے صرف سٹوڈنٹ پروڈکشنز میں کام کرنے کا تھیسٹری تجربہ ہی تھا۔

کھیل دوبارہ شروع ہونے کی رات مصری دنیائے فن کی جانی پہچانی شخصیات بھی ان کی حمایت کرنے نکل کھڑی ہوئیں۔ یہ ایک جوابی تحریک کا آغاز تھا: آرٹسٹ پہلی مرتبہ مذہبی جذبے کے تحت ریٹائرمنٹوں اور تفریح پر بنیاد پرستوں کے دباؤ کے خلاف تنقید کا سامنا کرنے کی خاطر اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ قاہرہ میں ایک لطیفہ زبان زد عام ہو گیا: مصر میں دوسرے نمبر پر سب سے زیادہ معاوضہ لینے والی عورتیں کونسی ہیں؟ یقیناً بیلی ڈانسرز، کیونکہ سعودی سیاح رقص کے دوران ان کے پیروں تلے سو سو ڈالر کے نوٹ پھینکتے ہیں۔ بہترین معاوضہ لینے والی کون ہیں؟ یقیناً وہ رقاصائیں جو اللہ کی خاطر ریٹائر ہو گئی ہوں، کیونکہ سعودی شیخ ان کا رقص بند ہونے پر ہزار ہزار ڈالر کے نوٹ اپنے بینک اکاؤنٹس میں ڈال دیتے ہیں۔

اچانک نقاب اوڑھنے کی تمام مثالیں کافی حد تک ایک جیسی تھیں۔ ایک مشہور خاتون اداکارہ شیخ محمد شراوی کے مقبول ٹیلی ویژن پروگرام میں آئی۔ وہاں اُس نے اپنے سابقہ پیشے کو غیر اسلامی قرار دے کر مسترد کیا، بوڑھے شیخ کے ہاتھوں سے حجاب لے کر پہنا اور دعائیں وصول کیں۔

بدگمان مصریوں کو یقین تھا کہ سعودیوں نے آرٹسٹ خواتین کو خریدنے کے لیے شراوی کو خصوصی رقم دی ہے۔ مصر کی نہایت بے باک نسوانیت پسند نوُل سعدوی نے پوچھا، ''اگر پیسہ ملوث نہیں تو وہ کام ٹیلی ویژن پر کیوں کرتی ہیں؟ اللہ کو گواہ بنا کر گھر میں کیوں نہیں کرتیں؟''

نیا نیا حجاب اختیار کرنے والی عورتیں یقیناً خاصی دولت کی مالک نظر آتی تھیں۔ ایسی چند ابتدائی عورتوں میں سے ایک، شمس البرودی نے اُن فلموں کے کاپی رائٹس خریدنے پر کافی رقم خرچ کی جن میں وہ نیم برہنہ اور باتھ ٹب کے ایک بے باک سین میں تقریباً ننگی ظاہر ہوئی تھی۔ اس نے کہا کہ وہ چاہتی ہے کہ یہ فلمیں دوبارہ کبھی نہ دکھائی جائیں۔ اس نے اپنی پرانی فلموں کے حقوق خریدنے کے لیے استعمال ہونے والی رقم کے ذرائع پر بات کرنے سے انکار کر دیا، لیکن قاہرہ کے فلمی حلقے میں اڑتی ہوئی ایک خبر کے مطابق ایک ممتاز مذہبی رہنما نے اسے رقم دی تھی۔

نوُل سعدوی نے بدگمانی کے ساتھ نشان دہی کی کہ زیادہ تر عورتیں بطور اداکارہ یا رقاصہ اپنے زمانۂ عروج سے گزر چکی تھیں۔ ''وہ جانتی ہیں کہ جلد ہی انہیں ریٹائر ہونا پڑے گا۔ تو کیا یہ اچھا نہیں

کہ تالیوں کی گونج میں ایسا کیا جائے؟ آپ نے گلیوں بازاروں میں لطیفہ سنا ہوگا۔لوگ کہتے ہیں کہ ان رقاصاؤں نے جوانی میں گناہ سے دولت کمائی اور اب بڑھاپے میں غریبوں کے ساتھ بہشت کا مزہ لوٹنا چاہتی ہیں۔''

لیکن نُول کی اپنی الجھن پردے کے پیچھے جانے کے لیے ایک اور توضیح فراہم کرتی تھی۔ 1960ء کی دہائی میں ایک ماہر نفسیات اور سینئر سرکاری افسر صحت کی حیثیت میں اُس نے مصری عورتوں پر جنسی اعضا کی تقطیع کے جسمانی اور جذباتی اثر دیکھے تھے۔اس کی پہلی کتاب ''Women and Sex'' (1970ء) مسخ شدہ اسلامی تعلیمات پر تنقید تھی جو اس کے خیال میں عورتوں کی زندگیاں برباد کرنے کی ذمہ دار ہیں۔اپنی نوکری سے ہاتھ دھونے اور تین ماہ جیل میں گزارنے کے باوجود وہ تیس سے زائد کتب میں ممنوعہ موضوعات پر لکھتی رہی۔اس نے بچپن میں کلائیٹورس کٹوانے کے صدمے کو بیان کیا اور بتایا کہ کیسے وہ ہیجان شہوت کے قابل نہیں رہی تھی۔اس نے قاہرہ کے سرجیکل وارڈز میں شادی سے قبل پردہ بکارت دوبارہ لگوانے کی طلب کے بارے میں لکھنے کے علاوہ مصری گھرانوں میں محرمات سے مباشرت کی وبا سے پردہ اٹھایا۔

اخبارات اور عوامی اجتماعات میں اس نے بارسوخ شیوخ پر حملے کیے۔اپنے ایک ٹیلی ویژن پروگرام میں شیخ شراوی نے ان لوگوں کو طعن وتشنیع کی جو قرآن کی مترنم تلاوت کی بجائے مغربی کلاسیکی موسیقی کی لوری سن کر سونے کو ترجیح دیتے تھے۔ چند روز بعد بالائی مصر میں انتہا پسند نوجوانوں کو ایک کنسرٹ پر ہلہ بولنے اور ساز توڑنے پھوڑنے کے الزام میں گرفتار کیا گیا۔نُول نے ایک اخباری مضمون میں پوچھا کہ حکومت نے نوجوانوں کی بجائے شراوی کو کیوں نہیں گرفتار کیا جس کے نظریات نے ان میں آگ بھڑکائی تھی۔

1992ء کے موسم بہار میں اسلامی جہاد نے نُول سعداوی کے علاوہ مصنف فراغ فودا کو بھی اپنی ڈیتھ لسٹ میں شامل کرلیا۔جب فراغ کو اس کے دفتر کے باہر گولی مار کر ہلاک کیا گیا تو مصری حکومت نے نُول کو فوراً سخت فوجی پہرہ فراہم کر دیا۔سادات حسین کا قاتل مصری فوج کے اندر ہی ایک انتہاپسند اسلامی سیل کا رکن ہونے کا امر ذہن میں رکھتے ہوئے نُول نے اپنے دروازے کے باہر فوجی جوانوں کی موجودگی کو زیادہ تسلی بخش نہ پایا۔اس نے رازداری سے کہا: ''مجھے کسی بھی اور شخص کی نسبت ان سے زیادہ خطرہ ہے۔'' 1993ء میں اس نے جلاوطنی اختیار کرلی اور امریکہ کی

ڈیوک یونیورسٹی میں وزیٹنگ پروفیسر بن گئی۔

نول نے دلیل دی کہ اگر مصنفین نشانہ بن رہے تھے تو جلد یا بدیر کم سیاسی آرٹسٹ بھی براہ راست حملے کی زد میں آئیں گے۔ اپنا پیشہ ترک کر دینے والی رقاصاؤں نے اکثر بتایا کہ کیسے سٹیج چھوڑنے کے بعد انہیں لاحق تشویش اور خوف کی جگہ ایک سکون اور طمانیت نے لے لی تھی۔ ایک مشہور رقاصہ ہلالہ الصفی نے ایک خواب کے بارے میں بتایا: اس نے خود کو ایک مسجد کی طرف جاتے ہوئے اور خوف میں مبتلا دیکھا کیونکہ وہ موزوں لباس میں نہیں تھی: اچانک ایک آدمی نے اپنا جبہ اتار کر اسے ڈھک دیا۔ نول نے نشان دہی کی کہ ہلالہ کے خواب میں خوف کی تعبیر مذہبی انتہا پسندوں کی جانب سے دباؤ کے نتیجے میں تحت الشعوری ردعمل کے طور پر کرنے کے لیے ماہر نفسیات ہونا ضروری نہیں تھا۔

1993ء میں نول کی پیش گوئی درست نکلی۔ جب فریدہ سیف النصر نے ریٹائرمنٹ لینے کے بعد واپس شوبزنس میں آنے کا فیصلہ کیا تو کسی نامعلوم حملہ آور نے شاٹ گنز کے فائر کر کے اسے مار ڈالنے کی کوشش کی۔

میرے دفتر میں سحر کسی آرٹسٹ کے حجاب اختیار کرنے کی ہر نئی کہانی کا مزہ لیتی۔ ایک صبح اس نے مجھے مقامی اخبار کی ایک خبر دکھائی جس میں ایک مشہور رقاصہ نے حج بیت اللہ کی تمنا ظاہر کی تھی۔ مذہبی حکام نے اسے رقص کا پیشہ چھوڑنے تک درکار دستاویزات جاری کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ سحر نے ان کے فیصلے کو درست قرار دیا۔ ''وہ گناہ سے کمائی ہوئی دولت خرچ کر کے خود حج کرنے کیوں نہیں چلی جاتی؟''

لیکن میں مصر کے خوب صورت روایتی رقص کو برباد ہوتے دیکھ کر متاسف تھی۔ میں نے مصری رقص پہلی مرتبہ نیل ہلٹن نائٹ کلب میں ایک کھانے کی دعوت میں دیکھا تھا۔ اہل مصر رات گئے تک جاگتے ہیں۔ میں سارے ڈنر کے دوران اپنی نیند کو قابو میں رکھنے کی کوشش کرتی رہی، لیکن رقص شروع ہوتے ہی ساری تھکن بھول گئی۔

سوہیر زکی آواز کی لے پر لہرا رہی تھی۔ اس نے نفیری کے سروں کا زیر و بم اپنے بدن سے بیان کیا۔ عرب موسیقی مجھے پہلی مرتبہ سمجھ آئی۔ میں اس موسیقی کو دیکھ سکتی تھی۔ اس کے علاوہ کچھ اور

بھی نظروں کے سامنے تھا: ایک عورت کے جسم کا حسن جو نہ زیادہ جوان تھی نہ دبلی پتلی۔ سو ہیر زکی قاہرہ میں مشہور ترین رقاصہ تھی، لیکن ابھی پورے تیس کی نہیں ہوئی تھی۔ اس کے کولہوں پر گوشت چڑھا ہوا تھا، پیٹ پکی ہوئی خوبانی کی طرح آگے کو نکلا تھا۔ مَیں نے اس سے پہلے کبھی مشرقی روایتی رقص نہیں دیکھا تھا، لیکن ایک ایک حرکت کو جان گئی۔ اس کے جسم کی حرکات عورت کے جسم والی تھیں ــــ جنس اور زچگی کی فطری حرکات۔ رقص نظروں کو کولہوں اور پیٹ کی جانب کھینچتا تھا؛ نسوانی بدن کے عورت پن کا مرکز۔

لڑکپن میں مَیں نے مغربی بیلے کی نہایت غیر فطری حرکات سیکھی تھیں، بیلے ڈانس کا مقصد جسم کو ہوا جیسا لطیف دکھانا تھا۔ یہ ڈانس عورت پن کی نفی تھا، جس کے لیے بالغ رقاصاؤں کو اپنا جسم نابالغ لڑکیوں جیسا رکھنا پڑتا۔ چودہ سال کی عمر میں سٹوڈیو (جہاں میں بیلے سیکھنے جاتی تھی) ایک اندوہناک جگہ بن گیا؛ تمام لڑکیاں جانتی تھیں کہ وہ کبھی بیلرینا نہیں بن سکیں گی۔ ان کے جسموں نے عورت پن کی جانب جھکاؤ اختیار کر کے انہیں دھوکا دے دیا تھا۔ مَیں نے فیصلہ کیا کہ مصر کو الوداع کہنے سے پہلے یہ زیادہ قدیم رقص سیکھنے کی کوشش کروں گی جس کی ہر حرکت عورت کے حقیقی بدن کی ستائش کرتی تھی۔

مذہبی دباؤ پہلے ہی قاہرہ کی رقاصاؤں کو صرف ایک حصے پر مشتمل لباس پہننے پر مجبور کر چکا تھا جس کے باعث سینہ ڈھکا رہتا۔ جسم کی بہت زیادہ نمائش کرنے والی کوئی بھی چیز پولیس کے ایک خصوصی سکواڈ کا چھاپہ یقینی بنا دیتی۔ اخبارات میں گاہے بگاہے چھپنے والی خبریں نائٹ کلبوں پر چھاپوں کی دستاویز تھیں جہاں رقاصاؤں کی حرکت بہت زیادہ شہوت انگیز یا ملبوسات جسم کو عیاں کرنے والے تھے۔ خاص طور پر سحر حامدی نامی ایک رقاصہ کو ہمیشہ جیل میں بند کیا جاتا۔ اخبارات پر نظر ڈالتے ہوئے سحر اپنی ہم نام رقاصہ کی خبریں پڑھ کر سناتی اور ساتھ ساتھ ناپسندیدگی کے انداز میں سر ہلاتی رہتی۔ سحر حمدی امیر کبیر سعودی سیاحوں کی من پسند تھی۔ کچھ راتوں کو وہ نوٹوں سے بھرے ہوئے سٹیج پر رقص کرتی اور تھکے ہوئے پیر سعودیوں کی شیمپین سے دھلواتی۔ لیکن 1993ء میں غالباً اس نے بھی نورِ صداقت کی جھلک دیکھ لی اور مذہب کی خاطر ریٹائرمنٹ لینے کی باتیں کرنے لگی۔

رقاصاؤں کے گوشہ نشینی اختیار کرنے کی رفتار سے غیر مطمئن بنیاد پرست بیلی ڈانس پر فی الفور

پابندی لگانا چاہتے تھے۔ لیکن بیلی ڈانس ہر موسم گرما میں خلیجی ریاستوں سے قاہرہ آنے والے دولت مند عربوں کا پسندیدہ مشغلہ تھے۔ دونوں دھڑوں کو مطمئن کرنے کی خاطر حکومت نے اپنے مشہور نیم اقدامات میں سے ایک پیش کیا۔ اس نے کلاسیکی لوک کے سوا کسی بھی اور نئی رقاصہ کو پرمٹ جاری کرنا بند کر دیے، لیکن رقص پر پابندی نہ لگائی۔ جب میں نے اس مسئلے پر ایک مضمون لکھنے کا فیصلہ کیا تو سحر فرش کو گھورنے لگی اور منہ سے کچھ نہ بولی۔ ''کیا تم چاہتی ہو کہ میں اُس کا ترجمہ کرنے کے لیے کسی اور کو تلاش کروں؟'' میں نے پوچھا۔ سحر نے ہاں میں سر ہلا دیا۔ وہ قاہرہ کے نائٹ کلبوں میں جانے یا رقاصاؤں سے گفتگو کرنے پر تیار نہ تھی۔ ایک مرتبہ اُس نے مجھے بتایا تھا کہ سوہیر زکی نے اُس کے والدین کی شادی پر رقص کیا تھا۔ اب وہ سوہیر کے جسم کی نمائش کرنے کے انداز کو باعث گناہ خیال کرتی تھی۔

لیکن خود سحر بھی کبھی کسی اور کبھی کسی چیز پر پابندی لگائے جانے کے مطالبات سے مطمئن نہ تھی۔ وہ مذہب کو ایک نجی معاملہ سمجھتی تھی جسے سیاسی رنگ نہیں دینا چاہیے۔ اس کا خواہش کردہ اسلامی انقلاب جبر کی بجائے لوگوں کو آہستہ آہستہ تربیت دینے کے ذریعے بپا ہونا تھا۔ یہ رویہ مصر میں غالب رہا تھا اور غالباً اس نے ملک کو کافی فائدہ بھی پہنچایا۔ قاہرہ میں شراب خریدنا بہت آسان تھا، لیکن میرے مصری دوستوں میں سے کوئی بھی شرابی نہیں تھا۔ سعودیوں کو مذہبی پولیس گھیر کر مساجد میں لاتی تھی، جبکہ مصری لوگ خود بخود مساجد میں چلے جاتے تھے۔ بہت سوں کی پیشانیوں پہ مستقل محراب کا نشان تھا جو سجدے کرتے رہنے کی وجہ سے پڑتا ہے۔

اگر بیلی ڈانس پر پابندی لگ جاتی تو یہ چیز ایک پریشان کن مثال بنتی اور مزید اسلامی پابندیوں کے لیے مطالبات میں شدت آجاتی۔ نئے قوانین کی سنگینی کا اندازہ کرنے کی خاطر میں ڈیپارٹمنٹ آف آرٹس انسپکشن میں ایک افسر محمود رمضان سے ملنے گئی۔ وہ رقاصاؤں کا چیف انسپکٹر رہ چکا تھا، وہ ایسی فنکاراؤں کو پرمٹ جاری کرتا تھا جن کے لباس اور رقص کا انداز شہوانی نہ ہوتا۔ اُس نے آہ بھری، ''اُن دنوں میرا کام بہت زبردست تھا۔'' اُس نے مصر کی تمام بڑی رقاصاؤں کے فن کا مظاہرہ دیکھا تھا۔ محمود کے خیال میں اصل ستارے 1950ء کی دہائی کے دوران چمکے تھے جب ہر مصری فلم میں بیلی رقص کا ایک سین شامل ہوتا۔ رقاصاؤں کو پوجا جاتا تھا اور انہیں سٹیج پر یا شادی کی بڑی بڑی تقاریب میں صرف ایک رات کے لیے تین ہزار پاؤنڈ تک

معاوضہ دیا جاتا۔

اب محمود اُن عورتوں کو بوڑھا ہوتے اور نئی رقاصاؤں کو ان کی جگہ لینے میں ناکام ہوتے دیکھ رہا تھا۔ ''اگلی نسل اُن جتنی اچھی نہیں، اور ان کے بعد۔۔۔'' اپنے سامنے خالی ڈیسک کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اُس کی آواز مدھم ہوگئی۔

پابندیوں کی وجہ سے ان رقاصاؤں کے ملبوسات تیار کرنے والی عورتوں کا ٹولہ بھی خطرے میں پڑ گیا۔ مصر میں مشہور ترین ملبوسات ساز کاریگر وسیع وعریض خان الخلیلی بازار کی ایک چھوٹی سی گلی میں رہتی تھیں۔ اندر موتیوں، سلمے ستارے اور زرق برق کپڑوں کا چمکدار ڈھیر چھت کو چھو رہا ہوتا۔ گاہک تصویر کی ایک کتاب میں سے ڈیزائن منتخب کر سکتے تھے۔ ایک بوڑھی درزن گاہکوں کا ناپ لیتی۔ اس نے تاسف کے ساتھ کہا، ''اب کوئی مصری نہیں آتا۔'' اس روز فن لینڈ اور جرمنی کی دو عورتیں اس کی گاہک بنی تھیں۔ میں موتیوں کی میچنگ کر رہی تھی کہ ایک اور عورت اندر داخل ہوئی۔ اس نے بوجھل عربی لہجے میں درزن سے بات کی۔ مَیں نے انگلش میں پوچھا: ''ایکسکیوز می، کیا آپ اسرائیلی ہیں؟''

وہ بولی: ''ہاں، مَیں آج ہی بذریعہ بس یروشلم سے آئی ہوں۔'' مصر اور اسرائیل کے درمیان امن معاہدہ ہونے سے قبل اُسے ملبوسات خریدنے کے لیے یورپی دوستوں کو بھیجنا پڑتا تھا۔ اس نے بتایا: ''ناپ کبھی ٹھیک نہیں ہوتا تھا۔ میرے فن کو تو امن کا بہت فائدہ ہوا ہے۔'' اسرائیل میں بنیاد پرست یہودیوں کی جانب سے اُسے کوئی خاص پذیرائی نہیں مل رہی تھی۔ بنیاد پرست مسلمانوں کی طرح وہ بھی بیلی ڈانس پر پابندی لگوانا چاہتے تھے۔ انہوں نے ایسے ہوٹلوں کا کاشروت (Kashruth) سرٹیفکیٹ کھانا یہودی قانون کی مطابقت میں تیار کیے ہونے کی سند منسوخ کرنے کی دھمکی دی تھی جہاں وہ فن کا مظاہرہ کیا کرتی تھی۔ خود بھی ایک راسخ العقیدہ یہودی کی بیٹی ہونے کے ناتے وہ ربیوں کے ساتھ بہت کم بردباری سے کام لیتی۔ ''یہ رقص ہمارے ثقافتی ورثے کا جزو ہے۔ غالباً موسیٰ کی ماں اس سے واقف تھی۔ ہم ان بڈھوں کو اجازت نہیں دے سکتے کہ وہ ہمیں اسے ترک کرنے کا کہیں۔''

گھر واپس آکر میں نے اپنے خریدے ہوئے ملبوسات کھولے: رقص کی پریکٹس کے لیے ایک سستا لباس، سکرٹ، بیلٹ اور برا۔ میں لباس کو دیکھ رہی تھی کہ سحر دفتر میں سے نکل کر یونہی

بیڈ روم میں آگئی۔ مجھے اُس کے چہرے پر ناگواری کا تاثر ظاہر ہونے کا انتظار تھا۔ مگر اُس نے سکرٹ کا شفاف کپڑا اپنی انگلیوں میں مسل کر دیکھا۔

اُس نے پوچھا، ''کتنے کا آیا ہے؟''مَیں نے قیمت بتائی۔

''کیا تم مجھے دکان کا نقشہ بنا کر دے سکتی ہو؟''

''کیوں؟''مَیں نے پوچھا، اور پریشان ہوئی کہ کہیں وہ اپنے بنیاد پرست دوستوں کو وہاں بھجوانے کا تو نہیں سوچ رہی۔

''مَیں بھی ایسا ایک لباس خریدنا چاہتی ہوں۔ مَیں بڑی اچھی رقاصہ ہوں۔ شادی کے بعد اپنے شوہر کے سامنے رقص کروں گی۔''سحر نے بتایا۔

خود ایک رقاصہ بننے کے لیے میری کوشش اچھی نہیں جا رہی تھی۔ مصری لڑکیاں اپنی ماؤں، بہنوں اور خالاؤں کو دیکھ دیکھ کر جس طرح فطری انداز میں چلنا سیکھتیں، اسی طرح رقص کرنے کی صلاحیت بھی حاصل کر لیتی تھیں۔ میرے دوست سید کے گھر میں ایک تین سالہ بچی کولہوں کو حرکت دینا سیکھ چکی تھی۔ سید کی بہنوں نے مجھے سکھانے کی بہتیری کوشش کی مگر کوئی ایسی چیز سکھانا ان کے لیے بہت مشکل تھا جو انہوں نے حقیقتاً خود نہیں سیکھی تھی۔

''تمہیں ایک معلمہ کی ضرورت ہے۔''انہوں نے کہا۔ مصری فنون کی ماہر عورتوں کو عوالم کہتے تھے، وہ رقص کرتی گاتی، ساز بجاتی اور روایات شاگردوں کو منتقل کرتی تھیں۔ چند عشرے پہلے ایک معلمہ ڈھونڈنا بہت آسان تھا۔ دریائے نیل کے کنارے دیہاتی قبیلے صدیوں سے قدیم مصری رقص کی خالص ترین صورت پشت در پشت منتقل کرتے آئے تھے۔ جب یہ گھرانے قاہرہ میں مقیم ہوئے تو ایک فنکار بستی میں قریب قریب رہنے لگے۔ ان کی باقیات اب بھی موجود ہیں، محمد علی سٹریٹ پر جہاں چھوٹی چھوٹی دکانوں میں دستکار نفیریاں بناتے اور ڈھول ساز مچھلی کی کھال سکھاتے ہیں۔ کھلے ہوئے دروازوں میں سے آتی نفیریوں کی فریاد یا ڈھولوں کی تھاپ بتا دیتی ہے کہ کاریگر اپنی مصنوعات کو چیک کر رہا ہے۔

لیکن رقاصائیں معدوم ہو چکی تھیں۔ ایک بوڑھے کاریگر نے کہا، ''وہ پولیس سے تنگ آگئی تھیں۔ پولیس ان سے فاحشاؤں جیسا سلوک کرتی جو ہمیشہ ایک دم یہ دیکھنے کے لیے چھاپہ مار دیتی کہ ان کے کمروں میں کوئی مرد تو موجود نہیں۔''اس نے بتایا کہ آج کل کوئی بھی اپنی بیٹی کو رقص

سیکھنے کی جانب نہیں لگا تا۔'' دباؤ بہت زیادہ ہے۔ لیکن یہ ختم ہو جائے گا۔ ایک روز وہ واپس آ جائیں گی۔'' بوڑھا آدمی اتنا معمر تھا کہ اُس دور میں موجود رہا ہوگا جب یہاں سب کچھ موجود تھا۔ 1850ء میں جب گستاو فلوبیئر قاہرہ آیا تو دیکھا کہ تمام مشہور رقاصاؤں کو شہر سے باہر نکال دیا گیا تھا، کیونکہ گورنر کے خیال میں وہ جسم فروشی کی حوصلہ افزائی کر رہی تھیں۔ اسے فنکاراؤں کی تلاش میں بالائی مصر کی طرف جانا پڑا۔ اس کی یادداشتوں میں لکھا ہے کہ رقاصائیں اس قدر شہوت خیز تھیں کہ سنگت کرنے والے موسیقاروں کو اپنی آنکھیں پگڑی کے پلو میں چھپانا پڑتیں تاکہ ساز بجانے کے قابل رہ سکیں۔

بوڑھے نے اپنے رعشہ زدہ ہاتھ سے اخبار کا ایک کونا پھاڑا اور عربی زبان میں ایک پتا لکھ کر مجھے پکڑاتے ہوئے بولا ''یہاں چلی جاؤ۔ اسے کہنا کہ نفیری ساز نے تمہیں بھیجا ہے۔''

ٹیکسی کوئی ایک گھنٹے تک قاہرہ کی گنجان آبادیوں میں چلتی چلتی شہر کے کنارے تک جا پہنچی جس کے فوراً بعد ایک دم صحرا شروع ہو جاتا تھا۔ اس نے دو آدمیوں سے پتا پوچھا تو دونوں نے بالکل مختلف سمتوں میں اشارہ کیا، جیسا کہ مصر میں ہمیشہ ہوتا ہے۔ انجام کار ہم منزل پر پہنچ گئے: سدا بہار پودوں میں گھرا ہوا ایک صاف ستھرا گھر۔ کم اونچی دیوار کے اوپر سے موسیقی کی مدھم آواز سنائی دے رہی تھی۔ دروازہ کھلا تھا، میں اندر داخل ہوگئی۔ اندر کوئی نصف درجن لڑکیاں اور عورتیں رقص کر رہی تھیں، سر پہ بانس کو متوازن رکھ کر اپنے کولہوں کو تھرکاتی ہوئیں۔ عورتوں نے اشارے سے کہا کہ میں بھی ان کے ساتھ شامل ہو سکتی ہوں۔ میں نے بھی ان کی نقل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی، لیکن ان جیسی رفتار اور لچکیلا پن میری پہنچ سے باہر تھا۔ کوئی ایک گھنٹے بعد میں نے ہار مان لی اور تھک کر ایک کونے میں بیٹھ گئی اور بدستور دوسری لڑکیوں کو دیکھتی رہی۔ واضح طور پر سب سے زیادہ خوب صورت اور باکمال عورت رقص کی قیادت کر رہی تھی۔ اس نے باقیوں کو اپنا انداز یا حرکت درست کرنے کے حوالے سے کچھ بھی نہ کہا، بس خود کر کے سمجھاتی جا رہی تھی۔

آخر کار دیگر عورتوں میں سے ایک بیٹھ گئی اور پانی لینے باہر گئی۔ وہ پسینے میں نہائی ہوئی تھی۔ میں بھی پیچھے پیچھے ہولی تاکہ معلّا کا معلوم کر سکوں۔ اس نے کہا کہ ہم قاہرہ کی ایک محبوب ترین رقاصہ کے گھر میں تھیں۔ لیکن ذاتی وجوہ کی بنا پر اب وہ لوگوں کے سامنے نہیں آتی تھی۔ اس نے بتایا کہ اگر میں رقص سیکھنا چاہتی ہوں تو ہر بدھ اور جمعرات کو دوپہر کے وقت وہ یہاں موجود ہوں گی۔

مجھے اپنی معلمہ مل گئی تھی۔ مَیں جب بھی ممکن ہوا وہاں جانے لگی۔ آہستہ آہستہ میں نے ہر پٹھے کے ہر گروپ کو علیحدہ علیحدہ حرکت دینا سیکھ لیا تاکہ سر پر رکھا ہوا بانس وہیں رہے۔ مَیں نے موسیقی سننا اور اپنے جسم کو اس کی مطابقت میں حرکت دینا سیکھا۔ مجھے بیہودگی کے بغیر اپنے کولہوں کو حرکت دینا اور نمایاں کرنا آ گیا جسے اہلِ مغرب جبلتاً مشرقی رقص کے ساتھ منسوب کر دیتے ہیں۔

مجھے شدید خواہش ہوئی کہ اس ماہرانہ رقص کے خلاف بنیاد پرستوں کی کسی مہم کا سامنا کر سکوں۔ آخر کار مَیں نے بنیاد پرستوں کے دباؤ میں آکر حجاب نہ اختیار کرنے والی رقاصاؤں کے ساتھ جذبہ یگانگت کے تحت قاہرہ میں کسی جگہ بغیر لائسنس فن کا مظاہرہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ مَیں نے اپنے دوست، آسٹریلوی سفیر ایان کو منصوبے سے آگاہ کیا۔ اس نے مایوس ہو کر اپنا سر ہاتھوں میں تھام لیا: ''مجھے صاف دکھائی دے رہا ہے: کسی رات کو دو بجے مجھے ایک پریشان حال آسٹریلوی کی کال سننے کے لیے اٹھایا جائے گا اور وہ تم ہو گی — بیلی رقص کی وجہ سے پکڑی گئی۔''

زیادہ فوری مسئلہ کوئی ایسی معتدل سی جگہ تلاش کرنا تھا جو میری صلاحیت کے مطابق ہو۔ مَیں مشورہ لینے دوبارہ محمد علی سٹریٹ میں گئی۔ ایک نوجوان ڈھول ساز سے میرا کافی دوستانہ ہو گیا تھا۔ وہ Lucy نامی ایک مشہور رقاصہ کے بینڈ میں ساز بجاتا تھا۔ اس نے شاہراہ اہرام پر واقع فینسی ہوٹلوں اور کلبوں کو فوراً مسترد کر دیا۔ خالد نے کہا: ''وہ درجہ اول سے لے کر درجہ پنجم تک ہیں۔ تمہیں تو درحقیقت دسویں درجے کی ضرورت ہے۔''

خالد نے نیوا ریزونا نائٹ کلب تجویز کیا جس میں داخلہ فیس 90 سینٹ تھی۔ مَیں ٹونی کو ساتھ لے کر وہاں گئی۔ ناظرین میں مردوں کے ساتھ ساتھ عورتیں بھی شامل تھیں۔ فنکاروں کا معیار بہت اونچا نہیں تھا اور انتظامیہ ایک غیر لائسنس یافتہ رقاصہ کا خطرہ مول لینے سے گریزاں نہیں لگتی تھی، بشرطیکہ میں بے اختیار ہو کر رقص میں شامل ہو جانے کا دکھاوا کرتی۔ پولیس کے نظر آتے ہی مجھے یوں ظاہر کرنا تھا جیسے موسیقی کی طاقت کے سامنے بے بس ہو کر سٹیج پر آ گئی ہوں۔

چند راتوں بعد قطار میں لگ کر اپنی باری کا انتظار کرتے ہوئے مجھے شبہ ہونے لگا کہ پتا نہیں غیر متوقع بیلی ڈانس کا دفاع قائم رکھ بھی سکوں گی یا نہیں!! مَیں نے اپنے کوٹ کے نیچے ایک کالا اور طلائی کاسٹیوم پہن رکھا تھا جس پر لگے ہوئے موتیوں سے پیسفک میں چھوٹا سا جزیرہ خریدا جا سکتا تھا۔

مجھے تیسری رقاصہ اشغان کے بعد منڈلی کے وسط میں جانا تھا۔ زیادہ تر فنکاراؤں کی طرح وہ بھی متوسط عمر اور فربہ جسم والی عورت تھی۔ وہ لاپرواہو کر رقص کرنے لگی لیکن ناظرین کو برا نہ لگا۔ ان کی پگڑیوں کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ زیادہ تر سیدی (مصری دیہاتی) تھے جو شہر میں اچھی رات منانے آئے تھے۔ ان کے درمیان میں مجھے سرخ چیک والے سرپوش پہنے ہوئے خلیجی عربوں کی ایک دو میزیں بھی نظر آئیں۔ یہ جگہ دولت مند خلیجیوں کے شایانِ شان نہیں لگتی تھی: یا تو انہوں نے بہت زیادہ پی رکھی تھی اور جگہ کی تمیز نہیں کر پائے تھے، یا پھر تیل کی قیمتیں میرے خیال سے بھی زیادہ کم ہو گئی تھیں۔

آخر کار اشغان جھکی اور مجھے سٹیج پر لے گئی۔ میں نے نیچے پگڑیوں کا ایک سمندر دیکھا تو کچھ گھبراہٹ ہوئی۔ لیکن ڈھول نواز کی پر اسرار تھاپ کے ساتھ موسیقی شروع ہوئی اور میں اس کی رو میں بہنے لگی۔ مشرقی رقص اختراع پسندانہ ہے اور رقاص اور موسیقاروں کے درمیان وجدانی افہام و تفہیم کا تقاضا کرتا ہے۔ ڈھول کی تھاپ اور شدت میں تیزی آنے پر مجھے بھی تال تیز کرنا پڑی، کولہوں کو والہانہ انداز میں تھرتھراتے ہوئے۔ میری بیلٹ میں لگے ہزاروں طلائی موتے جھنجھنا اٹھے۔ بعد میں تھاپ مدھم ہوتے ہوتے تقریباً رک گئی: رباب کے طویل سُروں پر بس چند ایک چھینے ہی پھڑک رہے تھے۔

یوں لگا جیسے میں ایک ہزار ایک راتوں سے سٹیج پر رقص کرتی آ رہی ہوں۔ آخر موسیقی کی لے بدلی جو رقاصہ کو ایک خوب صورت سلام کے ساتھ رقص کا اختتام کرنے کی اجازت دیتی ہے۔ میں نے جھک کر سلام کیا اور سٹیج سے واپس جانے کے لیے مڑی۔ ایک سعودی اچھل کر آگے آیا اور دس پاؤنڈ کا نوٹ لہرا کر مکرر کی فرمائش کی۔ اس وقت مجھے بہت حیرت ہوئی جب بقیہ ناظرین نے بھی میز بجا کر مکرر پر اصرار کیا۔ اشغان نے آگے بڑھ کر دس پاؤنڈ کے نوٹ تک ہاتھ بڑھایا اور دوسرے ہاتھ سے میری کلائی تھام کر واپس سپاٹ لائٹ میں لے گئی۔ ہم دونوں نے مل کر دوبارہ وہی رقص کیا۔ درمیان میں وہ نیچے جھکی اور میرے کاسٹیوم کے سامنے سے جھانکنے کے بعد ناظرین کی جانب منہ کر کے بولی: ''مافِش!'' یعنی وہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ ہم تالیوں کی گونج میں سٹیج سے نیچے اتر آئیں۔

بعد میں مینجر سمیح سلام نے میری کارکردگی پر ناقدانہ رائے دی۔ ''تمہارا رقص تکنیکی لحاظ سے

بالکل ٹھیک ہے۔ لیکن اس میں جذبے کی کمی ہے۔ تمہیں رقص کی حرکات کے ساتھ ساتھ جذبات کا اظہار بھی سیکھنا چاہیے۔" اس نے مجھے اپنا بزنس کارڈ دیا اور کافی مبہم انداز میں کہا کہ میں اسے ضرور کال کروں۔ میں تو نہیں کرنے والی تھی۔ میں نے تو بس رقص کرنے پر عورت کے حق کی خاطر ایک چھوٹا سا احتجاج کیا تھا۔

میں دھواں بھرے کلب سے نکل کر باہر سردیوں کی رات میں آ گئی۔ اگرچہ صبح کے تین بجے رہے تھے لیکن گلیاں اور کیفے لوگوں سے بھرے ہوئے تھے۔ وہ قہقہے لگا رہے تھے۔ مصر میں کسی منکرِ تفریح کٹر بنیاد پرستی کا غالب آ جانا قرین قیاس نہیں لگتا تھا۔ اہل مصر کافی حد تک اطالویوں جیسے دکھائی دیے۔ انہوں نے بڑے اطمینان سے پوپ کی بات سنی اور پھر بھی ایک فحش اداکارہ کو پارلیمنٹ کا رکن منتخب کروا دیا۔

بیشتر مصری اس قدر شدید پرہیزگار تھے کہ انتہا پسندوں کی جانب سے سیاحوں یا اہل قلم یا عام راہگیروں کو گولی مارا جانا قبول نہیں کر سکتے تھے۔ ایک کاہل، بدعنوانی میں لتھڑی ہوئی حکومت کے باعث مشکلات اور مایوسی سے بھرپور زندگیاں گزارنے کے باوجود مصری لوگوں کا بردباری اور خوش مزاجی سے منہ موڑ لینا بہت مشکل تھا۔ یہی مزاج ان کے پرہجوم شہروں اور کچے دیہات کو اس قدر خوشگوار اور قابلِ رہائش بنائے ہوئے تھا۔

محمد علی سٹریٹ میں بوڑھے نفیری ساز نے ٹھیک کہا تھا۔ شاید کچھ دیر تو لگے، لیکن رقاصائیں واپس آئیں گی۔

حاصلِ بحث:

راسخ العقیدگی سے ہوشیار

عورتوں پر تشدد کے اعداد و شمار پیش کیے جانے پر ترقی پسند مسلمان مختلف بد معاشوں کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں نو آبادیاتی تاریخ، بدوی روایت، قبل از اسلام افریقی ثقافت۔ تاہم، اگر بیوی کو پیٹنے اور کافروں کو قتل کرنے کے لیے مسلمان الوہی منظوری کا حوالہ دیتے ہیں تو ان سے بیویوں کو قتل کرنے اور اہل قلم کو موت کی سزائیں دینے کی توقع بھی کی جا سکتی ہے۔

''اصل اسلام'' کو موجودہ اسلام سے الگ کرنا مارکسیوں کی اس رائے جیسا ہے جس کے مطابق حقیقت میں موجود سوشلزم کی ناکامیوں کی وجہ سے اصل سوشلزم کو مسترد نہیں کیا جا سکتا۔ اسلام کو محض نظریاتی یا تاریخی سطح پر دیکھنا اور ساتویں صدی میں اس کی بدولت عورتوں کی زندگی میں آنے والی لاریب بہتریوں پر اصرار کرتے رہنا کافی نہیں۔ آج کہیں زیادہ ضروری اور فوری کام یہ غور کرنا ہے کہ مذہب کی مستند بنیاد پر عورتوں کے خلاف کیا کچھ ہو رہا ہے۔ جب اسلام کو فارس میں حجاب اور گوشہ نشینی ملی تو اس نے اسے اپنے اندر جذب کر لیا؛ جب مصر میں جنسی اعضا کی تقطیع سے واسطہ پڑا تو اسے بھی اپنا حصہ بنا لیا؛ جب یہ ایسے معاشروں میں پہنچا جہاں عورتوں نے امور عامہ میں کبھی اپنی آواز نہیں اٹھائی تھی تو عورتوں کی پرجوش شراکت کے حوالے سے اس کی اپنی روایات بکھر گئیں۔

تاہم، کچھ مستثنیات موجود ہیں۔ جب اسلامی افواج ہندوستان پر قابض ہوئیں تو

مسلمانوں کو ستی کی رسم بہت ظالمانہ لگی جس میں متوفی مرد کی بیوائیں اپنے شوہر کی چتا پر ہی جل مرتی تھیں۔1650ء میں سیاح ژاں باپسٹ ٹیورنیئر نے ہندو بیواؤں کے بارے میں لکھا جنہیں مذہب کی رو سے دوبارہ شادی کرنے کی اجازت نہ ہوتی اور وہ ذلت سے بچنے کی خاطر اپنے شوہر کی چِتا پر ہی جان دے دیتی تھیں۔ وہ لکھتا ہے: ''لیکن یہ امر قابل ذکر ہے کہ کوئی عورت مقامی حاکم کی اجازت کے بغیر ایسا نہیں کر سکتی۔ مسلمان حاکم خودسوزی کی اس رسم کو بہت برا خیال کرتے ہیں اور آسانی سے اجازت نہیں دیتے۔'' کم از کم ان عورتوں کی زندگیاں بچانے کا سہرہ تو اسلام کے سر جاتا ہے۔ لیکن ایک اس قدر طاقت ور اور لچک دار مذہب ''خوفناک دساتیر'' کے سامنے اکثر و بیشتر اپنی بنیادیں قائم کیوں نہ رکھ سکا؟

اس کتاب پر کام شروع کرنے کے بعد میں ہر طرف ایسی عورتوں کو تلاش کرتی رہی جو اسلام کے مثبت پیغامات کو دوبارہ عام کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہوں۔ یہ تلاش عبث ثابت ہوئی۔ زیادہ تر مقامات پر بحث کی سمت عین الٹ معلوم ہوئی۔ فلسطینی، مصری، الجیریائی اور افغانی عورتیں کئی عشروں پر محیط آزادئ نسواں کو دبانے کی خواہش مند تھیں جبکہ ان کے ملکوں میں اسلامی رہنما نہایت اخراجی اور غیر مساواتی تعبیریں پیش کر رہے تھے۔ اس سیلاب کے خلاف جدوجہد کرنے والی عورتوں کو تضحیک وتشدد اور جلاوطنی کا نشانہ بننا پڑا۔

مراکش میں فاطمہ مرنیسی کے علم القرآن نے اسلام کو مساوات اور عظمت انسان کا مذہب بنانے میں گرانقدر حصہ ڈالا ایک ایسا مذہب جس کا پیغام عورتوں سے نفرت کرنے والے اہل اقتدار نے وقت کی گرد تلے دفن کر دیا تھا۔ تاہم، اس کی تحریریں مراکش کی مساجد سے زیادہ مغربی یونیورسٹیوں میں پڑھی جاتی ہیں۔ چاہے حدیث پر اس کی تحقیق کتنی ہی دقیق ہو، لیکن مردوں سے مغلوب اسلامی اسٹیبلشمنٹ ایک ایسی مسلمان عورت کی آرا پر کان دھرنے کو تیار نظر نہیں آتی جو حجاب نہیں کرتی یا اپنی پاکدامنی کا اشتہار نہیں بناتی۔

شاید اسی وجہ سے میں نے راسخ العقیدہ ایرانی عورتوں کی کالی چادروں میں ملفوف ایک مثبت تبدیلی کی واضح ترین اُمید پائی۔ نہایت تنگ نظر بنیاد پرست بھی خمینی کی بیٹی زہرا مصطفوی یا رفسنجانی کی بیٹی فائزہ ہاشمی جیسی عورتوں کی اسلامی معتبریت پر انگلی نہیں اٹھا سکتے۔ مذہبی اصولوں سے ان کی محتاط ترین وابستگی انہیں ایک اعلیٰ حیثیت عطا کرتی ہے جہاں سے وہ حقوق نسواں کے لیے آواز اٹھا

سکتی ہیں۔ ابھی تک تو انہوں نے یہ حیثیت کبھی کبھار ہی استعمال کی ہے مثلاً عورتوں کو سیاست میں حصہ دلوانا، ملازمت کے مواقع میں مساوات قائم کروانا اور کھیلوں میں شرکت کا حق دلانا۔ یقیناً یہ عورتیں روایتی کی چادر کبھی نہیں پھاڑیں گی۔ وہ اسلامی استدلال کے اندر رہتے ہوئے پردے یا کثیرالازدواجی کے خلاف ممکنہ دلائل کبھی نہیں دیں گی۔ لیکن وہ روایتی دیواروں کے اندر رہتے ہوئے بھی اسلام کے نام پر بدسلوکی اور استحصال کا نشانہ بننے والی عورتوں کے لیے ایک نسبتاً محفوظ بہشت تخلیق کر ہی سکتی ہیں۔

مغربی عورتوں کو شاید یہ بات قابل قدر نہ لگے۔ بوجھل غلافوں میں لپٹی ان ملول شبیہوں کو عورتوں اور اسلام کے ساتھ درست رویے کی نسبت غلطی کی علامت سمجھنا آسان ہے۔ لیکن اسلامی دنیا کے کٹڑیت پسند حصوں میں رہنے والی مسلمان عورتوں کی نظر میں ایرانی عورتوں کا موٹر بائیک پہ سوار ہو کر کام کرنے جانا چاہے پھڑپھڑاتی چادر کو دانتوں میں دبائے ہوئے، قابل رشک ہو سکتا ہے۔

''وہ ہماری سپروومین ہیں،'' جنوبی لبنان میں حزب اللہ کے شیخ اللہ کی چوبیس سالہ شرمیلی بیوی ایمان فضل نے کہا۔ شیخ مجھے میری کتاب کے حوالے سے خبردار کرنے کے بعد میرس پر بیٹھا ہوا تھا۔ ایمان کا باپ بیروت میں حزب اللہ کا ممتاز ترین راہنما تھا۔ اس ایمان کو چودہ برس کی عمر میں اچانک سکول سے اٹھا لیا اور ایسے شخص سے بیاہ دیا جسے وہ شادی سے پہلے کبھی نہیں ملی تھی۔ اب وہ زیادہ تر وقت گھر میں ہی گزارتی اور بچے پالتی تھی۔ اس نے مذہبی علوم کا مطالعہ کرنے کے دوران اپنے شوہر کے ساتھ کچھ عرصہ ایران میں گزارا۔ وہاں اس نے ایک کافی وسیع دنیا کی جھلک دیکھی، حتیٰ کہ نہایت راسخ العقیدہ مسلمانوں کے ہاں بھی۔ وہ تعلیم اور کام کے حوالے سے ایرانی عورتوں کو دستیاب مواقع پر اداس انداز میں باتیں کرتی رہی۔ ''ان جیسا بننے کی خاطر ہمیں جدوجہد کرنا پڑے گی۔''

ہر کسی کا اپنے سفروں کو یاد کرنے کا اپنا طریقہ ہوتا ہے۔ کچھ لوگ ڈائریاں لکھتے اور کچھ تصاویر لیتے ہیں۔ میں اپنے بیڈروم میں جا کر اپنی کپڑوں والی الماری کھولتی ہوں۔ وہاں میری یادیں لٹکی ہیں: چھ سال اور بیس ممالک کی یادگار چیزیں۔ ایک ہینگر پر لٹکی ہوئی بڑی سی ریشمی کالی چادر کبھی مجھے بہت بری لگا کرتی تھی۔ لیکن پلو سے داغدار اور کندھے سے پھٹی ہوئی یہ چادر میری پرانی

دوست بن گئی ہے۔ مَیں نے اسے اوڑھ کر ایک اجنبی دنیا میں اپنا کام انجام دیا۔

چادر پہ نظر ڈالنے پر اب مجھے وہ جھرجھری نہیں آتی جو اسلامی زبان کی انتہا پسندانہ صورتوں کو دیکھ کر کبھی محسوس ہوا کرتی تھی۔ اب میرے احساسات کہیں زیادہ عمیق اور پیچیدہ ہو گئے ہیں۔ چادریں میرے ذہن میں ان عورتوں کے ساتھ منسلک ہیں جنہیں مَیں نے عقیدے کی گہری خلیج کے باوجود اپنے بہت قریب محسوس کیا۔

مسلمان عورتوں کے درمیان زندگی گزارتے ہوئے مَیں ایک ایسی دنیا کا حصہ بن گئی جو اب بھی نہایت نجی دنیا ہے۔ عام منظر میں بیشتر عورتیں سایوں کی طرح حرکت کرتی ہیں...... جسمانی طور پر حجاب میں ملفوف یا ذہنی طور پر امتناعی ضابطہ ہائے اخلاق میں بندھی ہوئی۔ وہ عورتیں اونچی دیواروں اور بند دروازوں کے پیچھے ہی حقیقتاً آزاد ہوتی ہیں۔

میرے لیے اُس دنیا میں داخل ہونا طویل عرصے سے خوابیدہ جذبات کو جھنجوڑنا تھا۔ قاہرہ جانے کے بعد ہی مجھے احساس ہوا کہ سکول چھوڑنے کے بعد سے میری کوئی قریبی سہیلی نہیں بنی تھی۔ میں عورتوں کی صحبت کا مزہ لینا بھول چکی تھی۔ تاہم، نہایت خوب صورت ملاقاتوں میں بھی ایک ترشی ہمیشہ درمیان میں معلق رہی۔ ایک کُرد دوست کے کچن کے فرش پر آلتی پالتی مارے روٹی پکانے میں ہاتھ بٹاتے ہوئے، مَیں نے محسوس کیا کہ مکمل طور پر عورتوں میں گھرے ہونا کتنی خوشگوار بات تھی۔

لیکن کوئی ایک گھنٹہ کی مشقت کے بعد میرے کندھے درد کرنے لگے اور پسینہ بہنے لگا تو مجھے روٹیوں کے ڈھیر کے قریب بیٹھ کر موٹی موٹی ہتھیلیوں سے نوالے توڑتے ہوئے لڑکے پر غصہ آیا۔ اس کی کچھ ہی بڑی بہن روٹی پکانے کے کام کا حصہ بن چکی تھی۔ آخر وہ لڑکا اتنی چھوٹی عمر میں ہی یہ کیوں سیکھ لے کہ بہن کا کام اُس کی مسرت کے لیے محنت کرنا ہے؟

لندن میں میری ایک زرتشتی ایرانی دوست کا کہنا ہے کہ وہ صرف ایک جنگ لڑنے کو تیار ہے: اسلامی بنیاد پرستی کو عورتوں کو زندگی گزارنے کا طریقہ بتانے سے روکنے کی جنگ۔ کیا ہمیں بھی اسلامی انتہا پسندی کے خلاف جدوجہد کرتے ہوئے دوسروں کو زندگی گزارنے کا طریقہ بتانا چاہیے؟ ہم اہلِ مغرب انسانی حقوق کو ایک ناقابلِ تخفیف بین الاقوامی کرنسی ماننے پر زور دیتے ہیں

جس کا ثقافتی روایات اور سیاسی حالات سے کوئی تعلق واسطہ نہیں۔ 1993ء میں جنیوا میں ہونے والی انسانی حقوق پر کانفرنس کے بین الاقوامی اعلامیہ میں ایران ان مٹھی بھر ممالک میں سے ایک تھا جنھوں نے اختلاف رائے کیا۔ ایران، کیوبا، چین اور انڈونیشیا سے آئے ہوئے مندوبین نے اپنے دلائل کو ثقافتی حوالوں کا فیشن ایبل لبادہ اوڑھا کر کہا کہ مغرب نے ایسی اقوام پر بھی اپنی انسانی حقوق کی آئیڈیالوجی لاگو کر دی تھی جن کی نہایت مختلف مذہبی اور سیاسی تواریخ انہیں اپنے اپنی اپنی آئیڈیالوجی منتخب کرنے کا حق دیتی ہے۔ میرے خیال میں اُن کی دلیل اس خوفناک مفروضے میں مختصراً بیان کی جا سکتی ہے: انسانی حق وہی ہے جسے مقامی حاکم انسانی حق مانتا ہو۔

کانفرنس میں انسانی حقوق کی ہمہ گیریت کا تصور غالب رہا اور چارٹر میں ترمیم نہ کی گئی۔ پھر بھی چارٹر نے کٹے ہوئے جنسی اعضا والی، کمروں میں بند اور ووٹ کے حق سے محروم عورتوں کے لیے تا حال بہت کم کچھ کیا ہے۔

جنس کو نسل کے ساتھ بدل کر دیکھنا ایک دلچسپ مثال ہو سکتی ہے۔ فرض کریں کہ کسی ملک، ایک قریبی مغربی حلیف اور تجارتی شراکت دار، کی آبادی نصف سیاہ فام اور نصف سفید فام ہو۔ سفید فام باشندوں کو سیاہ فام باشندوں پر مکمل اختیار حاصل ہے۔ وہ سرکشی کرنے پر انہیں مار سکتے ہیں؛ بلا اجازت گھر سے باہر نکلنے کا حق چھین سکتے ہیں؛ انہیں سرکاری شناختی لباس پہنے بغیر چلنے پھرنے کی اجازت نہیں؛ انہیں حکومت میں کوئی بھی باعزت نوکری نہیں دی جاتی، اور نہ ہی وہ سفید فاموں کے کنٹرول سے باہر ہو کر کوئی کام کر سکتے ہیں۔ اگر ایسا کوئی ملک موجود ہوتا تو کیا ہمارے مغربی ملکوں میں شور نہ بپا ہو جاتا؟ کیا ہم اس ملک پر تجارتی پابندیاں نہ عائد کر دیتے؟ مگر اپنی نصف آبادی کو ان نہایت بنیادی حقوق سے محروم رکھنے والے سعودی عرب جیسے ممالک پر کوئی پابندی نہیں لگی۔ مجھے لگتا ہے کہ مذہبی خیال کی جانے والی روایات (جو کہ وہ حقیقت میں نہیں ہیں) کے معاملے میں بیرونی دباؤ مشکلات کا باعث بن جاتا ہے۔

جیرالڈین بروکس

ترجمہ: یاسر جواد